{ایمان افروز تفسیر.........سورۃ الضحیٰ تا سورۃ الناس}

انوارُ القرآن

پیر طریقت رہبرِ شریعت مفکرِ اسلام حضرت علامہ

سید شاہ تراب الحق قادری رحمۃ اللہ علیہ

عزمِ نَو پبلشرز

{جملہ حقوق محفوظ ہیں}

کتاب	....	انوارُ القرآن (۲۲ سورتوں کی تفسیر)
مصنف	....	پیر طریقت علامہ سید شاہ تراب الحق قادری رحمۃ اللہ علیہ
مرتب	....	انجینئر حافظ محمد آصف قادری
پروف ریڈنگ	....	انجینئر حافظ محمد عارف قادری
باہتمام	....	مولانا محمد سلیم قادری رضوی
زیرِ نگرانی	....	مولانا راشد علی عطاری مدنی (ڈائریکٹر ھادی ریسرچ انسٹیٹیوٹ)
تاریخ اشاعت	....	جون 2025ء / ذوالحجۃ الحرام 1446ھ
ناشر	....	عزمِ نَو پبلشرز، پلاٹ نمبر 1196/1197، سیکٹر:32/E،

ناصر کالونی عقب مٹھاس سویٹس، کراچی

{ملنے کے پتے}

☆......مدرسہ انوارُ القرآن، مسجد کنز الایمان، آئی ٹن ون، اسلام آباد

☆......انوارُ القرآن، میمن مسجد، مصلح الدین گارڈن، کراچی

☆......مکتبہ حماد، نزد فیضانِ مدینہ، پرانی سبزی منڈی، کراچی

ملک بھر میں ہول سیل ریٹ پر آن لائن حاصل کرنے اور دیگر کثیر کتب پر ڈسکاؤنٹ پانے کے لیے الکافی بک سرکل کو جوائن کیجیے: 0315-2421854

{انتساب}

اُن مفسرین، محدثین اور فقہاءِ دین کے نام

☆...خوفِ خدا اور عشقِ رسول ﷺ سے جن کے سینے روشن ہیں...☆

☆...جو انبیاء کرام کے وارث ہیں...☆

☆...جو لوگوں کو بھلائی سکھاتے ہیں...☆

☆...جن پر اللہ تعالیٰ رحمت نازل فرماتا ہے...☆

☆... فرشتے اور اہلِ زمین و آسمان جن کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں...☆

★...جن کے قلم کی سیاہی کو...★

قیامت کے دن شہیدوں کے خون کے ساتھ تولا جائے گا۔

فہرست

جدید ایڈیشن پر کام کی تفصیلات	10
پیش لفظ	14
تفسیر سورۃ الضحیٰ	21
لفظی ترجمہ:	21
ربط و مناسبت:	23
شانِ نزول:	25
وَالضُّحٰی وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی	25
دن اور رات کی قسم کیوں؟	28
مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى	29
وَلَلۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لَّکَ مِنَ الۡاُوۡلٰی	29
وَلَسَوۡفَ یُعۡطِیۡکَ رَبُّکَ فَتَرۡضٰی	31
قرآن اور مقامِ محبوبیت:	34
اَلَمۡ یَجِدۡکَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی	35
تفسیر سورۃ الانشراح	49
لفظی ترجمہ:	49
ربط و مناسبت:	50
شانِ نزول:	51

لکَ ''تمہاری خاطر'':	59
رفعتِ ذکرِ مصطفیٰ:	65
تفسیر سورۃ التین	73
لفظی ترجمہ:	73
ربط و مناسبت:	74
شانِ نزول:	75
آیت ۶ کی تفسیر:	83
آیت ۷،۸ کی تفسیر:	84
تفسیر سورۃ العلق	87
لفظی ترجمہ:	88
ربط و مناسبت:	90
شانِ نزول:	90
حدیث کے چند نکات:	92
وحی کی اقسام:	93
اعلان سے قبل نبوت:	94
آیت ۶ تا آیت ۸:	109
آیت ۹ تا آیت ۱۴:	112
آیت ۱۵ تا آیت ۱۹:	113
تفسیر سورۃ القدر	116
لفظی ترجمہ:	116
ربط و مناسبت:	117
شانِ نزول:	117

نزولِ قرآن:	119
شبِ قدر کی تعیین:	121
شبِ قدر مخفی کیوں؟	122
27ویں شب، لیلۃُ القدر:	124
تفسیر سورۃ البیّنۃ	130
لفظی ترجمہ:	131
ربط ومناسبت:	133
شانِ نزول:	134
مخلوق میں بدترین:	141
مخلوق میں بہترین:	142
جنت میں عظیم نعمت:	144
تفسیر سورۃ الزلزال	147
لفظی ترجمہ:	147
ربط ومناسبت:	148
شانِ نزول:	149
کافر کی نیکی برباد:	158
تفسیر سورۃ العادیات	160
لفظی ترجمہ:	160
ربط ومناسبت:	162
آیت ۹ تا آیت ۱۱:	171
تفسیر سورۃ القارعۃ	173
لفظی ترجمہ:	173

ربط و مناسبت:	174
آیت ۶ تا ۸ کی تفسیر:	180
تفسیر سورۃ التکاثر	186
لفظی ترجمہ:	186
ربط و مناسبت:	187
شانِ نزول:	188
آیت ۳ تا ۵ کی تفسیر:	194
یقین کے درجے:	195
آیت ۷،۶ کی تفسیر:	197
نعمتوں کی پُرسش:	198
تفسیر سورۃ العصر	203
لفظی ترجمہ:	203
ربط و مناسبت:	203
شانِ نزول:	204
وَالْعَصْرِ کا مفہوم:	205
فلاح و نقصان کا قرآنی تصور:	210
ایمان کے تقاضے:	213
فلاح والی تجارت:	220
تفسیر سورۃ الہُمزۃ	222
لفظی ترجمہ:	222
ربط و مناسبت:	223
شانِ نزول:	224

تفسیر سورۃ الفیل	234
لفظی ترجمہ:	234
ربط و مناسبت:	235
شانِ نزول:	235
ملحدین کا رَد:	241
دنیا پرستوں کا رد:	242
تفسیر سورۃ القریش	243
لفظی ترجمہ:	243
ربط و مناسبت:	244
تفسیر سورۃ الماعون	251
لفظی ترجمہ:	251
ربط و مناسبت:	252
شانِ نزول:	252
تفسیر سورۃ الکوثر	259
لفظی ترجمہ:	259
ربط و مناسبت:	259
شانِ نزول:	260
کوثر کے معانی:	261
تفسیر سورۃ الکافرون	270
لفظی ترجمہ:	270
فضائل و مناقب:	271
ربط و مناسبت:	272

شانِ نزول:	272
آیت ۲ تا آیت ۵:	274
تفسیر سورۃ النصر	278
ربط و مناسبت:	279
تفسیر سورۃ اللھب	286
ربط و مناسبت:	287
شانِ نزول:	288
تفسیر سورۃ الاخلاص	294
فضائلِ سورت:	295
ربط و مناسبت:	296
قُلْ اور عظمتِ مصطفیٰ:	297
محبت و اطاعت میں اخلاص:	298
مشرکوں کے عقیدے:	300
تفسیر سورۃ الفلق	309
ربط و مناسبت:	310
شانِ نزول:	311
تعویذ اور دَم جائز ہیں:	316
تفسیر سورۃ الناس	319
ربط و مناسبت:	320
ماخذ و مراجع	329

جدید ایڈیشن پر کام کی تفصیلات

تفسیرِ انوار القرآن کے جدید ایڈیشن میں درج ذیل امور پر کام کیا گیا ہے:

- آیات کا ترجمہ کنز الایمان شریف سے ہے۔
- آیات کی تخریج متن ہی میں رکھی گئی ہے۔
- دیگر تخاریج فوٹ نوٹ میں کی گئی ہیں۔
- سابقہ ایڈیشن میں اجمالی تخاریج تھیں، اس ایڈیشن میں حتی الامکان مفصل تخاریج کی سعی کی گئی ہے۔
- آیات اور ترجمے کا مطبوعہ قرآن مجید اور کنز الایمان شریف سے تقابل کیا گیا ہے اور لفظی غلطیوں سے پاک رکھنے کی ہر ممکن سعی کی گئی ہے۔

نوٹ: بتقاضۂ بشریت آیات یا ترجمہ میں کوئی غلطی ہو گئی ہو تو مطلع ہونے کی صورت میں ادارے کو ضرور اطلاع دیں۔

تقریظِ عظیم

مفسرِ قرآن علامہ مفتی عبد الرزاق چشتی بھترالوی

شیخ الحدیث جامعہ جماعتیہ مہر العلوم، راولپنڈی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عن ابن مسعود قال قال رسول اللہ ﷺ لا حسد الا فی اثنین رجل اتاہ اللہ مالا فسلطہ علی ھلکتہ فی الحق ورجل اتاہ اللہ الحکمۃ فھو یقضی بھا ویعلمھا۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ کتاب العلم)

حضرت **ابن مسعود** رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: **رسولُ اللہ** ﷺ نے **ارشاد فرمایا:**

”رشک نہ کیا جائے سوائے دو شخصوں کے۔ ایک وہ جسے اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو پھر اسے مسلط کر دیا ہو (یعنی توفیق دے دی ہو) حق راہ میں خرچ کرنے کی۔ اور دوسرا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا ہو، وہ اسی کے مطابق فیصلے کرتا ہو اور وہ اس کی اوروں کو بھی تعلیم دیتا ہو“۔

نبی کریم ﷺ نے قرآن پاک کا علم حاصل کرنے اور دوسروں کو قرآن پاک کی تعلیم دینے کا حکم فرمایا۔ خصوصاً ”**العلماء ورثۃ الانبیاء**“ فرما کر ان پر یہ ذمہ داری عائد کر دی کہ وہ قرآن پاک سیکھیں اور سکھائیں۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ تعلموا الفرائض والقرآن وعلموا الناس فانی مقبوض۔
(رواہ الترمذی، مشکوٰۃ کتاب العلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسولُ اللہ ﷺ نے فرمایا: فرائض اور قرآن کا علم حاصل کرو اور لوگوں کو بھی اس کی تعلیم دو، بیشک مجھے دنیا سے رخصت ہونا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عربی ہوں یا عجمی، قرآن پاک کو کامل طریقے سے اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک سلف صالحین علماء کرام کی تفاسیر کا مطالعہ نہ کیا جائے، پھر آیات کے مطابق احادیث کو نہ دیکھا جائے۔

پیر طریقت رہبر شریعت حضرت علامہ الشاہ تراب الحق قادری مدظلہ العالی کی قرآن پاک کی آخری بائیس سورتوں کی تفسیر کو دیکھا اور پڑھا تو عظیم پایا۔ قرآن پاک کے مطالب، اسرار و رموز کو تفاسیر اور احادیث کے حوالہ جات سے بہت تحقیقی اور خوبصورت اور آسان طریقہ سے بیان فرمادیا جو علماء، طلباء اور عوام کے لیے یکساں مفید ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ شاہ صاحب تفسیر کا یہ سلسلہ جاری رکھیں گے۔

آپ کی مصروفیات سے راقم کسی حد تک واقف ہے۔ سلسلۂ طریقت و تصوف کو جاری رکھتے ہوئے لوگوں سے ملاقاتیں کرنا، تعویذات و دعاء کے لیے حاضر ہونے والوں کو محروم نہ لوٹانا، پھر کراچی جیسے عظیم شہر میں دینی مجالس میں خطابات کے لیے جابجا وقت دینا، پھر صحت کی خرابی بھی آپ کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔

ان تمام مصروفیات و عوارض کے ہوتے ہوئے آپ نے چند سالوں سے سلسلۂ تحریر کی طرف توجہ دی اور آپ کی بہت ہی مفید تحقیقی کتب طبع ہو کر عوام کے پاس پہنچ چکی ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو مزید ہمت عطا فرمائے اور علم و عمل میں خیر و برکت عطا فرمائے۔ آمین

اللہ تعالیٰ کا آپ پر خصوصی کرم ہے کہ آپ علمی تقریر فرماتے ہیں جس سے علماء بھی فائدہ حاصل کرتے ہیں اور عوام بھی مکمل سمجھ سکتے ہیں۔ آپ کی تقریر جس طرح آسان ہوتی ہے اسی طرح آپ کی تحریر بھی آسان ہوتی ہے۔

راقم کا آج کل حافظہ بہت کمزور ہو گیا ہے پھر بھی ایک مرتبہ میں آپ کی کتاب کو ضرور پڑھتا ہوں اور وقتی فائدہ بہت حاصل کرلیتا ہوں بعد میں اگرچہ بھول بھی جاتا ہوں۔ الحمد للہ! ابھی تک اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے، کتاب کو دیکھ کر سمجھ لیتا ہوں اسی لیے سلسلۂ تحریر جاری رکھے ہوئے ہوں۔

آپ اپنا موقف بہت ٹھوس طریقے سے بیان کرتے ہیں۔ ایک بار راقم کراچی میں آپ کی محفل میں بیٹھا ہوا تھا۔ کسی کا ٹیلیفون آیا، وہ ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے متعلق کوئی سوال کر رہا تھا۔ آپ نے دلائل سے اس کا عدم جواز ثابت کیا۔ اُس شخص نے غالباً کوئی لیت و لعل سے کام لیا تو آپ نے

فرمایا: ''ابھی کچھ انتظار کرو، پرانے لوگ چلے جائیں گے تو شاید آپ کے لیے سب کچھ جائز ہو جائے''۔

قبلہ شاہ صاحب سلف صالحین کا کامل نمونہ ہیں۔ حسنِ اخلاق میں آپ کو بہت بلند مقام حاصل ہے۔ آپ کے سامنے چھوٹے بڑے اور امیر وغریب کا کوئی فرق نہیں ہوتا، ہر ایک کی طرف ایک جیسی توجہ فرماتے ہیں۔ اکثر علماء اس وصف سے عاری ہیں۔ آپ کے دل میں تمنا رہتی ہے کہ دینی مدارس سے کثیر تعداد میں علماء فارغُ التحصیل ہوں۔ آپ اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی رحمہ اللہ کے مسلک پر کامل طور پر قائم ودائم ہیں۔ اللہ تعالیٰ راقم کو بھی آپ کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آپ کے دل میں مصیبت زدگان کے لیے ہمیشہ ہمدردی موجزن رہتی ہے۔ آزاد کشمیر میں زلزلہ کی وجہ سے یا پاکستان میں سیلاب کی وجہ سے، کسی طرح بھی آفت زدگان ہوں، ان کے لیے آپ کی سعیٔ جمیل سے کثیر مقدار میں امداد پہنچتی ہے۔

آپ ہمیشہ راقم کو دعا ومہربانی سے یاد رکھتے ہیں اور جامعہ جماعتیہ مہر العلوم کی کامل سرپرستی فرماتے ہیں۔ آپ کی نظرِ کرم سے ہی مدرسہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے، اور آپ کی تمام تصانیف کو مقبول اور فیض آفریں بنائے۔ آمین

خاکپائے اولیاء کرام
عبدالرزاق بھترالوی

تقریظ جلیل

جامع المعقول والمنقول علامہ مفتی محمد سلیمان رضوی

شیخ الحدیث دارُ العلوم انوارِ رضا، راولپنڈی

بسم اللہ الرحمن الرحیم نحمدک ونستعینک یا اللہ

ونصلی علی من قال انی رسول اللہ ﷺ اولاً وآخراً وعلی آلک واصحابک یا سیدی یا رسول اللہ ﷺ۔

قرآن مجید اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ کی وہ آخری کتاب ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نبی پاک ﷺ پر نازل فرمایا، جو تمام علومِ اولین وآخرین کو اپنے جلو میں لیے ہوئے ہے۔ چونکہ امام الانبیاء ﷺ پر نبوت ختم کر دی گئی لہٰذا قرآن مجید کو ابدُ الآباد تک کے مسائل کو لینا تھا تاکہ یہ آنے والی نسلوں اور اقوام وافراد کے لیے کافی ہو سکے تو اللہ تعالیٰ نے اس میں تمام علوم وضروریات کو اس طرح سمویا کہ یہ عالمگیر قانون قرار پایا، تمام انسانیت کے لیے حتیٰ کہ فرد سے قوم تک، پیدائش سے لے کر موت تک، انفرادی زندگی سے لے کر بین الاقوامی ضروریات ومسائل پر مشتمل کیا گیا اور وہ بھی یوں کہ صبحِ قیامت تک آنے والی مخلوق کے تمام مسائل وضروریات اس میں جمع کر دیے گئے۔

یہی وجہ ہے کہ آئے دن تفاسیر معرضِ وجود میں آئیں اور ہر نئی آنے والی تفسیر نے مسائل کو اس طرح لیا کہ غالباً نزولِ قرآن انہی مسائل کے لیے ہوا ہے۔ مثلاً کبیر کو دیکھیں تو فلسفہ، روح المعانی کو دیکھیں تو معقولات، تفسیراتِ احمدیہ کو دیکھیں تو فقہی مسائل، احکامُ القرآن کو دیکھیں تو اوامر ونواہی، عرائسُ البیان کو دیکھیں تو تصوف وطریقت، تنویر المقیاس من تفسیر ابنِ عباس کو دیکھیں تو جامعُ القواعد پائیں۔

غرض یہ کہ تفسیر ابن عباس سے لے کر نجوم الفرقان تک بشمول ما بینھما کے ہر مفسر کا انداز، اس کی تفسیر کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ یوں بدلتے ہوئے اسلوب میں ہر آئے دن کوئی نہ کوئی تفسیر معرضِ وجود میں آتی ہے حتیٰ کہ ابھی قریب ترین ایام میں تفسیر انوارُ القرآن جو کہ سورۃ الضحیٰ

سے لے کر سورۃ الناس تک بائیس سُوَر پر مشتمل ہے، اس کا مسودہ نظر سے گذرا۔ جس کے مؤلف حضرت علامہ پیر سید شاہ ترابُ الحق قادری جیلانی دامت برکاتہم العالیہ خلیفہ مجاز مفتیٔ اعظم ہند رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

بحمدہٖ تعالیٰ آپ کی اس کاوش کو دیکھ کر مسرت ہوئی کہ آپ نے اولاً ترجمہ کرنے میں ایک ایک لفظ کو علیحدہ علیحدہ معانی پر مشتمل قرار دیکر ایسی حسین کاوش کی جو کہ قاری کے لیے معانی کو ذہن نشین کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو گی۔ آپ نے مختلف مستند تفاسیر سے مواد لے کر اپنے مواقف کو ثابت کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھار کھی۔ کسر رہتی بھی کیوں جبکہ آپ "صاحبُ البیت ادریٰ بمافیہ" کا مصداق ہوتے ہوئے علومِ مولائے کائنات رضی اللہ عنہ کے وارث ہیں جن کے علوم کی وسعت کا معیار یہ کہ فاتحہ میں سارا قرآن، تسمیہ میں ساری فاتحہ، بسم اللہ میں سارا تسمیہ اور نقطۂ باء میں سارے علومِ باء، استخراج کرنا آپ ہی کا حسین مرقعِ علوم ہے۔

گو شاہ صاحب قبلہ کی تبلیغی، تعلیمی، تدریسی، تصنیفی، تربیتی اور تنظیمی مصروفیات اس قدر زیادہ ہیں کہ وقت نکالنا دشوار ہے، اس کے باوجود استدعا ہے کہ آپ اس عمل کو آگے بڑھائیں اور تفسیر کے ذریعے امتِ مسلمہ کو علمی جواہر پارے عطا فرمائیں، اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو گا۔ شائقینِ علومِ قرآن کو نیاز مندانہ مشورہ ہے کہ اس تفسیر سے فائدہ اٹھائیں، اِن شاء اللہ تمام مسائل کا حل آپ کو اس میں ملے گا۔

اللہ تعالیٰ شاہ صاحب قبلہ کو عمرِ طویل عطا فرمائے تا کہ علماء، عوامِ اہلسنت بالعموم اور متوسلین سلسلۂ قادریہ بالخصوص مزید فیض پائیں۔ آمین ثم آمین

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

خادم العلوم والعلماء

محمد سلیمان رضوی

پیش لفظ

انجینئر حافظ قاری محمد آصف قادری

بسم اللہ الرحمن الرحیم الحمد للہ الواحد الغفار والصلوۃ والسلام علی النبی المختار وعلی الہ الاطہار واصحابہ الاخیار

ارشادِ باری تعالیٰ ہے، قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی(۱۴) وَ ذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی(۱۵) بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا(۱۶) وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی(۱۷) ”بیشک مراد کو پہنچا جو ستھرا ہوا اور اپنے رب کا نام لے کر نماز پڑھی۔ بلکہ تم جیتی دنیا کو ترجیح دیتے ہو اور آخرت بہتر اور باقی رہنے والی (ہے)“۔

(پ30، الاعلیٰ:14 تا17)

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کو جس کام سے زیادہ محبت ہوتی ہے یا جس کام کو وہ زیادہ اہم سمجھتا ہے، اُس کام کو وہ اتنی ہی زیادہ توجہ سے کرتا ہے اور اس کے لیے اسی قدر زیادہ وقت دیتا ہے۔ موجودہ دور فتنوں سے بھرپور ہے۔ لوگ مال و دولت اور دنیا کے حصول میں مستغرق ہو کر آخرت کو بھول چکے، فحاشی اور بے حیائی نے مسلمانوں کے گھروں میں ڈیرے ڈال لیے، اور لوگ اپنے رب کی اطاعت، رسول ﷺ کی محبت اور قرآن کریم کے فہم سے بیگانہ ہوتے جارہے ہیں۔

وہ خوش نصیب جنہیں اپنے مسلمان ہونے کا شعور ہے، شدت سے محسوس کررہے ہیں کہ دنیا بھر میں ہماری ذلت ورسوائی کا اصل سبب قرآن کریم اور صاحبِ قرآن ﷺ سے دوری ہے۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ انہیں قرآن مجید سمجھ میں آئے تاکہ اس پر عمل پیرا ہو کر وہ اپنے خالق ومالک کو راضی کریں اور عظمتِ رفتہ پاسکیں۔

جس طرح جسمانی طہارت کے لحاظ سے صرف پاک لوگوں کو حکم ہے کہ وہ قرآن کریم کو چھو سکتے ہیں، اسی طرح قرآن کریم کی روحانی برکات کو چھونے اور اس کے انوار و تجلیات سے دلوں کو منور کرنے کے لیے باطن کو پاک کرنا لازم ہے۔ مذکورہ آیت میں رب تعالیٰ نے فلاح پانے کی بنیاد ”تزکیہ“ کو قرار دیا ہے۔ تزکیہ کے معنی ہیں، نفس کو ستھرا کرنا، یعنی خوبیوں کو پروان چڑھانا اور خامیوں کو دور کرنا۔

تزکیہ کے چار اجزاء ہیں۔ ذہن کو بُرے عقائد سے پاک کرنا، دل کو بُرے جذبات سے پاک کرنا، نفس کو بُری خواہشات سے پاک کرنا اور جسمانی اعضاء کو گناہوں سے پاک کرنا۔

اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچی بات کسی کی نہیں ہو سکتی لہٰذا افلاح پانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی ترجیحات کا از سرِ نَو تعین کریں اور اس فانی اور ناپائیدار زندگی پر غیر فانی اور ہمیشہ رہنے والی زندگی کو ترجیح دیں۔ قرآن کریم کے نورِ ہدایت سے فیضیاب ہونے کے لیے سب سے پہلے نیت کو پاکیزہ کیا جائے کہ مقصود صرف رضائے الٰہی ہو، پھر اعمال کو پاکیزگی کے سانچے میں ڈھالا جائے، اور پھر قرآن کریم میں غور و تدبر کیا جائے۔ فرمانِ الٰہی ہے، ''تو کیا غور نہیں کرتے قرآن میں''۔ (النساء)

تزکیۂ نفس کے دو حصے ہیں، عقائد وافکار کا تزکیہ اور اعمال کا تزکیہ۔ تزکیۂ نفس کی بنیادی شرط، اخلاص اور للٰہیت سورۃ البینہ میں بیان ہوئی ہے۔ ارشاد ہوا: ''اور اُن لوگوں کو تو یہی حکم ہوا کہ اللہ کی بندگی کریں، نرے اسی پر عقیدہ لاتے، ایک طرف کے ہو کر''۔

آخری 22 سورتوں کا مطالعہ فرمائیں تو جا بجا تزکیۂ عقائد کے حوالے سے توحید و رسالت و آخرت کے مہکتے پھول نظر آتے ہیں۔ چند حوالے ملاحظہ ہوں۔

فرمایا گیا، ''تم فرماؤ! وہ اللہ ہے، وہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ اس کی کوئی اولاد اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا، اور نہ اس کے جوڑ کا کوئی''۔ (الاخلاص)

یہ بھی ارشاد ہوا: ''تم فرماؤ! میں اُس کی پناہ لیتا ہوں جو صبح کا پیدا کرنے والا ہے، اُس کی سب مخلوق کے شر سے''۔ (الفلق)

مزید فرمایا گیا، ''تم کہو! میں اُس کی پناہ میں آیا جو سب لوگوں کا رب، سب لوگوں کا بادشاہ، سب لوگوں کا معبود ہے''۔ (الناس)

اب انہی سورتوں کی روشنی میں عقیدۂ رسالت ملاحظہ کیجیے۔ ارشاد ہوا:

''کتابی کافر اور مشرک اپنا دین چھوڑنے کو نہ تھے جب تک اُن کے پاس روشن دلیل نہ آئے۔ وہ کون؟ وہ اللہ کا رسول جو پاک صحیفے پڑھتا ہے''۔ (البینہ)

''اور بیشک ہر آنے والا لمحہ تمہارے لیے پہلے سے بہتر ہے۔ اور بیشک قریب ہے کہ تمہارا رب تمہیں اتنا دے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے''۔ (الضحیٰ)

”کیا ہم نے تمہارا سینہ کشادہ نہ کیا۔ اور تم پر سے وہ بوجھ اتار لیا جس نے تمہاری کمر بوجھل کر دی تھی۔ اور ہم نے تمہارے لیے تمہارا ذکر بلند کر دیا“۔ (الم نشرح)

”بیشک ہم نے تمہیں بیشمار خوبیاں عطا فرمائیں، تو تم اپنے رب کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو، بیشک جو تمہارا دشمن ہے وہی ہر خیر سے محروم ہے“۔ (الکوثر)

عقیدۂ آخرت سمجھنا ہو تو سورۃ التین، سورۃ العلق، سورۃ الزلزال، سورۃ العادیات، سورۃ القارعہ، سورۃ التکاثر، سورۃ الھمزہ اور سورۃ الماعون ملاحظہ فرمالیجیے۔

تزکیۂ اعمال کے حوالے سے بھی ان سورتوں میں نہایت اہم تعلیمات موجود ہیں۔ اہم ترین حقیقت سورۃ العصر میں یہ بیان ہوئی کہ زمانۂ محبوب کی قسم! ہر انسان ضرور نقصان میں ہے سوائے اُن کے جو ایمان لائے، اور اچھے کام کیے، اور ایک دوسرے کو حق کی تاکید کی اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی۔ گویا زندگی کے سرمائے کو بچانے کی یہی صورت ہے کہ مذکورہ چار اوصاف اپنا لیے جائیں۔

دین میں اخلاص بنیادی شرط ہے ورنہ سب بیکار۔ سورۃ البینہ میں ارشاد ہوا: اور ان لوگوں کو تو یہی حکم ہوا کہ اللہ کی بندگی کریں نرے اُسی پر عقیدہ لاتے، ایک طرف کے ہو کر، اور نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ دیں، اور یہ سیدھا دین ہے۔ سورۃ الماعون میں اُن نمازیوں کے لیے خرابی بیان ہوئی جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں۔

سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے سورۃ العلق میں پڑھنے لکھنے اور حصولِ علم کی فضیلت بیان ہوئی۔ سورۃ التین میں یہ بتایا گیا کہ انسان کو احسنِ تقویم میں پیدا کیا گیا اور یہ برائیاں کرتے کرتے انتہائی پستی میں گر جاتا ہے۔ سورۃ الھمزہ میں غیبت اور عیب جوئی کرنے والے کو ہلاکت کی وعید سنائی گئی۔ سورۃ الماعون میں بُرے اخلاق کی مذمت کے ذریعے اعمالِ صالحہ اپنانے کی تلقین کی گئی۔

تزکیۂ فکر و عمل کے حوالے سے دو سورتیں بڑی اہم ہیں۔ سورۃ العادیات میں مالک کی اطاعت میں گھوڑوں کے مشقت اٹھانے کی قسم ارشاد فرما کر انسان کا ناشکرا، لالچی اور غافل ہونا بیان ہوا ہے۔ پھر قبروں سے اٹھائے جانے اور سینوں میں چھپی باتیں کھولنے کا ذکر کر کے اسے مزید تنبیہ کی گئی ہے۔

اسی طرح سورۃ التکاثر میں کثرتِ مال کی حرص و ہوس میں مبتلا، موت سے غافل لوگوں کو بیدار ہونے کا پیغام دیا گیا، اور بتایا گیا کہ مال کی زیادہ طلبی کا انجام جہنم ہے۔ یہ حقیقت آج مان لو تو بہتر ہے

ورنہ کل مرنے کے بعد تو مان ہی جاؤ گے۔ مال واولاد اور نعمتوں کی کثرت آزمائش ہے، قیامت میں ان نعمتوں کا حساب دینا ہو گا۔

ان سورتوں میں نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے کئی اہم پہلو بھی بیان ہوئے ہیں جن میں آپ کا یتیم ہونا، محبتِ الٰہی میں وارفتہ ہونا، آپ کے گستاخ ابولہب اور اس کی بیوی کا برباد ہونا، ابوجہل کی پیشانی پکڑ کر گھسیٹنے کی وعید، مکہ کی فتح اور لوگوں کا فوج در فوج دین میں داخل ہونا اور قریش پر انعامات کا ذکر شامل ہیں۔

سورۃ الکافرون میں بتایا گیا کہ دنیا میں خیر وشر کا معرکہ ہمیشہ سے جاری ہے اور حق وباطل کے درمیان کوئی اور راہ نہیں۔ گویا ایک شیطان کا گروہ ہے جس میں کفار اور منافق ہیں اور دوسرا اللہ کا گروہ۔ فیصلہ آپ نے کرنا ہے کہ آپ کس کے ساتھ ہیں؟

نیکی یا برائی کا سرچشمہ دل ہے۔ اسی لیے حدیث پاک میں فرمایا گیا، جس کا دل سنور گیا، اس کی زندگی سنور گئی۔ شیطان دل ہی میں وسوسے ڈالتا ہے۔ دل کو ستھرا کیجیے، اس کے لیے خیالات کو پاکیزہ کیجیے۔ مومن کبھی فارغ نہیں رہتا۔ سورۃ الانشراح میں اسے عبادت وریاضت میں مصروف رہنے اور اللہ تعالیٰ سے لَو لگانے کی تلقین فرمائی گئی، اور مُعَوِّذَتَیْن میں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے، ہر شخص صبح اٹھ کر اپنی زندگی کے سرمایہ (وقت) کا سودا کرتا ہے پھر یا تو اسے نقصان سے بچا لیتا ہے یا برباد کر ڈالتا ہے۔ (مسلم)

اس تیز رفتار زندگی میں ہر شخص بہت مصروف ہے۔ لوگ نماز پڑھنے کے لیے وقت نہیں نکالتے تو قرآن کریم ترجمہ وتفسیر کے ساتھ، باقاعدہ کسی عالم سے پڑھنے کے لیے وقت کیونکر نکالیں گے۔ اسی خیال سے اُستاذی ومرشدی حضرت شاہ صاحب قبلہ کی خدمت میں عرض کی کہ آخری سورتوں کی جو بنیادی عقائد کا جامع بیان ہیں، سادہ اور آسان تفسیر تحریر فرما دیجیے تاکہ ہر خاص وعام استفادہ کر سکے۔ احقر کے پُرزور اصرار پر آپ راضی ہوئے اور اس کام کا آغاز کیا۔

"انوارُ القرآن" کی تصنیف کے دوران جن تفاسیر سے استفادہ کیا گیا اُن میں تفسیر کبیر، تفسیر قرطبی، روح المعانی، روح البیان، ابن کثیر، تفسیر مظہری، تفسیر دُرِ منثور، تفسیر عزیزی اور خزائن العرفان زیادہ نمایاں ہیں۔ دیگر کتبِ تفاسیر واحادیث وشروح کے حوالے جابجا کتاب میں دے دیے

گئے ہیں۔

تیسویں پارے کی آخری ۲۲ سورتوں کی یہ تفسیر کم و بیش تین سال کے عرصے میں مکمل ہوئی۔ اس کی بنیادی وجہ حضرت شاہ صاحب مدّظلہٗ کی بے پناہ دینی مصروفیات ہیں۔ مسودہ کی ترتیب بھی ایک مشکل مرحلہ تھی جو حضرت شاہ صاحب قبلہ کی نظرِ کیمیا گر کے فیضان سے آسان ہوئی۔ اللہ تعالیٰ شاہ صاحب دامت فیوضہم وبرکاتہم العالیہ کے فیوض و برکات سے ہمیں مزید مستفیض فرمائے۔ آمین

اس سال ۲۳ جون ۲۰۱۰ء کو میری والدہ ماجدہ کا طویل علالت کے بعد وصال ہو گیا، اللہ تعالیٰ اپنے حبیبِ مکرم ﷺ کے طفیل ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنتُ الفردوس عطا کرے، آمین۔ پھر میرے والدِ گرامی مدّظلہٗ ہسپتال میں کافی عرصہ زیرِ علاج رہے۔ ان وجوہ کی بناء پر کمپوزنگ کا کام جاری نہ رہ سکا۔

پھر قبلہ والدِ گرامی نے خود مجھ سے فرمایا کہ تم کتاب کا کام شروع کردو، میری فکر نہ کرو تو احقر نے دوبارہ مسوّدہ کمپوز کرنا شروع کر دیا۔ الحمدللہ! دینی و دفتری مصروفیات کے ساتھ ساتھ ڈھائی تین ماہ کی مسلسل محنت کے بعد کمپوزنگ مکمل ہو گئی۔

برادرِ مکرم حافظ انجینئر محمد عارف قادری حفظہ اللہ نے عرق ریزی سے پروف ریڈنگ کی۔ ملک محمد حیات صاحب نے بھی پروف ریڈنگ کی۔ محترم و مکرم صاحبزادہ عطاء المصطفیٰ نوری زید مجدہٗ کا مشکور ہوں کہ انہوں نے طباعت میں نہایت محنت اور خصوصی توجہ سے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ فجزاھم اللہ تعالیٰ

عزیزم برادر محمد عاطف قادری کا مشکور ہوں کہ گھریلو اُمور انہوں نے اپنے ذمے لیے رکھے تاکہ میں دلجمعی سے کام کر سکوں۔ میں ان تمام احباب اور معاونین نیز اپنی اہلیہ اور بیٹیوں کے لیے بھی دعاگو ہوں جنہوں نے اس کام میں مجھے آسانی مہیا کی کہ رب تعالیٰ ان سب کو دنیا اور آخرت کی بھلائیاں اور راحتیں عطا فرمائے۔ آمین

اہلِ ایمان سے گذارش ہے کہ ان سورتوں کے ترجمہ و تفسیر کو بار بار پڑھیں، سمجھ کر یاد کریں اور اخلاص سے عمل کی کوشش کریں، یہی صراطِ مستقیم ہے۔ اللہ تعالیٰ تفسیر ''انوارُ القرآن'' کے انوار سے سب مسلمانوں کے سینے پُرنور فرمائے۔ آمین

خاکپائے علماءِ حق، محمد آصف قادری غفرلہٗ ولوالدیہ

تفسیر سورۃ الضحیٰ

سورۃ الضحیٰ مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں گیارہ آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

وَ الضُّحٰی ﴿۱﴾ وَ الَّیۡلِ اِذَا سَجٰی ﴿۲﴾ مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَ مَا قَلٰی ﴿۳﴾ وَ لَلۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لَّکَ مِنَ
الۡاُوۡلٰی ﴿۴﴾ وَ لَسَوۡفَ یُعۡطِیۡکَ رَبُّکَ فَتَرۡضٰی ﴿۵﴾ اَلَمۡ یَجِدۡکَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی ﴿۶﴾ وَ وَجَدَکَ ضَآلًّا
فَہَدٰی ﴿۷﴾ وَ وَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغۡنٰی ﴿۸﴾ فَاَمَّا الۡیَتِیۡمَ فَلَا تَقۡہَرۡ ﴿۹﴾ وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا
تَنۡہَرۡ ﴿۱۰﴾ وَ اَمَّا بِنِعۡمَۃِ رَبِّکَ فَحَدِّثۡ ﴿۱۱﴾

’’اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا (ہے)‘‘

’’چاشت کی قسم اور رات کی جب وہ پردہ ڈالے۔ کہ تمہیں تمہارے رب نے نہ چھوڑا اور نہ مکروہ جانا۔ اور بیشک پچھلی تمہارے لیے پہلی سے بہتر ہے۔ اور بیشک قریب ہے کہ تمہارا رب تمہیں اتنا دے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے۔ کیا اُس نے تمہیں یتیم نہ پایا پھر جگہ دی۔ اور تمہیں اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی۔ اور تمہیں حاجت مند پایا پھر غنی کر دیا۔ تو یتیم پر دباؤ نہ ڈالو۔ اور منگتا کو نہ جھڑکو۔ اور اپنے رب کی نعمت کا خوب چرچا کرو‘‘۔ (کنز الایمان از اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ)

لفظی ترجمہ:

الرَّحِیۡم	الرَّحۡمٰنِ	اللّٰہ	اِسۡم	بِ
رحم والا	نہایت مہربان	اللہ (کے)	نام	سے

سَجٰی	اِذَا	الَّیۡلِ	وَ	الضُّحٰی	وَ
چھاجائے	جب	رات (کی)	اور	چاشت (کی)	قسم

مَا	وَدَّعَ	كَ	رَبُّ	كَ	وَ	مَا	قَلٰى
نہ	چھوڑا	تمہیں	رب (نے)	تمہارے	اور	نہ	وہ ناراض ہوا

وَ	لَ	الْاٰخِرَةُ	خَيْرٌ	لَ	كَ	مِنَ	الْاُوْلٰى
اور	البتہ	پچھلی (گھڑی)	بہتر ہے	لیے	تمہارے	سے	پہلی (گھڑی)

وَ	لَ	سَوْفَ	يُعْطِىْ	كَ	رَبُّ	كَ	فَ	تَرْضٰى
اور	البتہ	عنقریب	دے گا	تمہیں	رب	تمہارا	پس	تم راضی ہو جاؤ گے

اَ	لَمْ	يَجِدْ	كَ	يَتِيْمًا	فَ	اٰوٰى
کیا	نہ	پایا اُس نے	تمہیں	یتیم	پھر	جگہ دی اس نے

وَ	وَجَدَ	كَ	ضَآلًّا	فَ	هَدٰى
اور	پایا اس نے	تمہیں	گم (اپنی محبت میں)	تو پس	راہ دی اس نے

وَ	وَجَدَ	كَ	عَآئِلًا	فَ	اَغْنٰى
اور	پایا اُس نے	تمہیں	حاجت مند	تو	غنی کر دیا اُسنے

فَ	اَمَّا	الْيَتِيْمَ	فَ	لَا	تَقْهَرْ
تو	بہر حال	یتیم (پر)	پس	نہ	سختی کرو

وَ	اَمَّا	السَّآئِلَ	فَ	لَا	تَنْهَرْ
اور	بہر حال	منگتے (کو)	پس	نہ	جھڑ کو

وَ	اَمَّا	بِ	نِعْمَةِ	رَبِّ	كَ	فَ	حَدِّثْ
اور	بہر حال	(کو)	نعمت	رب (کی)	اپنے	پس	بیان کرو

ربط و مناسبت:

قرآن کریم میں جس ترتیب کے ساتھ سورتیں موجود ہیں، ان کے مضامین پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان سورتوں میں ایک خاص ربط اور باہم مناسبت ہے۔ اس خاص ربط و مناسبت کی وجہ سے مذکورہ ترتیب متعدد اسرار و رموز کا مخزن ہے۔ اسی تناظر میں سورۃ الضحیٰ کے سابقہ سورت سے ربط پر چند نکات پیشِ خدمت ہیں۔

(1) اس سے قبل سورۃ الشمس میں بیان ہوا تھا کہ ہر انسان کو برائی اور اچھائی کا شعور عطا فرما دیا گیا اور اسے نیکی اور بدی میں سے کسی بھی راہ کو اختیار کرنے کی آزادی دی گئی، اب اگر وہ نیکی کا راستہ چلے گا تو کامیاب ہو جائے گا ورنہ ناکام۔ ارشاد ہوا:

{ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا(۸) قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا(۹) وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا(۱۰) } "پھر اس کی بدکاری اور اس کی پرہیزگاری اس کے دل میں ڈالی۔ بیشک مراد کو پہنچا جس نے اسے ستھرا کیا اور نامراد ہوا جس نے اسے معصیت میں چھپایا"۔ (پ30، شمس:8-10)

پھر سورۃ الیل میں فرمایا گیا، ہر انسان کی کوشش مختلف ہے، اچھے اعمال کی وجہ سے جنت کا راستہ آسان ہو جاتا ہے اور برے اعمال کے سبب انسان جہنم کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ نیز یہ بھی فرمایا گیا، "بیشک ہدایت فرمانا ہمارے ذمے ہے"۔ (پ30، اللیل:12)

جبکہ اس سورت میں حق کے ہادی، حق کے رہبر، رحمتِ عالم، نورِ مجسم، سیدِ عالم ﷺ کے فضائل بیان فرمائے گئے اور یہ تعلیم دی گئی ہے کہ امت اعمالِ صالحہ کے ساتھ ساتھ آقا و مولیٰ ﷺ کی شان و عظمت دلوں میں راسخ کرے اور ان سے محبت کرے تاکہ ان کی اطاعت کرنا اور ان کے مشن کو اپنانا آسان ہو جائے۔

(2) سورۃ الیل میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے فضائل بیان ہوئے اس لیے اسے "سورۃ ابو بکر" بھی کہتے ہیں جبکہ سورۃ الضحیٰ میں رسول کریم ﷺ کے فضائل بیان ہوئے اس لیے اسے "سورۃ النبی ﷺ" بھی کہا جاتا ہے۔

(3) سورۃ الیل میں پہلے رات اور پھر دن کی قسم ارشاد ہوئی تھی، سورۃ الضحیٰ میں پہلے دن اور پھر

رات کی قسم ارشاد فرمائی گئی۔اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے قبولِ ایمان سے پہلے کا زمانہ تاریکی اور اندھیری رات کی مثل ہے جبکہ رسولِ معظم ﷺ شروع ہی سے مومن اور منصبِ نبوت پر فائز تھے اور آپ کا قلبِ انور تجلیاتِ ربانی سے منور تھا۔ گویا آفتابِ نبوت کے طلوع ہونے سے پہلے آئینۂ صدیق بے نور رات کی مانند تھا۔ اس لیے سورۃ الیل میں رات کا ذکر پہلے ہے اور سورۃ الضحیٰ کو دن کے ذکر سے شروع فرمایا گیا۔

(4) سورۃ الیل پہلے ہے اور اس کے بعد سورۃ الضحیٰ ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ رات کا اندھیرا پہلے ہوتا ہے پھر دن کا اُجالا نمودار ہوتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

{وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ ؕ} ''اور اندھیریاں اور روشنی پیدا کی''۔(پ7،انعام:1)

رب تعالیٰ نے رات کو دن پر مقدم کیا کیونکہ دنیا میں پہلے کفر و شرک کے اندھیرے چھائے ہوئے تھے، آفتابِ رسالت کی صبح طلوع ہونے کے بعد وہ تاریکیاں دور ہو گئیں اور ہر طرف ہدایت کی روشنی پھیل گئی۔

(5) سورۃ الیل میں اَشْقٰی (منکرِ رسالت) کی مذمت اور اَتْقٰی یعنی سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی شان بیان ہوئی جبکہ سورۃ الضحیٰ میں بھی منکرینِ رسالت کی تردید اور سیدُ الاتقیاء امامُ الانبیاء رسولِ معظم ﷺ کی شان مذکور ہے۔

(6) سورۃ الیل میں {لَسَوْفَ یَرْضٰی} ''بیشک قریب ہے کہ وہ راضی ہو گا'' فرما کر رضائے صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کا ذکر ہوا اور سورۃ الضحیٰ میں {وَ لَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰیؕ(۵)} (پ30، والضحیٰ:5) فرما کر رضائے مصطفی ﷺ کو بیان فرمایا گیا۔

(7) سورۃ الیل کا اختتام سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی شان پر ہوا اور سورۃ الضحیٰ کا آغاز شانِ محمد مصطفی ﷺ سے ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مقامِ صدیقیت کے بعد مقامِ نبوت کا درجہ ہے۔ نیز ان دونوں سورتوں کے درمیان کوئی اور سورت نہیں، اسی طرح رسولِ معظم ﷺ اور سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے درمیان کوئی تیسرا نہیں ہے۔اس میں اشارہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے بعد تمام لوگوں میں افضل ترین ہستی سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہے۔ اس میں سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافتِ بلا فصل کا اشارہ بھی موجود ہے۔

(8)سورۃ الیل میں {مِنۡ نِّعۡمَةٍ تُجۡزٰٓی(۱۹)}(پ30،اللیل:19) فرما کر نعمت کا شکر ادا کرنے کا اشارہ دیا گیا تھا اور سورۃ الضحیٰ میں {بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ(۱۱)}(پ30،والضحیٰ:11) فرما کر واضح طور پر نعمت کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا گیا۔

شانِ نزول:

حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ طبیعتِ مبارکہ ناساز ہونے کی وجہ سے دو تین راتیں تہجد کے وقت قیام نہ فرما سکے۔ اس پر ایک گستاخ عورت (ابولہب کی بیوی) آئی اور اس نے کہا، "اے محمد (ﷺ)! مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تجھے تیرا شیطان چھوڑ گیا ہے، میں نے اسے دو تین راتوں سے تیرے پاس نہیں دیکھا"۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ (بخاری، مسلم)

مفسرین کرام کا یہ بھی ارشاد ہے، ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ چند روز تک وحی نہ آئی تو کفار نے طعنہ کے طور پر کہا، محمد (ﷺ) کو ان کے رب نے چھوڑ دیا اور وہ ان سے بیزار ہو گیا۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔[1]

وَالضُّحٰىۙ وَالَّيۡلِ اِذَا سَجٰىۙ:

"ضُحیٰ" کا معنی ہے چاشت کا وقت یعنی دن کا ابتدائی حصہ جو سورج کے بلند ہونے سے لیکر اس کی شعاعوں کے بڑھنے تک ہوتا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ضحیٰ سے تمام دن مراد ہے کیونکہ یہ "لیل" کے مقابل بیان ہوا ہے۔

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ ضحیٰ سے مراد وہ دن ہے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا، اور رات سے مراد شبِ معراج ہے جس میں رب تعالیٰ نے حضور ﷺ کو اپنا دیدار عطا فرمایا۔[2]

☆"بعض مفسرین کا ارشاد ہے کہ ضحیٰ سے مراد رسولِ معظم ﷺ کی ولادتِ باسعادت کا دن ہے اور لیل سے مراد شبِ معراج ہے۔

☆بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ضحیٰ سے مراد آقا و مولیٰ ﷺ کا چہرۂ مبارک اور لیل سے

1...تفسیر مقاتل، والضحیٰ، 3/494۔ 2...تفسیر قرطبی، والضحیٰ، 20/91

حضور ﷺ کی زلفِ عنبریں مراد ہے۔

☆ بعض کا قول ہے کہ ضحیٰ سے مراد نورِ علم ہے جو حضور ﷺ کو عطا ہوا جس کے باعث آپ پر عالمِ غیب کے اسرار و رموز منکشف ہوئے اور لیل سے رحمتِ عالم ﷺ کا عفو و درگزر مراد ہے جس نے امت کے عیبوں کو چھپالیا۔

☆ بعض کا کہنا ہے کہ دن سے حضور ﷺ کے ظاہری احوال مراد ہیں جن سے لوگ آگاہ ہیں اور رات سے مراد حضور ﷺ کے باطنی احوال ہیں جن کو علام الغیوب کے سوا کوئی نہیں جانتا"۔ (3)

ضحیٰ کا وقت لوگوں کے باہم ملنے اور حصولِ معاش کا وقت ہے گویا یہ میدانِ حشر کی مثل ہے جہاں لوگ متفکر و منتشر ہونگے۔ اور لیل یعنی رات سکون اور نیند کے لیے ہے اس لیے یہ قبروں میں ٹھہرنے کی مثل ہے۔ چونکہ زندگی کو موت پر اور آخرت کو زندگی پر فضیلت حاصل ہے اس لیے "ضحی" کا ذکر "لیل" سے پہلے کیا گیا۔

دن کی روشنی رب کریم کی رحمت کی مثل ہے اور رات کی تاریکی عذابِ الٰہی کی مانند۔ یہاں دن کا ذکر پہلے کیا گیا تاکہ لوگ رحمت سے مایوس نہ ہوں اور پھر رات کا ذکر فرمایا تاکہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بے خوف نہ ہو جائیں۔ (4)

ایک قول یہ ہے کہ ضحی سے مراد جنت کی روشنی اور لیل سے مراد جہنم کی تاریکی ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ضحی سے قلوبِ عارفین کا نور مراد ہے اور لیل سے قلوبِ کافرین کی ظلمت۔ ان الفاظ سے مذکورہ تمام معانی مراد لیے جاسکتے ہیں کیونکہ یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس کے الفاظ وسیع المعنی اور کثیر عمدہ احتمالات پر مشتمل ہوتے ہیں۔

محدث علی قاری رحمہ اللہ شرح شفا شریف میں فرماتے ہیں: یہ سورت جس مقصد کے لیے نازل ہوئی، اس کا تقاضا یہی ہے کہ یہ کہا جائے کہ ضحی سے رسولِ معظم ﷺ کا چہرۂ انور اور لیل سے آپ کی مبارک سیاہ زلفیں مراد ہیں۔

امام رازی رحمہ اللہ نے تفسیر کبیر میں یہ قول ذکر کیا ہے کہ "ضحی سے رسولِ کریم ﷺ کا چہرۂ انور اور

3... تفسیر عزیزی، والضحیٰ، تحت الآیۃ: 1

4... تفسیر کبیر، والضحیٰ، 16/ 205

لیل سے آپ کی سیاہ زلفیں مراد ہیں"۔ اور فرمایا ہے کہ یہ معنی لینے میں کوئی حرج نہیں۔ (5)

حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: لَمْ اَرَ شَيْئاً قَطُّ اَحْسَنَ مِنْهُ۔

"میں نے آقا و مولیٰ ﷺ سے زیادہ حسین کوئی نہ دیکھا"۔ (6)

حضرت ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: لَوْ رَأَيْتَهٗ رَأَيْتَ الشَّمْسَ طَالِعَةً۔

"اگر تم اُنہیں دیکھتے تو گویا سورج کو طلوع ہوتا دیکھتے"۔ (7)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مَا رَأَيْتُ شَيْئاً اَحْسَنَ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ كَاَنَّ الشَّمْسَ تَجْرِيْ فِيْ وَجْهِهٖ۔ "میں نے رسولِ معظم ﷺ سے زیادہ خوبصورت کسی کو نہ دیکھا گویا سورج آپ کے چہرۂ انور میں چلتا تھا"۔ (8)

بقول شیخ سعدی رحمہ اللہ،

اگر نہ واسطہ روئے و موئے او بودے
خدائے نہ گفتے قسم بہ لیل و نہار

"اگر حضور ﷺ کے چہرۂ انور اور مبارک زلفوں کی بات نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ ہر گز رات اور دن کی قسم ارشاد نہ فرماتا"۔

علامہ اسماعیل حقی رحمہ اللہ نے بھی تفسیر روح البیان میں یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ اکابر مفسرین و علمائے کرام کی تصریحات کی روشنی میں اب ان آیات کا مفہوم یہ ہوگا،

"چاشت (کی طرح چمکتے ہوئے چہرۂ مصطفی ﷺ) کی قسم اور رات (کی مانند حضور ﷺ کی سیاہ زلفوں) کی قسم جب وہ پردہ ڈالے کہ تمہیں تمہارے رب نے نہ چھوڑا اور نہ مکروہ جانا"۔

علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ نے بڑی پیاری بات لکھی ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

جیسے دن کی ایک ساعت رات کی تمام ساعتوں پر حاوی ہے اسی طرح آقا و مولیٰ ﷺ کے معجزات و کمالات تمام انبیاءِ کرام علیہم السلام کے معجزات و کمالات پر غالب ہیں۔ گویا رب تعالیٰ نے دن کی

5...تفسیر کبیر، والضحیٰ، 16/207

6...بخاری، کتاب المناقب،، حدیث:3551

7...دارمی، باب فی حسن النبی ﷺ، حدیث:60

8...ترمذی، کتاب المناقب، حدیث:3648

اس ساعت کی قسم ارشاد فرمائی جو تمام رات پر اس طرح غالب ہے جس طرح اکیلے امام الانبیاء سیدِ عالم ﷺ کے خصائص و کمالات تمام انبیاءِ کرام کے کمالات پر غالب و حاوی ہیں۔[9]

دن اور رات کی قسم کیوں؟

کفار و مشرکین نے دو باتوں کا دعویٰ کیا۔ ایک یہ کہ آپ کے رب نے آپ کو چھوڑ دیا ہے اور دوم یہ کہ وہ آپ سے ناراض ہو گیا ہے۔ کفار پر لازم تھا کہ وہ اپنے دعوے پر گواہ پیش کرتے۔ جب وہ اپنے دعوے پر گواہ نہ پیش کر سکے تو قاعدے کی رو سے حضور ﷺ پر لازم تھا کہ آپ ان کے اس دعوے کے انکار پر قسم اُٹھاتے۔

اس لیے قسم حضور کے ذمے تھی لیکن آپ کی بجائے آپ کے رب نے قسم ارشاد فرما کر یہ واضح کر دیا کہ میرا اور میرے محبوب رسول ﷺ کا معاملہ ایک ہی ہے۔ جو قسم میرے محبوب رسول ﷺ پر لازم آتی ہے وہ میرے ذمہ کرم پر ہے۔

قسم یاد فرمانے کے لیے دن اور رات کا انتخاب فرمانے میں بھی کئی حکمتیں ہیں۔

(1) رب تعالیٰ کا ارشاد ہے، ”بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کی باہم بدلیوں میں نشانیاں ہیں عقلمندوں کے لیے“۔ (پ4، ال عمران:190)

جس طرح دن کی روشنی کے بعد رات کی تاریکی کا آنا رب تعالیٰ کی ناراضگی کی دلیل نہیں اسی طرح وحی آنے کے بعد وحی کا نہ آنا بھی رب تعالیٰ کی ناراضگی کی دلیل نہیں اور نہ ہی اس بات کی علامت کہ وہ اپنے رسول سے بیزار و ناراض ہے۔

(2) ان آیات میں نبی کریم ﷺ کو بشارت دی گئی ہے کہ جس طرح رات کے بعد دن کا آنا ضروری ہے اسی طرح وحی نہ آنے کی کیفیت کے بعد آپ ﷺ پر وحی کا آنا بھی ضروری ہے۔ جس طرح شب کے بعد دن کی آمد مسلسل جاری ہے اسی طرح آپ ﷺ پر وحی کی آمد بھی مسلسل جاری رہے گی۔

(3) وحی نازل نہ ہونے کا مذکورہ واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اسے رب تعالیٰ نازل فرماتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ حضور ﷺ کا اپنا کلام ہوتا تو وحی نازل ہونے میں رکاوٹ

9...روح المعانی، والضحیٰ، تحت الآیۃ:2

نہ ہوتی اور نہ ہی مشرکین مذکورہ طعنہ دیتے۔[10]

(4)ان آیات میں ایک اشارہ یہ بھی ہے کہ جس طرح رات اور دن ایک دوسرے سے مختلف حالتیں ہیں جو تبدیل ہوتی رہتی ہیں اسی طرح حالات میں تبدیلی بھی فطری بات ہے۔ آج اگر لوگ راہِ حق میں رکاوٹیں کھڑی کر رہے ہیں اور آپ کو مشکلات اور مخالفتوں کا سامنا ہے تو یہ حالات یقیناً تبدیل ہونگے۔ایک وقت آئے گا کہ لوگ دعوتِ حق قبول کریں گے اور آپ کا دین تمام باطل مذاہب پر غالب آئے گا۔

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى:

دن کا روشن ہونا اور رات کا تاریکی پھیلا دینا دونوں حالتیں رب تعالیٰ کی حکمت بھری نشانیاں ہیں۔اگر مسلسل دن رہے اور رات نہ آئے تو لوگ تھک جائیں۔رب تعالیٰ نے ہمارے سکون وآرام ہی کے لیے رات بنائی۔اسی طرح اگر حضور ﷺ پر مسلسل وحی نازل ہوتی رہتی تو آپ تھک جاتے لہٰذا رب تعالیٰ نے آپ کے سکون وآرام کی خاطر وحی کے نزول میں وقفہ رکھا، کبھی کم کبھی زیادہ۔ وحی کے نزول میں تاخیر سے کافروں نے یہ سمجھا کہ آپ کے رب نے آپ کو چھوڑ دیا ہے اور وہ آپ سے ناراض ہو گیا ہے۔رب تعالیٰ نے دو قسمیں ارشاد فرما کر حضور کی عظمت وشان بیان فرمائی اور ان کے دونوں دعوے رَد کر دیے۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: رب تعالیٰ نے مطلقاً ذکر فرمایا،وَ مَا قَلٰی۔"اور نہ وہ تم سے ناراض ہوا"۔وجہ یہ ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ تمہارا رب نہ تم سے ناراض ہوا نہ صحابہ سے، بلکہ اے حبیب ﷺ! قیامت تک جو تم سے محبت کرنے والے ہوں گے،وہ ان سے بھی ناراض نہیں، تاکہ تمہارا یہ ارشاد پختہ ہو جائے،اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ"(قیامت میں)ہر شخص اپنے محبوب کے ساتھ ہو گا"۔[11]

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى:

آیتِ کریمہ { مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَ مَا قَلٰی(۳) }نازل ہونا آقا و مولیٰ ﷺ کی عظمت وشان پر روشن دلیل تھی،اس کے باوجود حضور ﷺ کی شان مزید اُجاگر کرنے کے لیے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:"

10...تفسیر کبیر،والضحیٰ، تحت الایۃ:3

11...بخاری، کتاب الادب، حدیث:6168

اور بیشک پچھلی تمہارے لیے پہلی سے بہتر ہے“۔
یعنی دنیا میں بھی آپ کے لیے عظمت و کرامت ہے مگر آخرت میں آپ کو دنیا سے بڑھ کر عزت و شرف اور عظمت و منصب عطا ہو گا۔

اس مفہوم کی بناء پر تفسیر یہ ہو گی کہ اے حبیب ﷺ! آپ کے لیے آخرت دنیا سے بہتر ہے کیونکہ وہاں آپکے لیے مقامِ محمود، حوضِ کوثر، تمام انبیاء ورُسل علیہم السلام پر آپ کی فضیلت ظاہر ہونا، شفاعتِ کبریٰ کا تاج آپکے سر پر سجایا جانا، آپ کی امت کا تمام امتوں پر گواہ ہونا، آپ کی شفاعت سے گنہگاروں کی مغفرت اور مومنوں کے مرتبے بلند ہونا، اور بھی بے انتہا عزتیں اور کرامتیں ہیں جو آخرت میں آپ کو عطا ہو نگی۔

مفسرین نے اس کے یہ معنی بھی بیان فرمائے ہیں کہ آنے والے احوال آپ کے لیے گزشتہ سے بہتر و برتر ہیں۔ گویا کہ حق تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ روز بروز آپ ﷺ کے درجے بلند کرے گا اور عزت پر عزت اور منصب پر منصب زیادہ فرمائے گا اور ساعت بساعت آپ کے مراتب ترقیوں میں رہیں گے۔ (12)

بقول امام رازی رحمہ اللہ، اللہ تعالیٰ یہ وعدہ فرما رہا ہے کہ وہ آپ کے لیے دن بدن عزت و عظمت میں اضافہ فرماتا رہے گا۔ گویا کہ یہ ارشاد ہوا: کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں اپنے حبیب سے ناراض ہو گیا ہوں بلکہ میں ہر آنے والے لمحے میں اپنے محبوب رسول ﷺ کے منصب و مقام اور عزت و عظمت میں اضافہ کرتا رہوں گا۔ (13)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب رسول ﷺ کی امت پر جو نعمتیں کشادہ فرمانے والا تھا، وہ رب تعالیٰ نے حضور ﷺ پر پیش فرما دیں تو حضور ﷺ خوش ہو گئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (14)

تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ ایک وہ وقت تھا جب نبی کریم ﷺ کی دعوتِ حق کو گنتی کے چند افراد

12... تفسیر خزائن العرفان، والضحیٰ، تحت الآیۃ: 4
13... تفسیر کبیر، والضحیٰ، تحت الآیۃ: 4
14... تفسیر مظہری، والضحیٰ، تحت الآیۃ: 4

نے قبول کیا تھا اور مسلمان چھپ کر نماز ادا کرتے تھے۔ پھر کفار حضور ﷺ کے خون کے پیاسے ہو گئے تو آپ نے مدینہ طیبہ ہجرت فرمائی۔ کفار نے حضور ﷺ کو گرفتار کرنے پر انعام مقرر کر دیا۔ سُراقہ انعام کے لالچ میں آپ کے تعاقب میں پہنچ گیا۔ آپ کے حکم پر زمین نے اس کے گھوڑے کے پاؤں پکڑ لیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ”سراقہ! تو مجھے پکڑنے آیا ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تیرے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن ہونگے“۔ اُس نے معافی مانگی، آپ نے قبول فرمائی۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جب ایران فتح ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ سونے کے کَڑے حضرت سُراقہ رضی اللہ عنہ کو پہنائے۔

سوچئے تو سہی! اس وقت مسلمان بیحد کمزور تھے جبکہ کسریٰ ایک سپر پاور۔ مگر حضور ﷺ کو اپنے رب کی ذات پر اور اپنے رب کے عطا کردہ علمِ غیب پر کس قدر یقین تھا کہ آپ نے یہ پیشین گوئی فرمائی۔ پھر چشمِ فلک نے وہ مناظر بھی دیکھے کہ ماضی کے دشمن شمعِ رسالت کے پروانے بن گئے۔ اور پھر ان کی محبت کا یہ عالم ہو گیا کہ حضور ﷺ کے وضو کا پانی اور لعابِ دہن بھی زمین پر گرنے نہ دیتے بلکہ اسے اپنے چہروں پر مل لیتے۔ وہ حضور ﷺ کے موئے مبارک بڑی کوشش سے حاصل کرتے تا کہ برکت ملے۔ حضور ﷺ اُنہیں جو بھی حکم دیتے وہ فوراً تعمیل کرتے۔

یہ سب کچھ { وَ لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى (۴) } ہی کی چند جھلکیاں ہیں۔ اسی آیت کریمہ کا تقاضا ہے کہ رسول کریم ﷺ کو جو حیات، سماعت، بصارت، علم، قدرت و اختیار اور دیگر کمالات ظاہری حیاتِ طیبہ میں حاصل تھے، وہ وصال کے بعد بھی حاصل رہیں بلکہ ان مراتب اور کمالات میں مزید ترقی ہو۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى:

”اور بیشک قریب ہے کہ تمہارا رب تمہیں اتنا دے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے“۔

حضرت علی اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضورِ اکرم ﷺ کو شفاعت کا منصب عطا فرمائے گا یہاں تک کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک دن آقا و مولیٰ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ارشاد ہے: { فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۚ وَ مَنْ عَصَانِیْ

فَاِنَّكَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ} ”تو جس نے میرا ساتھ دیا وہ تو میرا ہے اور جس نے میرا کہنا نہ مانا، تو بیشک تُو بخشنے والا مہربان ہے“۔(پ13، ابراہیم:36)

پھر یہ آیت تلاوت فرمائی جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ارشاد ہے: { اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ فَاِنَّهُمۡ عِبَادُكَ ۚ وَ اِنۡ تَغۡفِرۡ لَهُمۡ فَاِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ (۱۱۸)} ”اگر تو انہیں عذاب کرے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انہیں بخش دے تو بیشک تُو ہی ہے غالب حکمت والا“۔(پ7، مائدہ:118)

پھر آپ نے اپنے ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے اور عرض کی، اَللّٰھُمَّ اُمَّتِیۡ اُمَّتِیۡ۔ اے اللہ! میری امت، میری امت! پھر حضور ﷺ زارو قطار رونے لگے۔

رب تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو حکم دیا، میرے حبیب کے پاس جاؤ اور رونے کا سبب دریافت کرو (حالانکہ وہ خوب جانتا ہے)۔ حضرت جبریل بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور رونے کی وجہ پوچھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: میں اپنی امت کی مغفرت چاہتا ہوں۔ جبریل علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہو کر سارا حال عرض کیا۔ رب تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو حکم دیا، جاؤ اور میرے حبیب سے کہو: ”بیشک ہم عنقریب تمہیں تمہاری امت کے معاملے میں راضی کریں گے اور ہرگز تمہیں رنجیدہ نہیں ہونے دیں گے“۔ (15)

امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں: یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے فرمان { وَ لَسَوۡفَ يُعۡطِيۡكَ رَبُّكَ فَتَرۡضٰى (۵)} کے موافق ہے۔

راضی کرنے کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا تھا کہ آپ کی امت میں سے بعض کی مغفرت کر دیں اور بعض کو عذاب دیں۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ ”ہم تمہیں راضی کریں گے اور رنجیدہ نہیں ہونے دیں گے“، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم آپ کی امت کے تمام گناہگاروں کو نجات دے دیں گے۔

ایک حدیث پاک میں یہ بھی آیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آقا و مولیٰ ﷺ نے فرمایا: اگر میرا ایک امتی بھی دوزخ میں ہوا تو میں راضی نہیں ہوں گا۔ (16)

15... مسلم، کتاب الایمان، حدیث:346

16... تفسیر کبیر، والضحیٰ، تحت الآیۃ:6

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آقا و مولیٰ ﷺ نے فرمایا :**شفاعتی لاھل الکبائر من امتی۔** میں اپنی امت کے کبیرہ گناہ کرنے والوں کی شفاعت کروں گا۔[17]

حضرت عثمان ذوالنورَین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نورِ مجسم ﷺ کا ارشاد ہے، قیامت کے دن تین گروہ شفاعت کریں گے، انبیاء، علماء پھر شہداء۔[18]

ایک اور حدیث پاک میں ارشاد فرمایا: مجھے اختیار دیا گیا کہ میری آدھی امت جنت میں داخل ہو یا میں شفاعت کروں۔ تو میں نے شفاعت کو اختیار کیا کیونکہ وہ (امت کے لیے) عام اور کافی ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ شفاعت پرہیز گاروں کے لیے ہے؟ نہیں بلکہ وہ تو گناہگاروں کے لیے ہے۔

مولا علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ آقا کریم ﷺ نے فرمایا: میں اپنی امت کے لیے شفاعت کرتا رہوں گا یہاں تک کہ میرا رب مجھ سے فرمائے گا، اے محمد ﷺ! کیا تم راضی ہو گئے؟ تو میں عرض کروں گا، ہاں میرے رب! میں راضی ہو گیا۔

امام باقر رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث روایت کر کے فرمایا، اے اہلِ عراق! تم کہتے ہو کہ قرآن کی سب سے اُمید افزا آیت یہ ہے، ”تم فرماؤ! اے میرے وہ بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی، اللہ کی رحمت سے نااُمید نہ ہو“۔(پ23:زمر:53) لیکن ہم اہلِ بیت یہ کہتے ہیں کہ یہ آیتِ مبارکہ سب سے زیادہ امید افزا ہے:{ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى (۵) }

علامہ آلوسی رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں: ”اللہ تعالیٰ کا یہ وعدۂ کریمہ اُن نعمتوں کو بھی شامل ہے جو آپ کو دنیا میں عطا فرمائیں یعنی کمالِ نفس، اولین و آخرین کے علوم، اسلام کا غلبہ، دین کی سربلندی، اور وہ فتوحات جو عہدِ رسالت میں ہوئیں اور جو عہدِ صحابہ میں ہوئیں اور جو قیامت تک مسلمانوں کو ہوتی رہیں گی، اور اسلام کا مشارق و مغارب میں پھیل جانا۔ یہ وعدۂ کریمہ ان نعمتوں کو بھی شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کے لیے آخرت میں محفوظ رکھی ہیں اور جن کی حقیقت کو رب تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا“۔[19]

17…ترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ۔۔، حدیث:2444

18…ابن ماجہ، کتاب الزھد، حدیث:4313

19…روح المعانی، والضحیٰ، تحت الآیۃ:5۔

ایک موقع پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے آقا و مولیٰ ﷺ کی بارگاہ اقدس میں عرض کیا، ما اری ربک الا یسارع فی ھواک۔ میں یہی دیکھتی ہوں کہ آپ کا رب آپ کی رضا چاہنے میں بہت جلدی کرتا ہے۔ [20]

مجددِ دین وملت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی رحمہ اللہ نے خوب فرمایا،

خدا کی رضا چاہتے ہیں دو عالم
خدا چاہتا ہے رضائے محمد ﷺ

قرآن اور مقامِ محبوبیت:

اللہ تعالیٰ کو حضورِ اکرم ﷺ کی رضا اس قدر محبوب ہے کہ آپ ﷺ کی رضا کی خاطر رب تعالیٰ نے کعبہ کو قبلہ بنا دیا۔ ارشاد ہوا:

{قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا}(پ2،بقرہ:144)

"ہم دیکھ رہے ہیں بار بار تمہارا آسمان کی طرف منہ کرنا، تو ضرور ہم تمہیں پھیر دیں گے اُس قبلہ کی طرف جس میں تمہاری خوشی ہے"۔

رحمتِ عالم ﷺ کی شانِ محبوبیت کا یہ عالم ہے کہ رب تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کی رضا کو اپنی رضا قرار دے دیا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے،

{وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۶۲)}(پ10،توبہ:62)

"اور اللہ ورسول کا حق زائد تھا کہ اُسے راضی کرتے اگر ایمان رکھتے تھے"۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب رسول ﷺ یعنی دو ہستیوں کا ذکر ہے اور {يُّرْضُوْهُ} میں ضمیر واحد بیان ہوئی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسولِ معظم ﷺ کو راضی کرنا دراصل اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہے کیونکہ رسول ﷺ کی رضا میں ہی اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔ ایک اور آیت ملاحظہ فرمائیں: {وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ}(پ10،توبہ:74)

"اور اُنہیں کیا برا لگا، یہی نہ کہ اللہ ورسول نے انہیں اپنے فضل سے غنی کر دیا"۔

20...بخاری، کتاب التفسیر، حدیث:4788

یہاں بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ دونوں کا ذکر ہے اور {مِنۡ فَضۡلِهٖ} میں ضمیر واحد مذکور ہے۔ اس سے بھی ثابت ہوا کہ رسولِ کریم ﷺ کا غنی فرمانا اللہ تعالیٰ ہی کا غنی فرمانا ہے اور اللہ ورسول ﷺ دونوں کا فضل ایک ہی ہے۔

قرآن کریم کی متعدد آیات سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب ﷺ کا معاملہ جدا جدا نہیں بلکہ ایک ہی ہے۔ چند آیات کا خلاصہ ملاحظہ کیجیے۔

☆ حضور ﷺ کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ (پ5، نساء:80)

☆ حضور ﷺ کی نافرمانی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے۔ (پ22، احزاب:36)

☆ حضور ﷺ کی رضامندی اللہ تعالیٰ کی رضامندی ہے۔ (پ10، توبہ:36)

☆ حضور ﷺ کا خاک پھینکنا اللہ تعالیٰ کا خاک پھینکنا ہے۔ (پ9، انفال:17)

☆ حضور اکرم ﷺ کا کلام فرمانا اللہ تعالیٰ کا کلام فرمانا ہے۔ (پ27، نجم:3)

☆ حضورِ انور ﷺ پر سبقت اللہ تعالیٰ پر سبقت ہے۔ (پ26، حجرات:1)

☆ حضورِ اکرم ﷺ کا بلانا اللہ تعالیٰ ہی کا بلانا ہے۔ (پ26، فتح:10، الانفال:24)

☆ حضورِ اکرم ﷺ کی بیعت اللہ تعالیٰ ہی کی بیعت ہے۔ (پ26، فتح:10)

☆ حضور ﷺ کا مذاق اُڑانا اللہ تعالیٰ کا مذاق اُڑانا ہے۔ (پ10، توبہ:65)

☆ حضور ﷺ کو اذیت دینا اللہ تعالیٰ کو اذیت دینا ہے۔ (پ22، احزاب:57)

☆ حضور ﷺ کا حرام فرمایا ہوا اللہ تعالیٰ کا حرام فرمایا ہوا ہے۔ (پ10 التوبۃ:۲۹)

اَلَمۡ یَجِدۡكَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی:

ارشاد ہوا: ”کیا اُس نے تمہیں یتیم نہ پایا پھر جگہ دی“۔

سابقہ آیت میں اُس لطف وکرم کا ذکر ہوا جس سے رب تعالیٰ نے حضورِ اکرم ﷺ کو سرفراز فرمانا تھا اور اب اُن عنایات و احسانات کا تذکرہ ہو رہا ہے جن سے سید عالم حبیبِ پروردگار احمدِ مختار ﷺ کو پہلے ہی نوازا جا چکا ہے، تاکہ یہ تذکرہ آپ کے قلبِ مبارک کے لیے سکون وراحت کا سبب بنے۔

سیرت نگاروں کے مطابق حضور ﷺ اپنی والدہ ماجدہ سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا کے شکمِ اقدس میں تھے

کہ آپ کے والدِ ماجد حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کا وصال ہو گیا۔ جب عمر مبارک چھ سال ہوئی تو والدہ ماجدہ انتقال فرما گئیں۔ پھر آپ کی پرورش آپ کے دادا حضرت عبد المطلب نے کی۔ آپ کی عمر آٹھ سال ہوئی تو آپ کے دادا بھی رحلت فرما گئے۔ گویا رب تعالیٰ نے آپ کے والدین اور دادا کو دنیا سے اس لیے اٹھالیا تاکہ حضور ﷺ کے ذمے ظاہری طور پر کسی کی تعظیم کرنے کا کوئی حق نہ ہو۔

حضرت عبد المطلب کے وصال کے بعد حضورِ اکرم ﷺ کے چچا ابو طالب نے آپ کی پرورش و کفالت کی ذمہ داری کو احسن طریقے سے ادا کیا۔ اس آیت میں اسی نعمت کا بیان ہے کہ شانِ یتیمی کے باوجود رب تعالیٰ نے آپ کی پرورش اور کفالت کا بہترین انتظام فرمایا۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ یہاں یتیم کے معنی "یکتا و بے نظیر" کے ہیں جیسا کہ دُرِّ یتیم اُس موتی کو کہا جاتا ہے جو اپنی سیپی میں اور آب و تاب میں بھی یکتا و بے مثل ہو۔ اسی طرح حضور ﷺ بھی اپنے خصائص و کمالات میں یکتا و بے مثل ہیں۔ اب آیت کے معنی یہ ہونگے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اوصاف و کمالات اور عز و شرف میں یکتا و بے نظیر پایا تو آپ کو مقامِ قرب میں جگہ دی اور دشمنوں کے درمیان آپ کی حفاظت فرمائی اور آپ کو نبوت و رسالت کے ساتھ مشرف فرمایا۔[21]

"بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام مخلوق میں یکتا اور بے مثل و بے نظیر پایا، صدفِ امکان کو آپ جیسا قیمتی موتی کبھی نصیب نہیں ہوا اس لیے رب تعالیٰ نے آپ کو اپنی آغوشِ رحمت میں پناہ دی"۔[22]

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى:

ارشاد ہوا: "اور تمہیں اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی"۔

لفظ "ضال" کئی معنی میں قرآن پاک میں وارد ہوا ہے۔ مثلاً گمراہ، ناواقف، غافل، تباہ ہونے والا، بھولنے والا، محبت میں خود رفتہ وغیرہ۔

چند آیات ملاحظہ ہوں۔ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ "اور نہ بہکے ہوؤں کا"۔ (پ1، فاتحہ:7)

اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى۔ "کہ کہیں ان میں ایک عورت بھولے تو اُس ایک

21...خزائن العرفان، والضحیٰ، تحت الآیۃ:6، ص972 22...روح المعانی، والضحیٰ، تحت الآیۃ:6

کو دوسری یاد دلادے"۔(پ3،بقرہ:282)

لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَی۔ "میرا رب نہ بہکے نہ بھولے"۔(پ16،طہٰ:52)

اَلَمْ یَجْعَلْ کَیْدَھُمْ فِیْ تَضْلِیْلٍ۔ "کیا ان کا داؤ تباہی میں نہ ڈالا"۔(پ30،فیل:2)

فَعَلْتُهَاۤ اِذًا وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّیْنَ۔ "میں نے وہ کام کیا جب کہ مجھے راہ کی خبر نہ تھی"۔

(پ19،شعراء:20)

مذکورہ اکثر معانی نبی کریم ﷺ کی شان کے ہرگز لائق نہیں۔ کئی مترجمین نے اس آیت کے ترجمے میں حضور ﷺ کو بھٹکا ہوا، بھٹکتا، گمراہ اور سیدھی راہ سے ناواقف کہہ کر گستاخانہ انداز اختیار کیا ہے۔ امت کا عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام اعلانِ نبوت سے قبل بھی اور بعد بھی صغیرہ وکبیرہ تمام گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ اور راہِ حق سے باخبر ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے رسولِ معظم ﷺ کی اعلانِ نبوت سے قبل کی زندگی کو آپ کی نبوت کی سچائی کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ ارشاد ہوا:

{فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ}

"(اے حبیب ﷺ! تم فرماؤ) تو میں اس سے پہلے تم میں اپنی ایک عمر گزار چکا ہوں، تو کیا تمہیں عقل نہیں"۔(پ11،یونس:16)

یعنی نبی کریم ﷺ کی ساری زندگی ہر قسم کی فکری و عملی گمراہی سے پاک و محفوظ رہی ہے۔ قرآن کریم میں ایک اور جگہ واضح طور پر اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔

{مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَ مَا غَوٰی} "تمہارے صاحب نہ بہکے، نہ بے راہ چلے"۔(پ27،نجم:2)

ان آیات سے بھی ثابت ہوا کہ حضور ﷺ کے لیے گمراہ، بھٹکتا، راہ بھولا ہوا، ایسے الفاظ کہنا سراسر گستاخی اور مذکورہ آیات کے منافی ہے۔ اب چند آیات ملاحظہ فرمائیں جن میں "ضلال" کا معنی محبت میں ڈوب جانا، خود رفتہ ہونا لیا جاتا ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی یوسف علیہ السلام سے زیادہ محبت دیکھ کر ان کے دوسرے بیٹوں نے کہا،

{اِنَّ اَبَانَا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنِ}(پ12،یوسف:8)

"بیشک ہمارے باپ صراحۃً ان کی محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں"۔

اسی سورت کی آیت ۳۰ میں زلیخا کے متعلق مصر کی عورتوں کا یہ قول بیان ہوا ہے،

{قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ}(پ12،یوسف:30)"بیشک اسکے دل میں یوسف کی محبت سما گئی ہے، ہم تو اسے صریح خود رفتہ پاتے ہیں"۔

جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: مجھے یوسف کی خوشبو آ رہی ہے تو اہلِ خانہ نے کہا،{ قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ}(پ13،یوسف:95)"بیٹے بولے، خدا کی قسم! آپ اپنی اُسی پرانی خود رفتگی میں ہیں"۔

"گھر والوں نے کہا، بخدا! آپ اپنی اس پرانی محبت میں مبتلا ہیں"۔(ضیاء القرآن)

اب مذکورہ آیت کے تحت مفسرین کرام کے اقوال ملاحظہ کیجیے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:"اس جگہ ضلال بمعنی محبت ہے۔ جس طرح آیت {اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ} میں ضلال کا معنی محبت ہے۔ یہاں معنی یہ ہو گا کہ بیشک آپ کو اپنی محبت میں وارفتہ پایا تو اپنی طرف ہدایت دی یعنی ان راستوں کی راہنمائی کی جن کی وجہ سے محبوب کی خدمت کا قرب حاصل ہو گا"۔ (23)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:"آپ ﷺ کو اپنی محبت کی راہ تلاش کرنے میں وارفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی۔ یہاں ضلال بمعنی محبت ہے جیسا کہ سورہ یوسف (مذکورہ بالا آیت) میں ضلال بمعنی محبت ہے"۔ (24)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں، "حضور ﷺ حقیقتاً محبت میں خود رفتہ تھے تو آپ کو شرابِ قرب و محبت کا جام پلایا اور اپنی معرفت کی راہ دی۔ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مقصود یہ ہے کہ آپ ﷺ کو ازل میں جو میری محبت حاصل تھی، آپ اس میں وارفتہ تھے پھر میں نے آپ پر احسان کیا کہ اپنی معرفت کی راہ دی"۔ (25)

علامہ ثناء اللہ مظہری رحمہ اللہ لکھتے ہیں، "بعض صوفیا فرماتے ہیں: اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

23... تفسیر کبیر، یوسف، تحت الایۃ:95

24... تفسیر قرطبی، یوسف، تحت الایۃ:95

25...روح المعانی، یوسف، تحت الایۃ:95

آپ کو اپنے عشق و محبت میں وارفتہ عاشق و محب پایا تو محبوب کے وصال کی طرف آپ کی راہنمائی کی یہاں تک کہ آپ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنیٰ کے مقام پر فائز ہوئے"۔ (26)

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ یہ فرمائیں، "میں سب سے پہلا مسلمان ہوں"۔ چونکہ آپ سب سے اول مخلوق ہیں لہٰذا آپ اولُ المسلمین ہوئے۔ "اس بات پر اجماع ہے کہ تمام انبیاء بعثت سے پہلے مومن ہوتے ہیں۔

حضور ﷺ یقینا بچپن ہی سے رب تعالیٰ کی زیادہ معرفت رکھتے تھے اسی لیے آپ وحی کے نزول سے قبل ہی غارِ حرا میں اپنے رب کی عبادت کیا کرتے تھے۔

مذکورہ آیت کی ایک اور تفسیر یہ ہے کہ

تمہیں علاماتِ نبوت، احکامِ شریعت اور اس کی تفصیلات سے نوازا جن کو جاننے کے لیے عقل ذریعہ نہیں ہو سکتی۔ ارشاد ہوا: { وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ }

"اور یونہی ہم نے تمہیں وحی بھیجی ایک جانفزا چیز (قرآن کریم) اپنے حکم سے، اس سے پہلے نہ تم کتاب جانتے تھے نہ احکامِ (شرع) کی تفصیل"۔ (پ25، شوریٰ:52)

اگر اس آیت کے ظاہری معنی مراد لیے جائیں تو لازم آئے گا کہ رسول معظم ﷺ نزولِ قرآن سے پہلے (معاذ اللہ) مومن نہ تھے حالانکہ ایسا کہنا تو درکنار سوچنا بھی گمراہی ہے، اور کسی مومن کے ذہن میں اس کا تصور بھی نہیں آسکتا۔ چنانچہ اس کی ایک تفسیر یہ ہے کہ ایمان سے مراد احکامِ شرع کی تفصیل ہے۔ (27)

اور دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس آیت میں درایت کی نفی کی گئی ہے۔ درایت کا مطلب ہے "قیاس اور اندازہ سے کسی چیز کا جاننا"۔ گویا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ نزولِ قرآن سے قبل آپ کتاب اور ایمان کو قیاس اور اندازے سے نہیں جانتے تھے بلکہ آپ اللہ تعالیٰ کے بتائے سے جانتے تھے۔ شیخ ابن عربی کا قول ہے، "حبیبِ کبریاء ﷺ کو جبریل کے وحی لانے سے پہلے ہی قرآن کا اجمالی علم حاصل تھا"۔ (28)

26... تفسیر مظہری، یوسف، تحت الآیۃ:95

27... تفسیر جلالین، شوری، تحت الآیۃ:52

28... روح المعانی، شوری، تحت الآیۃ:52

{ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ }(پ12،یوسف:3)

''ہم تمہیں سب سے اچھا بیان سناتے ہیں اس لیے کہ ہم نے تمہاری طرف اس قرآن کی وحی بھیجی، اگرچہ بیشک اس سے پہلے تمہیں خبر نہ تھی''۔(تفسیر الحسنات)

بقول صدرُ الافاضل، ''غیب کے اسرار آپ پر کھول دیے اور علومِ ماکانَ وَمَا یکون عطا کیے، اپنی ذات وصفات کی معرفت میں سب سے بلند مرتبہ عنایت کیا۔ مفسرین نے ایک معنی اس آیت کے یہ بھی بیان کیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ایسا وارفتہ پایا کہ اپنے نفس اور اپنے مراتب کی خبر بھی نہیں رکھتے تھے تو آپ کو آپ کی ذات وصفات اور مراتب ودرجات کی معرفت عطا فرمائی''۔ (29)

بعض مفسرین نے 'ضال' کے لغوی معنی کے لحاظ سے ایک نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ بعض اوقات قوم کے سردار کو خطاب کیا جاتا ہے مگر اصل میں مخاطب اس کی قوم ہوتی ہے۔ اس بناء پر مفہوم یہ ہے، ''ہم نے آپ کی قوم کو گمراہ پایا تو آپ ﷺ کے ذریعے سے ان کو ہدایت عطا کی''۔ (30)

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى:

''عائل'' کا معنی تنگدست بھی ہے اور عیال دار بھی۔ حضور ﷺ کی تمام امت آپ کی عیال ہے۔ اب مفہوم یہ ہوگا، ''اے حبیب ﷺ! ہم نے تمہیں تنگدست وعیالدار پایا تو غنی کر دیا''۔ آقا ومولیٰ ﷺ کو غناءِ قلبی کا وہ اعلیٰ مقام عطا ہوا کہ آپ کا ارشاد ہے، اگر میں چاہوں تو یہ پہاڑ سونے کے بن کر میرے ساتھ چلنا شروع کر دیں۔

اکثر مفسرین کا قول یہی ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کے دل کو غنی کر دیا گیا۔ حدیث پاک میں ارشاد ہے، زیادہ مال واسباب والا دولتمند نہیں ہوتا بلکہ دولتمند وہ ہوتا ہے جس کا نفس غنی ہو۔ (31)

غنائے ظاہری اس طرح عطا ہوا کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے تجارت ومعاملات میں آپ کی دیانتداری اور سچائی سے متاثر ہو کر آپ سے نکاح کر لیا اور دل وجان کے ساتھ آپ کو اپنے مال کا مالک

29...خزائن العرفان، والضحیٰ، تحت الآیۃ:8، ص973

30...تفسیر کبیر، والضحیٰ، تحت الآیۃ:8

31...مسلم، کتاب الزکاۃ، حدیث:1051۔

ومختار بنادیا۔ ان کے وصال کے بعد سیدنا ابو بکر صدیق، سیدنا عمر، سیدنا عثمان اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اپنا اپنا مال آپ کی رضامندی پر خرچ کیا۔ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے،

{يَاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ}

"اے غیب کی خبریں بتانے والے (نبی)! اللہ تمہیں کافی ہے اور یہ جتنے مسلمان تمہارے پیرو ہوئے"۔ (پ10، انفال:64،)

سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو دادا، چچا، زوجہ مطہرہ، سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام کے اموال کے ذریعے غنی فرمایا گیا، بذاتِ خود مالدار کیوں نہیں بنایا گیا؟

جواب یہ ہے کہ:

(1) اگر نبی کریم ﷺ ظاہری طور پر مالدار ہوتے تو کفار اعتراض کرتے کہ لوگ مال کے لالچ میں آپ کا ساتھ دیتے ہیں لیکن یہاں معاملہ یہ ہے کہ صحابہ آپ پر اپنے جان و مال نثار کرتے ہیں اس لیے اس بات کا شبہ بھی ممکن نہیں۔

(2) حضور ﷺ کے پیروکار جان لیں کہ دین کی اشاعت و تبلیغ مال واسباب کی محتاج نہیں ہوتی۔ اخلاص کے ساتھ بغیر اسباب کے بھی جو کلمہ حق بلند کرنے کی کوشش کرے گا، فلاحِ دارین پائے گا۔

(3) آپ کی امت اس حقیقت کو سمجھ لے کہ مال کا ہونا یا نہ ہونا، عزت و ذلت کا باعث نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو مال حرص و ہوس کے ذریعے حاصل کیا جائے وہ ذلت کا سبب بن جاتا ہے اور جو مال غنائے قلب کے ساتھ نصیب ہو، وہ عزت و عظمت میں اضافے کا ذریعہ بنتا ہے۔

(4) آقا و مولیٰ ﷺ کو مسکینی کی زندگی پسند تھی۔ آپ یہ دعا کرتے،

اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مِسْكِيْناً وَ اَمِتْنِيْ مِسْكِيْناً وَ احْشُرْنِيْ فِيْ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنِ۔

"اے اللہ! مجھے مسکین زندہ رکھ، اور مجھے مسکین ہی وفات دے، اور قیامت میں مساکین کے ساتھ میرا حشر فرما"۔[32]

کیونکہ دولتمند عموماً مغرور و متکبر اور خود پسند ہوتے ہیں جبکہ مسکین ہونے میں عاجزی و تواضع،

32...ابن ماجہ، کتاب الزھد، حدیث:4126

توکل وقناعت اور شانِ عبدیت پائی جاتی ہے نیز رب تعالیٰ سے مناجات میں ایک خاص لذت نصیب ہوتی ہے۔

فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ:

رب تعالیٰ نے سابقہ آیات میں تین انعامات کا ذکر فرمایا، اب تین احکام بیان کیے جارہے ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں یتیم پایا تو ٹھکانا دیا اس لیے اے حبیب ﷺ! تم بھی یتیم پر دباؤ نہ ڈالنا بلکہ اس پر مہربانی کرنا۔

دوسری بات یہ کہ تمہیں تنگدست پایا تو غنی کر دیا اس لیے اے حبیب ﷺ! جب تم سے کوئی کچھ مانگے تو اسے جھڑکنا نہیں۔

تیسری بات یہ کہ تمہیں اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو تمہیں اپنی طرف راہ دی، اپنی معرفت عطا کی، اور تمہیں وحی کی نعمت سے نوازا۔ اس لیے اے حبیب ﷺ! نبوت وشریعت کی صورت میں تمہیں جو نعمت ملی ہے اس کا بھی چرچا کرو اور جو پیغامِ حق، قرآن کریم کی صورت میں عطا ہوا، لوگوں کو اس کی بھی تعلیم دو۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ خطاب اگرچہ حضورِ اکرم نورِ مجسم ﷺ کو ہے مگر مخاطب آپ کی امت ہے۔ اہلِ جاہلیت کا طریقہ تھا کہ یتیموں کو دباتے اور ان پر زیادتی کرتے تھے۔ رحمتِ عالم ﷺ نے ہمیشہ یتیموں کے ساتھ اچھا سلوک کیا اور اپنے اُمتیوں کو بھی یتیموں سے اچھا سلوک کرنے کی تعلیم و تلقین فرمائی۔

حضورِ انور ﷺ نے فرمایا: مسلمانوں کے گھروں میں وہ بہت اچھا گھر ہے جس میں یتیم کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہے۔ اور وہ بہت بُرا گھر ہے جس میں یتیم کے ساتھ بُرا برتاؤ کیا جاتا ہے۔[33]

آپ کا ارشاد ہے، میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں یوں ساتھ ہوں گے۔ پھر آپ نے اپنی درمیانی اور شہادت کی انگلی کی طرف اشارہ فرمایا۔[34]

امام رازی رحمہ اللہ نے حضور ﷺ کے یتیم ہونے کی کئی حکمتیں تحریر کی ہیں:

33... معجم کبیر، حدیث: 13434۔ 34... بخاری، کتاب الادب، حدیث: 6005۔

آقا کریم ﷺ اپنی یتیمی کا خیال کرتے ہوئے یتیموں کے حقوق کا لحاظ رکھیں اور ان کی بھلائی کے لیے کوشش کریں۔ اور پھر سنتِ رسول ﷺ کی پیروی میں مسلمان بھی یتیموں کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔رسولِ معظم رحمتِ عالم ﷺ کے امتی یتیموں کا اس لیے احترام کریں کہ ان کے آقا و مولیٰ ﷺ بھی یتیم تھے۔

جس کے والدین زندہ ہوں، اُس کا اعتماد ان پر ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کے والدین کو اس لیے اٹھالیا تاکہ آپ کا اعتماد صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر رہے۔

والدین اپنی اولاد کی اچھی تربیت کرتے ہیں۔ حضور ﷺ کو اس لیے یتیم بنایا تاکہ ہر کوئی جان لے کہ آپ کی ہر فضیلت و خوبی اور کمال اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔

عموماً یتیم کی اچھی تربیت نہ ہونے کی وجہ سے لوگ اس میں زیادہ عیب پاتے ہیں۔رب تعالیٰ نے آپ کو یتیم بنا کر بے عیب بنادیا تاکہ لوگ جب کوئی عیب نہ پائیں تو آپ کے اعلانِ نبوت کرنے پر بھی کوئی طعن نہ کرسکیں۔ گویا آپ ﷺ کا یتیم ہونا بھی آپ کی عظمت کی دلیل بن گیا۔

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ:

سائل کے دو معنی ہیں۔مانگنے والا اور پوچھنے والا۔ یہاں دونوں مفہوم مراد ہیں۔

گویا ارشاد ہوا: اگر کوئی تم سے دنیاوی مال و اسباب مانگے تو اس کو بھی نہ جھڑکو۔ یعنی کچھ دے دو یا حسنِ اخلاق اور نرمی کے ساتھ عذر کرکے واپس کردو۔ اور اگر کوئی دین سے متعلق سوال پوچھنے آئے تو اسے بھی خوش اخلاقی سے جواب دو۔

دراصل یہ تمام تعلیم امت کی راہنمائی کے لیے بیان ہوئی ہے۔ اگر پوچھے گئے مسئلہ کی تحقیق نہ ہو تو اساتذہ و علماء کو چاہیے کہ وہ سائل سے نرمی کے ساتھ معذرت کرلیں یا مسئلہ کا مطالعہ کرکے بعد میں بتانے کا کہہ دیں۔

احادیثِ مقدسہ گواہ ہیں کہ بارگاہِ نبوی میں جو بھی سائل آیا، آقا و مولیٰ ﷺ نے اُس کا دامنِ مراد بھر دیا۔ حضرت ربیعہ رضی اللہ عنہ نے جنت مانگی، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے حافظہ مانگا، کسی نے بارش کا سوال کیا، کسی نے چاند کے دو ٹکڑے کرنے کا مطالبہ کیا، کسی نے درخت کو بلانے کی خواہش ظاہر کی، کسی نے ڈیڑھ ہزار صحابہ کے لیے وضو کے پانی کا سوال کیا، رحمتِ عالم ﷺ نے ہر کسی کو اُس کی طلب

کے مطابق عطا فرمایا۔

آقا و مولیٰ ﷺ کسی سائل کو کیوں جھڑکتے جبکہ آپ کے رب نے آپ کو غنی فرما دیا، اس لیے آپ کا خزانہ کبھی خالی نہیں ہو سکتا۔ سرکارِ دوعالم ﷺ کا ارشاد ہے: {اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٍ" وَاللہُ یُعْطِیْ} "بیشک اللہ عطا فرماتا ہے اور میں اُس کی نعمتیں تقسیم کرتا ہوں"۔ (35)

نبی کریم ﷺ کے جود و کرم کے متعلق حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے، حضور ﷺ نے کبھی کسی سائل کے جواب میں "لَا" (نہیں) نہ فرمایا۔ (36)

مَا قَالَ لَا قَطُّ اِلَّا فِیْ تَشَهُّدِہٖ   لَوْ لَا التَّشَهُّدُ کَانَتْ لَاؤُہٗ نَعَمْ

یعنی "حضور ﷺ نے "لَا" کبھی نہیں فرمایا سوائے تشہد کے، اگر کلمۂ شہادت نہ ہوتا تو حضور ﷺ کا "نہیں" بھی ہاں ہوتا"۔

ایک مرتبہ بحرین سے نوے ہزار درہم آئے۔ آپ ﷺ نے وہ سب تقسیم فرما دیے۔ جب ایک درہم بھی باقی نہ رہا تو ایک سائل آ گیا۔ آپ نے فرمایا: سارا مال تقسیم ہو چکا، اب تم بازار سے اپنی ضرورت کی چیزیں خرید کر میرے نام لکھوا دو، ان کی قیمت میں ادا کر دوں گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! آپ قرض کا بوجھ کیوں اپنے ذمے لیتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے آپ کو استطاعت سے زیادہ کا مکلف تو نہیں بنایا۔

حضور ﷺ کو یہ بات پسند نہ آئی۔ ایک انصاری نے عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! آپ خرچ کرتے جائیے اور مالکِ عرش سے کمی کا اندیشہ نہ فرمائیے۔ یہ سن کر آپ مسکرا دیے اور فرمایا، مجھے میرے رب نے یہی حکم دیا ہے۔ (ترمذی)

اس آیت میں سائل سے مراد پیشہ ور بھکاری نہیں کیونکہ بھیک مانگنے کو پیشہ بنا لینا حرام ہے اور انہیں بھیک دینا گویا حرام کام پر ان کی اعانت ہے جو کہ ناجائز ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے، جو شخص لوگوں سے ہمیشہ مانگتا رہتا ہے وہ قیامت کے دن ایسے چہرے کے ساتھ آئے گا کہ اس پر گوشت کی ایک بوٹی بھی نہ ہوگی۔ (37)

35...بخاری، کتاب العلم، حدیث: 71

36...مسلم، کتاب الفضائل، حدیث: 2311

37...کنز العمال، کتاب الزکاۃ، حدیث: 16739۔

ایک اور موقع پر فرمایا، جس نے سوال کیا اور اس کے پاس اس قدر چیزیں تھیں جو اُسے مانگنے سے بے نیاز کر سکتی تھیں، وہ صرف آگ کو زیادہ کرتا ہے۔ پوچھا گیا، اس کے پاس کتنی مقدار ہو جس کے ہوتے ہوئے اُسے سوال جائز نہیں؟ فرمایا، اُس کے پاس صبح و شام کا کھانا ہو یا ایک دن اور ایک رات کا کھانا ہو۔ [38]

وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ:

"اور اپنے رب کی نعمت کا خوب چرچا کرو"۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر جو فضل و کرم فرمائے، اس کا دوسروں سے ذکر کرنا رب تعالیٰ کا شکر ادا کرنا ہے۔

امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر میں فرمایا، جب تمہیں کوئی بھلائی حاصل ہو تو اپنے مسلمان بھائیوں سے اس کا ذکر کیا کرو۔ [39]

اسی بناء پر رب تعالیٰ کی سب سے عظیم نعمت یعنی رسول کریم ﷺ کی دنیا میں تشریف آوری کا شکر ادا کرتے ہوئے تمام دنیا کے مسلمان عید میلاد النبی ﷺ مناتے ہیں اور محبوبِ خدا ﷺ کے ذکر کی محافل سجاتے ہیں۔ رحمتِ عالم ﷺ وہ عظیم نعمت ہیں جن کے ملنے پر رب تعالیٰ نے خوشیاں منانے کا حکم بھی دیا ہے۔ ارشاد ہوا:

{قُلۡ بِفَضۡلِ اللّٰهِ وَبِرَحۡمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلۡيَفۡرَحُوۡا ؕ هُوَ خَيۡرٌ مِّمَّا يَجۡمَعُوۡنَ}

"(اے حبیب!) تم فرماؤ (یہ) اللہ ہی کے فضل اور اسی کی رحمت (سے ہے) اور اسی پر چاہیے کہ خوشی کریں، وہ (خوشی منانا) انکے سب دھن دولت سے بہتر ہے"۔ (پ11، یونس:58)

اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت سے مراد حضور ﷺ ہیں، سورۃ الاحزاب آیت ۴۷ میں آپ کو "فضل" اور سورۃ الانبیاء آیت ۱۰۷ میں "رحمت" فرمایا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا، { وَ ذَكِّرۡهُمۡ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ}"اور انہیں اللہ کے دن یاد دلا"۔ (پ13، ابراہیم:5)

امام المفسرین سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک ایامُ اللہ سے مراد وہ دن ہیں جن میں رب تعالیٰ کی کسی نعمت کا نزول ہوا ہو۔

38...ابوداود، کتاب الزکاۃ، حدیث:1629

39... تفسیر ابن حاتم، والضحیٰ، تحت الایۃ:11

"ان ایام میں سب سے بڑی نعمت کے دن سیدِ عالم ﷺ کی ولادت و معراج کے دن ہیں، ان کی یاد قائم کرنا بھی اس آیت کے حکم میں داخل ہے"۔ (40)

پس ثابت ہوا کہ رسول کریم ﷺ کے میلاد کی خوشی منانا لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے دن یاد دلانا بھی ہے، اس نعمتِ کبریٰ کے ملنے کی خوشی منانا بھی اور اس کی نعمتِ عظمیٰ کا چرچا کرنا بھی۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آقا و مولیٰ ﷺ ہر پیر کے دن روزہ رکھا کرتے تھے۔ آپ سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

ذَاکَ یَوْمٌ فِیْهِ وُلِدْتُّ وَفِیْهِ اُنْزِلَ۔ "اس دن میری ولادت ہوئی اور اسی دن مجھ پر وحی نازل ہوئی"۔ (41)

محدثین فرماتے ہیں کہ آپ نے ہر پیر کے دن روزہ رکھ کر اپنا میلاد منایا اور اپنے میلاد کے دن کی عظمت کو ظاہر کیا اور عبادت کے ذریعہ رب کریم کا شکر ادا کیا۔

رسولِ کریم ﷺ نے متعدد بار خود تحدیثِ نعمت کے طور پر اپنے میلاد کا بھی ذکر فرمایا ہے اور رب تعالیٰ کی دیگر کئی نعمتوں کو بھی بیان کیا ہے۔ چند احادیث ملاحظہ ہوں۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ "میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک خاتم النبیین (آخری نبی) لکھا ہوا تھا جبکہ آدم علیہ السلام اپنے خمیر میں گندھے ہوئے تھے۔ میں تمہیں اپنے معاملے کی ابتدا بتاتا ہوں کہ میں ابراھیم علیہ السلام کی دعا، عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت اور اپنی والدہ کا وہ نظارہ ہوں جو انہوں نے میری ولادت کے وقت دیکھا کہ ان سے ایسا نور ظاہر ہوا جس سے ملک شام کے محلات روشن ہو گئے"۔ (42)

سیدِ عالم نورِ مجسم ﷺ کے مبارک زمانہ کی ایک اور محفلِ میلاد جو مسجدِ نبوی میں منعقد ہوئی اس میں آقا و مولیٰ ﷺ نے منبر شریف پر جلوہ افروز ہو کر اپنا ذکرِ ولادت اور اپنے فضائل بیان فرمائے۔ (43)

مشکوٰۃ کے اسی باب میں ترمذی اور دارمی کے حوالے سے حدیث پاک موجود ہے کہ صحابہ کرام بعض انبیاء کرام کے فضائل کا ذکر کر رہے تھے کہ اس محفل میں آقا و مولیٰ ﷺ تشریف لے آئے اور

40...خزائن العرفان، والضحیٰ، تحت الایۃ: 11، ص974

41...مسلم، کتاب الصیام، حدیث: 1162

42...شرح السنۃ، کتاب الفضائل، حدیث: 352۔

43...ترمذی، کتاب المناقب، حدیث: 3616

آپ نے اپنے فضائل خود بیان فرمائے۔ ارشاد ہوا: اَلَا وَ اَنَا حَبِیْبُ اللّٰہِ۔ ”خبردار رہو! بیشک میں اللہ کا حبیب ہوں، میں فخریہ نہیں کہتا۔ قیامت کے دن حمد کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہوگا جس کے نیچے آدم علیہ السلام اور سب لوگ ہونگے، میں فخریہ نہیں کہتا۔ سب سے پہلے میں ہی شفاعت کروں گا، فخریہ نہیں کہتا۔ قیامت کے دن سب سے پہلے میری شفاعت قبول ہوگی، فخریہ نہیں کہتا۔ میں ہی سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا تو اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں داخل فرمائے گا، میرے ساتھ غریب مسلمان ہونگے، فخریہ نہیں کہتا۔ میں تمام اگلوں اور پچھلوں میں اللہ کے نزدیک زیادہ عزت والا ہوں، فخریہ نہیں کہتا۔ [44]

نورِ مجسم ﷺ کا ارشاد ہے، میں قیامت کے دن اولادِ آدم کا سردار ہوں گا، اور میں وہ ہوں جو سب سے پہلے قبر سے باہر آئے گا، اور میں وہ ہوں جو سب سے پہلے شفاعت کرے گا، اور میں وہ ہوں جس کی شفاعت سب سے پہلے قبول کی جائے گی۔ [45]

محفلِ میلاد میں رسول کریم ﷺ کی ولادتِ باسعادت اور آقا و مولیٰ ﷺ کے فضائل و خصائص کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ ایسی بیشمار احادیث ہیں جن میں صحابہ کرام نے حضور ﷺ کے میلاد کے وقت کے معجزات اور آپ کے فضائل و خصائل بیان کیے ہیں۔ اگر یہ باتیں ناجائز ہوتیں تو صحابہ انہیں کبھی روایت نہ فرماتے اور نہ ہی محدثین انہیں اپنی کتب میں نقل کرتے۔ بعض محدثین نے ایسی روایات اپنی کتب میں جمع فرمانے کا خاص اہتمام کیا۔ [46]

امام ابن جوزی، امام سخاوی، امام ابن کثیر، امام سیوطی اور محدث علی قاری رحمہم اللہ نے میلادُ النبی ﷺ کے عنوان پر باقاعدہ کتابیں تحریر کیں جبکہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے تو جامع ترمذی میں ایک باب کا عنوان ہی یہ لکھا، باب مَا جَاءَ فِیْ مِیْلَادِ النَّبِی ﷺ۔

آقا و مولیٰ ﷺ کا ارشاد ہے، جس نے کم نعمت کا شکر ادا نہیں کیا اُس نے زیادہ نعمت کا بھی شکر ادا نہیں کیا۔ جس نے لوگوں کا شکر ادا نہیں کیا اُس نے اللہ تعالیٰ کا بھی شکر ادا نہیں کیا۔ اللہ کی نعمت کو یاد

44...ترمذی، کتاب المناقب، حدیث:3616

45...مسلم، کتاب الفضائل، حدیث:2278

46...مواہب اللدنیہ، ص348، خصائص الکبری، ص177

کرنا شکر ہے اور یاد نہ کرنا، ناشکری ہے۔ جماعت اللہ کی رحمت ہے اور اس سے علیحدہ ہونا عذاب ہے۔[47]

رسولِ معظم ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے تمہارے ساتھ کوئی بھلائی کی، اسے اس کا اچھا بدلہ دو۔ اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو لوگوں کے سامنے اس کی تعریف کرو۔ جس نے اس کی بھلائی کا لوگوں کے سامنے ذکر کیا، اس نے اس کا شکر ادا کر دیا۔[48]

ان احادیث کو روایت کر کے قاضی ثناء اللہ مظہری رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "یہ احادیث تقاضا کرتی ہیں کہ اپنے مشائخ اور اساتذہ کا بھی شکریہ ادا کیا جائے اور ان کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا جائے"۔[49]

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: استاد کا درجہ والدین سے زیادہ ہے کیونکہ والدین سے جسمانی زندگی وابستہ ہے اور استاد روحانی حیات کا سبب ہے۔

ہر نعمت کا شکر ادا کرنا واجب ہے۔ شکر ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ نعمت کو اس نعمت عطا کرنے والے کی رضا میں صَرف کیا جائے۔

پس مال کی نعمت کا شکریہ ہے کہ اسے راہِ خدا میں اخلاص کے ساتھ خرچ کیا جائے، اور جسمانی صحت کی نعمت کا شکریہ ہے کہ فرائض وواجبات ادا کیے جائیں اور گناہوں سے بچا جائے، اور علم و معرفت کی نعمت کا شکریہ ہے کہ دوسروں کو علم سکھایا جائے اور ان کی راہِ حق کی طرف راہنمائی کی جائے۔[50]

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول کریم ﷺ جب سورۃ والضحیٰ ختم فرماتے تو اللہ اکبر کہتے، پھر سورۃ الناس تک ہر سورۃ کے بعد اللہ اکبر فرماتے۔... پس سورۃ الضحیٰ سے آخر قرآن تک ہر سورت کے آخر میں اللہ اکبر کہنا مستحب ہے۔[51]

47...مسند امام احمد بن حنبل، حدیث: 13254

48...مسند امام احمد بن حنبل، حدیث: 2145

49...تفسیر مظہری، والضحیٰ، تحت الآیۃ: 11

50...تفسیر مظہری، والضحیٰ، تحت الآیۃ: 11

51...تفسیر قرطبی، والضحیٰ، تحت الآیۃ: 11

تفسیر سورۃ الانشراح

سورۃ الانشراح یا اَلم نشرح مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں آٹھ آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَکَ صَدۡرَکَ ﴿۱﴾ وَ وَضَعۡنَا عَنۡکَ وِزۡرَکَ ﴿۲﴾ الَّذِیۡۤ اَنۡقَضَ ظَہۡرَکَ ﴿۳﴾ وَ رَفَعۡنَا لَکَ ذِکۡرَکَ ﴿۴﴾ فَاِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ یُسۡرًا ﴿۵﴾ اِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ یُسۡرًا ﴿۶﴾ فَاِذَا فَرَغۡتَ فَانۡصَبۡ ﴿۷﴾ وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارۡغَبۡ ﴿۸﴾

”اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا (ہے)“

”کیا ہم نے تمہارا سینہ کشادہ نہ کیا۔ اور تم پر سے تمہارا وہ بوجھ اتار لیا جس نے تمہاری پیٹھ توڑی تھی۔ اور ہم نے تمہارے لیے تمہارا ذکر بلند کر دیا۔ تو بیشک دشواری کے ساتھ آسانی ہے، بیشک دشواری کے ساتھ آسانی ہے۔ تو جب تم نماز سے فارغ ہو تو دعا میں محنت کرو اور اپنے رب ہی کی طرف رغبت کرو“۔

لفظی ترجمہ:

اَ	لَمۡ	نَشۡرَحۡ	لَ	کَ	صَدۡرَ	کَ
کیا	نہ	ہم نے کشادہ کیا	لیے	تمہارے	سینہ	تمہارا

وَ	وَضَعۡنَا	عَنۡ	کَ	وِزۡرَ	کَ
اور	اتار لیا ہم نے	سے	تم	بوجھ	تمہارا

الَّذِیۡۤ	اَنۡقَضَ	ظَہۡرَ	کَ	وَ	رَفَعۡنَا	لَکَ	ذِکۡرَ	کَ
وہ جس	نے توڑ دی	پیٹھ	تمہاری	اور	بلند کر دیا ہم نے	تمہارے لیے	ذکر	تمہارا

فَ	اِنَّ	مَعَ	الْعُسْرِ	يُسْرًا
پس	بیشک	ساتھ	دشواری (کے)	آسانی (ہے)

اِنَّ	مَعَ	الْعُسْرِ	يُسْرًا
بیشک	ساتھ	دشواری (کے)	آسانی (ہے)

فَ	اِذَا	فَرَغْتَ	فَ	انْصَبْ
پس	جب	تم فارغ ہو	تو	محنت کرو

وَ	اِلٰی	رَبِّ	كَ	فَ	ارْغَبْ
اور	(کی) طرف	رب	اپنے	پس	رغبت کرو

ربط و مناسبت:

سورۃ الضحیٰ سے اس سورت کا گہرا ربط و تعلق ہے۔ سورۃ الضحیٰ میں ان نعمتوں کو بیان فرمایا گیا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب رسول ﷺ کو عطا فرمائیں، اس سورت میں مزید نعمتوں کا تذکرہ ہے جن سے رب تعالیٰ نے اپنے حبیبِ لبیب ﷺ کو نوازا۔ گویا اس سورت کا مضمون، سابقہ سورت کے مضمون ہی کا تسلسل ہے اور دونوں سورتوں کا موضوع عظمت و شانِ مصطفی ﷺ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو دو طرح کے کمالات عطا فرمائے۔ ایک وہ جن کا تعلق مخلوق سے ہے اور دوسرے وہ جن کا تعلق خاص رسولِ معظم ﷺ کی ذاتِ اقدس سے ہے۔ پہلی قسم کے کمالات کو سورۃ الضحیٰ کی آیت ٦ تا ٨ میں بیان فرمایا گیا اور دوسری قسم کے کمالات کو اس سورت میں بیان فرمایا گیا یعنی شرحِ صدر، وضعِ وِزر اور رفعِ ذکر۔

گویا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ سورۃ الضحیٰ میں نبی کریم ﷺ کے ظاہری کمالات و انعامات بیان فرمائے گئے تھے جبکہ اس سورت میں آقا و مولیٰ ﷺ کے باطنی فضائل و انعامات بیان کیے گئے ہیں۔

بعض اہلِ تفسیر نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ: ''سورۃ الضحیٰ سے آخر قرآن کریم تک بیشتر سورتوں میں رسول اللہ ﷺ پر حق تعالیٰ کے خاص انعامات اور آپ کے مخصوص فضائل کا ذکر ہے اور چند سورتوں میں قیامت اور اس کے احوال کا۔ قرآن حکیم کا شروع خود قرآن کی عظمت اور ناقابلِ شک وشبہ ہونے سے کیا گیا اور ختمِ قرآن اُس ذات کی عظمت وشان پر کیا گیا جس پر قرآن نازل ہوا''۔

شانِ نزول:

مفسرین کرام فرماتے ہیں: ایک مرتبہ رسولِ کریم ﷺ نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی، یاربَ العالمین! تو نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا، موسیٰ علیہ السلام کو ہمکلامی کا شرف بخشا، داوٗد علیہ السلام کے لیے لوہے اور پہاڑوں کو مسخر فرمایا، سلیمان علیہ السلام کو جن واِنس اور ہوا پر حکومت عطا فرمائی، مولیٰ! مجھے کیا خاص امتیاز عطا فرمایا؟

اس کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی اور آپ ﷺ کے کمالات بیان فرمائے گئے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ سوال واقعۂ معراج سے پہلے ہوا ہوگا کیونکہ معراج کا سفر اور اس میں رب تعالیٰ نے جو نعمتیں اپنے حبیب ﷺ کو عطا فرمائیں وہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام میں صرف آپ ہی کا اعزاز ہیں۔[52] (تفسیر عزیزی)

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ:

''شرحِ صدر'' کا معنی ہے سینہ کھولنا، سینہ کشادہ کرنا، حوصلہ بلند کرنا یا سکون و اطمینان حاصل ہونا۔ امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے ''الم نشرح'' فرمایا، اگر یہ نون (صیغہ جمع متکلم) برائے تعظیم ہو تو یہ نعمت عطا فرمانے والے کی عظمت کی دلیل ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شرحِ صدر وہ عظیم نعمت ہے کہ اس کی بلندی تک عقل و دانش کی رسائی نہیں ہوسکتی۔[53] (تفسیر کبیر)

حضور ﷺ کے شرحِ صدر کی مکمل معرفت تو ناممکن ہے البتہ نائبینِ رسول نے اپنے آقا ﷺ کے علمِ لدُنی سے اکتسابِ فیض کرتے ہوئے کچھ اسرار و رموز بیان کیے ہیں۔ جن میں سے علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''شرحِ صدر سے مراد ہے، نفس کو قوتِ قدسیہ اور انوارِ الٰہیہ سے اس قدر وسعت و طاقت دینا

52... تفسیر عزیزی، الم نشرح

53... تفسیر کبیر، الم نشرح، تحت الآیۃ: 1

کہ وہ علم کے قافلوں کے لیے میدان، ملکات (عالمِ بالا) کے ستاروں کے لیے آسمان اور ہر قسم کی تجلیات کے لیے عرش بن جائے۔ جب کسی کی ایسی کیفیت ہو جائے تو اس کو ایک حالت دوسری حالت سے مشغول نہیں کر سکتی اور اس کے نزدیک مستقبل، حال اور ماضی سب یکساں ہو جاتے ہیں"۔

آپ مزید رقمطراز ہیں، اس آیت کا معنی یہ ہے کہ کیا ہم نے تمہارے سینے کو کشادہ نہیں کر دیا کہ عالم غیب اور عالم شہادت دونوں اس میں سما گئے ہیں اور یہ سینہ استفادہ وافادہ دونوں کا جامع ہو گیا ہے۔ جسمانی روابط تمہارے لیے عالمِ قُدس کے روحانی انوار کے حصول میں مخل نہیں ہو سکتے نیز مخلوق کی ضروریات میں تمہارا مصروف ہونا معرفتِ الٰہی میں استغراق سے رکاوٹ نہیں ہے۔[54]

قاضی ثناء اللہ مجددی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ہم نے تمہارے سینے کو تمہارے لیے کھول دیا یہاں تک کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے نور سے علوم و معارفِ دینیہ کے سما جانے کی صورت پیدا ہو گئی جس کو عقل والے عقل سے حاصل نہیں کر سکتے۔ نیز اس میں یہ صلاحیت بھی پیدا کر دی کہ بیک وقت رب تعالیٰ کی طرف متوجہ رہیں اور لوگوں کو دعوتِ حق دینے کا فریضہ بھی انجام دیتے رہیں"۔[55]

گویا شرحِ صدر کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیبِ مکرم ﷺ کے سینہ اقدس کو اس قدر وسعت و کشادگی عطا فرمائی کہ اس میں علوم و معارف کے سمندر سمو دیے اور اسے انوار و تجلیاتِ الٰہیہ کا ایسا مرکز و منبع بنا دیا کہ مخلوق کی طرف توجہ خالق و معبود کی طرف توجہ میں مخل نہیں ہوتی۔

آپ ایک طرف بارگاہِ الٰہی سے وحی والہام اور علم و عرفان کا خزانہ لے رہے ہیں اور دوسری طرف یہ خیرِ کثیر اپنی امت میں تقسیم بھی فرما رہے ہیں۔ اور ان امور میں مشغولیت کے باوجود غیب و شہادت کے دونوں جہاں آپ کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔ مولانا روم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ہر کرا باشد زسینہ فتح یاب
اوَ زِ ہر ذرہ بہ بیند آفتاب

"جس کے سینے کا دروازہ کھل جائے وہ ہر ذرہ میں آفتاب کا مشاہدہ کرتا ہے"۔

مقامِ غور ہے کہ جس کے شرحِ صدر کا اعلان خود اللہ تعالیٰ فرمائے وہ ہر ذرہ میں کس آفتابِ تجلیٔ الٰہیہ کا مشاہدہ کرتا ہوگا!! ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

54...روح المعانی، الم نشرح، تحت الآیۃ: 1

55... تفسیر مظہری، الم نشرح، تحت الآیۃ: 1

{وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ}

"اور اسی طرح ہم ابراہیم کو دکھاتے ہیں ساری بادشاہی آسمانوں اور زمین کی"(پ7،انعام:75)

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:"اس سے آسمانوں اور زمین کی تمام مخلوق مراد ہے"۔یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے زمین وآسمان کی تمام مخلوق دکھادی جس طرح رسول کریم ﷺ کو زمین وآسمان کی تمام مخلوق کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔

رب تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے، {اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا}

"بیشک ہم نے تمہیں بھیجا حاضر وناظر"۔(پ22،احزاب:45،پ26:،الفتح:8)

اس آیت کے تحت اکابر مفسرین کی تفاسیر ملاحظہ فرمائیں۔

"شاھداً کا معنی یہ ہے کہ رسولِ معظم نورِ مجسم ﷺ اپنی امت کے افعال کا مشاہدہ فرماتے ہیں"۔(56)

"جن کی طرف آپ کو رسول بناکر بھیجا آپ کو ان کے احوال کا مشاہدہ کرنے والا بنایا"۔(57)

"جن کی طرف آپ کو مبعوث کیا گیا آپ ان پر شاہد ہیں کیونکہ ان کے احوال ملاحظہ فرماتے اور ان کے اعمال کا مشاہدہ کرتے ہیں"۔(58)

رب تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے:{وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا}

"اور یہ رسول تمہارے نگہبان وگواہ"۔(پ2،بقرہ:143،)

اس آیت کی تفسیر میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:"کیونکہ آپ اپنے نورِ نبوت سے ہر دیندار کے درجے کو جانتے ہیں۔پس حضور ﷺ تمہارے گناہوں، تمہارے ایمان کے درجات، تمہارے نیک وبد اعمال اور تمہارے اخلاص ونفاق کو جانتے ہیں"۔(59)

رحمتِ عالم ﷺ کے اس خاص منصب پر درج ذیل احادیث بھی ملاحظہ فرمائیے۔

آقا ومولیٰ ﷺ نے فرمایا:جمعہ کے دن مجھ پر زیادہ درود پڑھا کرو کیونکہ اس دن فرشتے حاضر ہوتے

56...تفسیر کبیر، فتح، تحت الآیۃ:8

57...جلالین، الفتح، تحت الآیۃ:8

58...روح المعانی، الفتح، تحت الآیۃ:8

59...تفسیر عزیزی، بقرہ، تحت الآیۃ:143

ہیں۔ کوئی بندہ جہاں بھی درود پڑھتا ہے اس کی آواز مجھ تک پہنچ جاتی ہے۔ صحابہ نے عرض کی، کیا آپ کے وصال کے بعد بھی؟

فرمایا، ہاں میرے وصال کے بعد بھی کیونکہ بیشک اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء کے جسموں کو کھائے۔[60]

ایک روایت میں یہ ہے، "اللہ کا ہر نبی زندہ ہے اور رزق دیا جاتا ہے"۔[61]

حضورِ اکرم نورِ مجسم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے،

"جب کوئی مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ میری روح مجھ پر لوٹا دیتا ہے (یعنی میری روح کی توجہ سلام بھیجنے والے کی طرف ہو جاتی ہے) یہاں تک کہ میں اس کو اسکے سلام کا جواب دیتا ہوں"۔[62]

آقا و مولیٰ ﷺ کا فرمانِ عالیشان ہے، "اللہ تعالیٰ نے میرے لیے دنیا کو ظاہر فرمایا پس میں دنیا کو اور جو کچھ دنیا میں قیامت تک ہونے والا ہے، سب کچھ اس طرح دیکھ رہا ہوں جیسے میں اپنی ہتھیلی کو دیکھ رہا ہوں"۔[63]

ایک اور ارشادِ ذی شان ہے، "بیشک میں تمہارا پیش رو اور تم پر گواہ ہوں اور خدا کی قسم! میں اپنے حوضِ کوثر کو اس وقت بھی دیکھ رہا ہوں"۔[64]

مفسرین نے شرحِ صدر کی ایک اور تفسیر یہ بھی بیان کی ہے کہ اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جو معرفت و طاعتِ الٰہی کی طرف راغب کرتی ہیں۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی،

{فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ}(پ8، انعام:125)

"اور جسے اللہ راہ دکھانا چاہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے"۔

پھر فرمایا، جس سینے میں نور داخل ہو جائے وہ سینہ کشادہ ہو جاتا ہے۔ صحابہ نے عرض کی، اس کی

60...ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیھا، باب فضل الجمعۃ، حدیث:1085

61...ابن ماجہ، کتاب الجنائز، باب ذکر وفاتہ ﷺ

62...مسند امام احمد بن حنبل، حدیث:3647

63...معجم الکبیر، حدیث:13257

64...بخاری، کتاب الجنائز، حدیث:1344۔

علامت کیا ہے؟ فرمایا، دھوکے کی جگہ دنیا سے بے رغبت ہونا، آخرت کی طرف توجہ کرنا اور موت سے قبل اس کی تیاری کرنا۔[(65)]

شرحِ صدر کی یہ نعمت آقائے دو جہاں ﷺ کے وسیلے اور روحانی فیض سے اولیاء اور صالحین کو بھی عطا ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ رات دن ذکرِ الٰہی، اعمالِ صالحہ، مشاہدۂ تجلیاتِ ربانی، اکتسابِ فیوض وانوارِ مصطفوی ﷺ کے ساتھ ساتھ مخلوق کی ہدایت اور انہیں نفع پہنچانے کے کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں: جس طرح نبی کریم ﷺ کو باطنی شرحِ صدر عطا ہوا جسے اوپر بیان کیا گیا، اسی طرح ظاہری اور حسّی شرحِ صدر بھی ہوا جسے "شقِ صدر" کا معجزہ کہا جاتا ہے۔ پہلی بار شقِ صدر (سینہ اقدس چاک کیا جانا) بچپن کے ابتدائی دنوں میں ہوا، پھر نزولِ وحی کی ابتدا سے قبل، اور پھر شبِ معراج میں ہوا۔ شقِ صدر کی احادیث سورۃ العلق کی تفسیر میں بیان ہوں گی۔

اس شرحِ صدر کی کیفیت یہ تھی کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے سینہ پاک کو چاک کر کے قلبِ اقدس نکالا اور زریں طشت میں آبِ زمزم سے غسل دیا اور نورِ حکمت سے بھر کر قلبِ اطہر کو اس کی جگہ رکھ دیا۔[(66)]

شقِ صدر کے وقت حضرت جبریل علیہ السلام نے قلبِ اطہر دیکھ کر فرمایا، یہ مبارک دل ہر عیب سے پاک ہے۔ اس میں دو آنکھیں ہیں جو بہت زیادہ دیکھنے والی ہیں اور دو کان ہیں جو بہت زیادہ سننے والے ہیں۔[(67)]

اس آیت میں رب تعالیٰ نے {اَلَمْ نَشْرَحْ صَدْرَكَ} نہیں فرمایا بلکہ لَكَ یعنی "تمہارے لیے" بھی ارشاد فرمایا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے، {اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ} "مگر میری ہی عبادت کرو"۔ دوسری جگہ فرمایا:

{اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ}۔ "میری یاد کے لیے نماز ادا کرو"۔

گویا اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے، اے حبیب ﷺ! تمہاری عبادات وطاعات صرف میرے لیے

65...مستدرک للحاکم، کتاب الرقاق، حدیث: 7863

66...خزائن العرفان، الم نشرح، تحت الآیۃ: 1

67...فتح الباری، 13/ 410

ہیں۔جب تمہارا سب کچھ میرے لیے ہے تو میں نے جو کچھ کیا ہے وہ صرف تمہاری خاطر کیا ہے۔(68)

اس آیت مقدسہ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کلیم کی شان اور ہے اور حبیب کا مقام اور ہے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی شرحِ صدر کی نعمت عطا ہوئی لیکن ان کی درخواست پر۔ انہوں نے عرض کیا تھا،{رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ}

"اے میرے رب میرے لیے میرا سینہ کھول دے"۔(پ16،طہٰ:25)

جبکہ حبیبِ لبیب ﷺ کو بن مانگے یہ دولت عطا فرمائی گئی۔

پھر دونوں حضرات کے شرح صدر میں بھی زمین وآسمان کا فرق ہے۔ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے حضور ﷺ کے مقامِ محبوبیت کو قصیدہ معراجیہ میں یوں بیان فرمایا۔

تَبارَکَ اللہ شان تیری، تجھی کو زیبا ہے بے نیازی
کہیں تو وہ جوشِ لَنْ تَرَانِیْ، کہیں تقاضے وصال کے تھے

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ:

آیت ۲ اور آیت ۳ میں نبی کریم ﷺ پر دوسرے انعام وکمال کا ذکر کیا گیا ہے، اور وہ ہے وضعِ وِزر۔ وِزر کا لفظی معنی ہے "بوجھ"۔ اور "نقضِ ظہر" کے لفظی معنی کمر توڑ دینے یا جھکا دینے کے ہیں۔یعنی "وہ بھاری بوجھ جس نے آپ کی کمر جھکا دی تھی ہم نے اس بوجھ کو آپ پر سے اتار لیا"۔

اُس "بھاری بوجھ" سے متعلق مفسرین کرام نے کئی اقوال لکھے ہیں، ان میں سے دو اقوال پیشِ خدمت ہیں۔

اس بوجھ سے مراد وہ غم ہے جو آپ کو کفار کے ایمان نہ لانے سے ہوتا تھا۔رب تعالیٰ نے آپ کو لوگوں کو ڈر اور خوشخبری سنانے اور حق کی طرف بلانے کا حکم دیا اور لوگوں کی راہنمائی کے لیے کتابِ ہدایت، قرآن نازل فرما کر راہِ حق روشن فرمادی۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس بوجھ سے مراد امت کے گناہوں کا غم ہے جو حضورِ انور ﷺ کے ذہن مبارک پر بوجھ کی طرح تھا۔رب تعالیٰ نے { وَ لَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى } فرما کر محبوب کریم

68...تفسیر کبیر،الم نشرح، تحت الآیۃ:1

ﷺ کو شفاعت کا منصب عطا فرمایا اور آپ ﷺ کے اس غم کو دور فرمادیا۔ ارشاد ہوا:

{ عَسٰٓى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا } "قریب ہے کہ تمہیں تمہارا رب ایسی جگہ کھڑا کرے جہاں سب تمہاری حمد کریں"۔ (پ15، بنی اسرائیل:79)

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں، "حضور ﷺ کی بلند ہمت اور پیدائشی استعداد جن کمالات اور اعلیٰ مقامات پر پہنچنے کا تقاضا کرتی تھی، آپ کے قلبِ اطہر کو جسمانی ترکیب یا نفسانی تشویش کے باعث ان اعلیٰ مقامات پر فائز ہونا دشوار معلوم ہوتا تھا۔ جب رب تعالیٰ نے آپ کا سینہ اقدس کھول دیا اور حوصلہ وسیع فرمادیا تو وہ دشواریاں دور ہو گئیں اور تمام بوجھ ہلکا ہو گیا"۔ (69)

"جب اللہ تعالیٰ نے حضورِ انور ﷺ کے سینہ اقدس کو ایمان اور حکمت کے لیے کھول دیا اور نفس کے ناپسندیدہ حصے کو زائل کر دیا گیا تو شرعی احکام آپ کے لیے مرغوب و محبوب اور راحت و سکون کا باعث بن گئے"۔ (70)

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ:

اس آیت مقدسہ کے تین الفاظ دراصل تین اہم عنوانات ہیں۔

اول: ہم نے بلند کر دیا، دوم: تمہارے لیے، سوم: تمہارا ذکر۔

پہلی بات یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے حضور ﷺ کا ذکر بلند کرنا مخلوق کے ذمہ نہیں رکھا۔ کیونکہ مخلوق اپنی طاقت وقدرت کے لحاظ سے ایک حد تک ذکر بلند کر سکتی ہے اور مخلوق حادث وفانی ہے۔ یعنی جب سے اسے وجود ملا اور جب تک اس کا وجود باقی ہے، یہ ذکر بلند کر سکتی ہے۔ اس لیے رب تعالیٰ نے اپنے محبوب کے ذکر کی بلندی اپنے ذمہ کرم پہ رکھی تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ رب تعالیٰ کی صفات لامحدود ولامتناہی ہیں اور جب وہ اپنے محبوب کا ذکر بلند فرمائے گا تو اس ذکر کی بلندی بھی لامحدود ولامتناہی ہو گی۔ رب تعالیٰ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

مطلب یہ ہے کہ حضور کا ذکر بھی ہمیشہ سے بلند ہو رہا ہے اور ہمیشہ بلند ہوتا رہے گا۔ جب اللہ تعالیٰ کو زوال وفنا نہیں تو ذکرِ مصطفی ﷺ کی بلندی کو بھی زوال وفنا نہیں۔

69... تفسیر عزیزی، بنی اسرائیل، تحت الآیۃ:74

70... تفسیر مظہری، بنی اسرائیل، تحت الآیۃ:74

یہاں ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور کا ذکر کتنا بلند فرمایا، اس بلندی کی مقدار کیا ہے؟ سو دَرجے، ہزار، لاکھ، کروڑ درجے وغیرہ۔ رب تعالیٰ نے مقدار و حد بیان نہ فرمائی۔ عظمتِ مصطفیٰ کریم ﷺ کے حوالے سے اس طرح کا ابہام ہمیں قرآن کریم میں چند اور مقامات پر بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً ارشاد ہوا:

{تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ}

”یہ رسول ہیں کہ ہم نے ان میں ایک کو دوسرے پر افضل کیا، ان میں کسی سے اللہ نے کلام فرمایا، اور کوئی وہ ہے جسے سب پر درجوں بلند کیا“۔(پ3، بقرہ:253)

امت کا اجماع ہے کہ درجوں بلندی پانے والے ہمارے آقا و مولیٰ ﷺ ہیں۔ سوال پیدا ہوا کہ کتنے درجے بلند کیا؟ قرآن کریم نے صرف یہ بتایا کہ اُنہیں رسولوں پر درجوں بلندی عطا فرمائی مگر ان درجات کی مقدار بیان نہ فرمائی۔ ایسے ہی ارشاد ہوا:

{وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ}

”(اے حبیب!) تمہیں سکھا دیا جو کچھ تم نہ جانتے تھے“۔(پ4، نساء:113)

یہاں بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کچھ سکھا دیا؟ اللہ تعالیٰ نے تفصیل بیان نہ فرمائی۔ مختصر یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ سب کچھ سکھا دیا جو کچھ آپ نہیں جانتے تھے۔ اسی طرح واقعۂ معراج کے ذکر میں فرمایا، {فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى}

”اب وحی فرمائی اپنے بندے کو جو وحی فرمائی“۔(پ27، نجم:10)

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو کیا وحی فرمائی، اس کی تفصیل نہیں بتائی گئی۔ مفسرین فرماتے ہیں: یہ ابہام اور اخفاء، **تفخیمِ** شان اور عظمتِ مصطفیٰ کریم ﷺ کے اظہار کے لیے ہے۔ گویا رب تعالیٰ یہ بتانا چاہتا ہے کہ اے بندو! تمہاری عقلیں میرے محبوب کے حقیقی مقام کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور تمہارے اذہان ان کی عظمت کا کماحقہٗ ادراک نہیں کر سکتے۔ اس لیے تم یہ نہ پوچھو کہ ان کا ذکر کتنا بلند کیا، انہیں کتنے درجوں بلندی عطا فرمائی، انہیں کس قدر علوم عطا کیے، انہیں کیا کیا بات وحی فرمائی؟

تم صرف یہ سمجھ لو کہ مصطفیٰ کریم ﷺ کا ذکر بلند کرنے والا کون ہے!!! انہیں رسولوں پر درجوں بلندی دینے والا، انہیں علومِ غیبیہ عطا فرمانے والا اور ان پر وحی فرمانے والا رب ذوالجلال ہے۔ اب

جس قدر طاقت وقدرت تمہارے رب کی ہے اسی قدر وہ اپنے حبیب کو عظمتیں عطا فرماتا ہے۔ جب اس کی طاقت وقدرت لامحدود ہے تو جان لو کہ اس کے محبوب کا مقام اور عظمتیں بھی لامحدود ہیں۔

لَکَ "تمہاری خاطر":

اس سورت میں تین انعامات یعنی شرحِ صدر، وضعِ وِزر اور رفعِ ذکر کو بالترتیب آیت ۱، ۲ اور ۴ میں بیان فرمایا گیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ مذکورہ تینوں آیات میں لَکَ (تمہارے لیے) یا عَنْکَ (تم سے) مذکور ہے جو کہ حضورِ اکرم ﷺ کی عظمت و محبوبیت کی دلیل ہے۔ جیسا کہ حدیث قدسی میں ارشاد ہوا:

لو لاکَ لماَ خلقتُ الافلاکَ۔ "اے حبیب! اگر تمہیں پیدا نہ کرتا تو اس کائنات کو پیدا نہ کرتا"۔ (71)

یعنی تمام کائنات کی تخلیق کا سبب حضورِ اکرم رحمتِ عالم ﷺ کی ذاتِ پاک ہے۔ یہاں رب تعالیٰ کا ارشاد ہے، اے حبیب! ہم نے تمہارے ذکر کو محض تمہاری خاطر بلند فرمادیا ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے حبیب ﷺ کی رضا اور خوشی محبوب ہے۔

انبیاء کرام علیہمُ السلام جن باتوں کے لیے بارگاہِ الٰہی میں درخواست کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ بغیر مانگے اپنے حبیبِ مکرم ﷺ کو وہ نعمتیں عطا فرماتا ہے۔ امامُ الانبیاء سیدُ الرُّسل ﷺ کی عظمت و رفعتِ شان میں مجددِ اُمت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن حکیم سے بیس آیات جمع فرمائیں، جو پیشِ خدمت ہیں۔

(1) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی، {وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ} "اور مجھے رسوا نہ کرنا جس دن لوگ اُٹھائے جائیں گے"۔ (پ19، شعراء:87)

اور حبیبِ مکرم ﷺ کے لیے اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا:

{یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰهُ النَّبِیَّ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ} "جس دن اللہ رسوا نہ کرے گا، نبی اور اس کے ساتھ کے ایمان والوں کو"۔ (پ28، تحریم:8)

71...مدارج النبوۃ، ص327

حضور ﷺ کے صدقے میں صحابہ کرام بھی اس اس بشارتِ عظمیٰ سے مشرف ہوئے۔

(2) قرآن کریم نے حضرت خلیل علیہ السلام سے تمنائے وصال نقل کی،{ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ }"میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں"۔(پ23،صفت:99)

جبکہ حبیبِ مکرم ﷺ کو خود بلا کر عطائے دولت کی خبر دی۔{سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ}"پاکی ہے اسے جو اپنے بندے کو لے گیا"۔(پ15،بنی اسرائیل:1)

(3) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آرزوئے ہدایت نقل فرمائی،{ سَیَهْدِیْنِ }

"اب وہ مجھے راہ دے گا"۔(پ23،صفت:99)

لیکن حبیب ﷺ سے خود ارشاد فرمایا:{ وَ یَهْدِیَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا }

"اور تمہیں سیدھی راہ دکھادے"۔(پ26،فتح:2)

(4) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے فرمایا،{ هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ ضَیْفِ اِبْرٰهِیْمَ الْمُكْرَمِیْنَ }

"کیا تمہارے پاس ابراہیم کے معزز مہمانوں کی خبر آئی"۔(پ26،ذاریات:24)

یعنی فرشتے ان کے مہمان بنے۔

جبکہ حبیب ﷺ کے لیے فرمایا:{ وَ اَیَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا }

"اور ان فوجوں سے اس کی مدد کی جو تم نے نہ دیکھیں"۔(پ10،توبہ:40)

یعنی فرشتے ان کے سپاہی بنے۔

(5) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا چاہی۔ ارشاد ہوا:{وَعَجِلْتُ اِلَیْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى}"اے میرے رب! تیری طرف میں جلدی کر کے حاضر ہوا تاکہ تو راضی ہو"۔(پ16،طہٰ:84)

جبکہ حبیب ﷺ کے لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کی رضا چاہتا ہے۔ ارشاد ہوا: { وَ لَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى } "اور بے شک قریب ہے کہ تمہارا رب تمہیں اتنا دے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے"۔(پ30،والضحیٰ:5)

(6) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کے خوف سے مصر تشریف لے جانا بلفظ "فرار" نقل فرمایا۔{فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ}(پ19، شعراء:21) جبکہ حبیبِ مکرم ﷺ کا ہجرت فرمانا احسن عبارات سے

بیان فرمایا۔{ اَوْ يُخْرِجُوْكَ }(پ10،انفال:30)

(7)حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کوہِ طور پر کلام کیا اور اسے سب پر ظاہر فرما دیا۔{ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى }"اب کان لگا کر سن جو تجھے وحی ہوتی ہے"۔(پ16،طٰہٰ:13)

جبکہ حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے آسمانوں سے بھی اوپر کلام فرمایا اور کسی پر بھی ظاہر نہ فرمایا:{ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى }"اب وحی فرمائی اب بندے کو جو وحی فرمائی"۔(پ27،نجم:10)

(8)حضرت داؤد علیہ السلام سے فرمایا:{لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ}"خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ تجھے بہکا دے اللہ کی راہ سے"۔(پ23،ص26)

حبیبِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قسم کے ساتھ ارشاد فرمایا:{ وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى(۳)اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى }

"اور وہ کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کرتے، وہ تو نہیں مگر وحی جو انہیں کی جاتی ہے"۔(پ27،نجم:3-4)

(9)حضرت نوح علیہ السلام سے دعا نقل فرمائی،{ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ }"اے میرے رب! میری مدد فرما اس پر کہ انہوں نے مجھے جھٹلایا"۔(پ18،مومنون:26)

جبکہ آقائے دوجہاں شفیع عاصیاں صلی اللہ علیہ وسلم سے خود ارشاد ہوا:{ وَ يَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا }"اور اللہ تمہاری زبردست مدد فرمائے"۔(پ26،فتح:3)

(10)حضرت نوح و ابراہیم علیہما السلام سے نقل فرمایا کہ انہوں نے اپنی امتوں کے لیے دعاءِ مغفرت کی۔{ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيَّ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ }"اے ہمارے رب! مجھے بخش دے اور میرے والدین اور مسلمانوں کو"۔(پ13ابراہیم:41)

جبکہ حبیبِ لبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو خود حکم دیا کہ اپنی امت کے لیے مغفرت مانگو۔{وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ }"اپنے خاصوں اور عام مسلمان مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی معافی مانگو"۔(پ26،محمد:19)

(11)حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے ارشاد ہوا کہ انہوں نے پچھلوں میں اپنا ذکرِ جمیل باقی رکھنے کی دعا فرمائی،{وَ اجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ} "اور میری سچی ناموری رکھ پچھلوں

میں"۔(پ19، شعراء:84)

جبکہ حبیب ﷺ سے خود فرمایا:{وَ رَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ} "اور ہم نے تمہارے لیے تمہارا ذکر بلند کر دیا ہے"۔(پ30، الم نشرح:4)

اور اس سے بھی اعلیٰ وارفع مژدہ ملا کہ آپ کو مقامِ محمود پر فائز کیا جائے گا جہاں اولین وآخرین جمع ہونگے اور حضور ﷺ کی حمد وثنا کا شور ہر زبان پر ہوگا: {عَسٰۤى اَنۡ يَّبۡعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا} "قریب ہے کہ تمہیں تمہارا رب ایسی جگہ کھڑا کرے جہاں سب تمہاری حمد کریں "(پ15، بنی اسرائیل:79)

(12)حضرت خلیل علیہ السلام کے بارے میں فرمایا کہ انہوں نے لوط علیہ السلام کی قوم سے عذاب دور کرانے کی بڑی کوشش کی مگر حکم ہوا،{يٰۤاِبۡرٰهِيۡمُ اَعۡرِضۡ عَنۡ هٰذَا} "اے ابراہیم! اس خیال میں نہ پڑ"۔(پ11، ھود:76) "عرض کی، اس بستی میں لوط جو ہے۔ ارشاد ہوا: ہمیں خوب معلوم ہے جو وہاں ہے"۔(پ20، عنکبوت:32)

جبکہ حبیب ﷺ سے ارشاد ہوا:{وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمۡ وَ اَنۡتَ فِيۡهِمۡ}
"اور اللہ ان کافروں پر بھی عذاب نہ کرے گا جب تک اے رحمتِ عالم! تو ان میں تشریف فرما ہے"۔(پ10، انفال:33)

(13)حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نقل فرمایا:{رَبَّنَا وَ تَقَبَّلۡ دُعَآءِ} "الٰہی! میری دعا قبول فرما"۔(پ13، ابراہیم:40) جبکہ حبیب ﷺ اور ان کے غلاموں کو ارشاد ہوا:
{وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادۡعُوۡنِىۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَكُمۡ} "تمہارا رب فرماتا ہے، مجھ سے مانگو میں قبول کروں گا"۔(پ24، مومن:60)

(14)حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معراج دنیا کے درخت پر ہوئی۔
{مِنَ الشَّجَرَةِ اَنۡ يّٰمُوۡسٰۤى اِنِّىۡۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الۡعٰلَمِيۡنَ}(پ20، قصص:30)
جبکہ حبیب ﷺ کی معراج سدرۃ المنتہیٰ وفردوسِ اعلیٰ تک بیان فرمائی۔
{عِنۡدَ سِدۡرَةِ الۡمُنۡتَهٰى (۱۴) عِنۡدَهَا جَنَّةُ الۡمَاۡوٰى}(پ27، نجم:14-15)
(15)حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دل کی تنگی کی شکایت بیان فرمائی۔

{وَ یَضِیۡقُ صَدۡرِیۡ} ”اور میرا سینہ تنگی کرتا ہے“۔(پ19، شعراء:13)
جبکہ حبیبِ کبریاءﷺ کو خود شرحِ صدر کی دولت عطا فرمائی۔(پ30، الم نشرح:1)
(16) کلیم اللہ علیہ السلام پر حجابِ نار سے تجلی ہوئی۔{نُوۡدِیَ اَنۡۢ بُوۡرِکَ مَنۡ فِی النَّارِ} ”ندا کی گئی کہ برکت دیا گیا وہ جو اس آگ کی جلوہ گاہ میں ہے“۔(پ19، نمل:8)
جبکہ حبیبﷺ پر نور کے جلوے سے تجلی ہوئی اور وہ بھی غایتِ تفخیم و تعظیم کے لیے بہ الفاظِ ابہام بیان فرمائی گئی۔{اِذۡ یَغۡشَی السِّدۡرَۃَ مَا یَغۡشٰی}
”جب چھا گیا سدرہ پر جو کچھ چھا گیا“۔(پ27، نجم:16)
(17) موسیٰ علیہ السلام سے اپنے اور اپنے بھائی کے سوا سب سے برأت اور قطع تعلق نقل فرمایا۔انہوں نے عرض کی،{رَبِّ اِنِّیۡ لَاۤ اَمۡلِکُ اِلَّا نَفۡسِیۡ وَ اَخِیۡ فَافۡرُقۡ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِیۡنَ} ”الٰہی! میں اختیار نہیں رکھتا مگر اپنا اور اپنے بھائی کا، تو جدائی فرما ہم میں اور اس گناہگار قوم میں“۔(پ6، مائدہ:25)
جبکہ حبیبﷺ کے ظلِّ وجاہت میں کفار تک کو داخل فرمایا کہ ان پر بھی دنیا میں عام عذاب نہ آئے گا۔{وَ مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَہُمۡ وَ اَنۡتَ فِیۡہِمۡ}(پ10، انفال:33)
یہ شفاعتِ کبریٰ ہے کہ تمام اہلِ موقف، موافق و مخالف سب کو شامل۔
(18) ہارون و کلیم علیہما السلام کے متعلق فرمایا کہ انہوں نے فرعون کے پاس جاتے وقت اپنا خوف عرض کیا۔اس پر حکم ہوا،{قَالَ لَا تَخَافَاۤ اِنَّنِیۡ مَعَکُمَاۤ اَسۡمَعُ وَ اَرٰی}
”ڈرو نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں سنتا اور دیکھتا“۔(پ16، طٰہٰ:46)
جبکہ حبیبﷺ کو خود مژدۂ نگہبانی دیا،{وَ اللّٰہُ یَعۡصِمُکَ مِنَ النَّاسِ}
”اور اللہ لوگوں سے تمہاری حفاظت فرمائے گا“۔(پ6، مائدہ:67)
(19) حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق فرمایا کہ ان سے پرائی بات پر یوں سوال ہوگا،
{یٰعِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ ءَاَنۡتَ قُلۡتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوۡنِیۡ وَ اُمِّیَ اِلٰہَیۡنِ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ} ”اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! کیا تو نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا دو خدا بنا لو“۔(پ7، مائدہ:116)

تفسیر معالم میں ہے کہ اس سوال پر خوفِ الٰہی سے حضرت روح اللہ علیہ السلام کا بند بند کانپ اٹھے گا اور ہر بال کی جڑ سے خون کا فوارہ بہے گا۔ پھر وہ جواب عرض کریں گے جس کی حق تعالیٰ تصدیق فرماتا ہے۔[72]

جبکہ حبیب ﷺ نے جب غزوۂ تبوک کا ارادہ فرمایا اور منافقوں نے جھوٹے بہانے بنا کر نہ جانے کی اجازت لے لی۔ تو اس پر سوال تو حضور ﷺ سے بھی ہوا مگر یہاں جو شانِ لطف و محبت و کرم و عنایت ہے، قابلِ غور ہے۔ ارشاد فرمایا: {عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ}

"اللہ تمہیں معاف فرمائے، تم نے انہیں کیوں اجازت دے دی"۔ (پ10، توبہ: 43)

سبحان اللہ! سوال بعد میں ہے اور محبت کا کلمہ پہلے۔

(20) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا کہ انہوں نے اپنے امتیوں سے مدد طلب کی، {مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ}

"کون میرے مدد گار ہیں اللہ کی طرف"۔ (پ3، ال عمران: 52)

جبکہ حبیبِ مکرم رسولِ معظم ﷺ کی نسبت انبیاء و مرسلین کو حکمِ نصرت دیا گیا۔

ارشاد ہوا: {لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ}

"تم ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا"۔ (پ3، ال عمران: 81)[73]

(21) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے کلام کیا اور عرض کی، اے رب مجھے اپنا دیدار عطا فرما۔ ارشاد ہوا: {لَنْ تَرٰىنِیْ وَ لٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا} "تو مجھے ہر گز نہ دیکھ سکے گا۔ ہاں اس پہاڑ کی طرف دیکھ۔ یہ اگر اپنی جگہ پر ٹھہرا رہا تو عنقریب تو مجھے دیکھ لے گا۔ پھر جب اس کے رب نے پہاڑ پر اپنا نور چمکایا، اسے پاش پاش کر دیا اور موسیٰ گرا بیہوش"۔ (پ9، اعراف: 143)

اللہ تعالیٰ نے شبِ معراج اپنے حبیب ﷺ کو اپنے دیدار کی نعمت سے سرفراز فرمایا اور حضور ﷺ نے جی بھر کے اپنے رب کا دیدار کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے،

72... تفسیر معالم التنزیل، مائدہ، تحت الآیۃ: 116

73... تجلی الیقین بان سیدنا نبینا المرسلین

{مَا زَاغَ الۡبَصَرُ وَ مَا طَغٰی}(پ27، نجم:17)

"آنکھ نہ کسی طرف پھری نہ حد سے بڑھی"۔

(22)اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں دیگر انبیاء کرام کو ان کے ناموں سے پکارا ہے جیسے یٰۤاٰدَمُ، یٰنُوۡحُ، یٰۤا ِبۡرٰهِیۡمُ، یٰمُوۡسٰی، یٰعِیۡسٰی وغیرہ۔جبکہ حبیبﷺ کو القاب سے خطاب فرمایا ہے۔ یٰۤاَیُّهَاالرَّسُوۡلُ،یٰۤاَیُّهَاالنَّبِیُّ،یٰۤاَیُّهَاالۡمُزَّمِّلُ،یٰۤاَیُّهَاالۡمُدَّثِّرُ۔

ان دلائل وبراہین سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے محبوب رسولﷺ کی خاطر اور رضا محبوب ہے،اس لیے اس نے اپنے حبیب کا ذکر اُسی کے لیے بلند فرمایا ہے۔

رفعتِ ذکرِ مصطفیٰ:

حضرت ابوسعید خُدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آقا و مولیٰﷺ نے فرمایا:میں نے جبریل علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر پوچھی تو انہوں نے جواب دیا،اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،میں نے آپ کے ذکر کو اس طرح بلند کیا کہ جب میرا ذکر کیا جائے گا تو ساتھ ہی آپ کا بھی ذکر کیا جائے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس سے مراد اذان، اقامت، تشہد، اور جمعہ و عیدَین کے خطبوں میں، خطبۂ نکاح میں، ایامِ تشریق، یومِ عرفہ، رمی جمار کے وقت، صفاومروہ پر اور زمین کے مشارق ومغارب میں جب بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ساتھ ہی نبی کریم ﷺ کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔اگر کوئی بندہ اللہ کی عبادت کرے اور ہر بات میں اللہ تعالیٰ کی تصدیق کرے مگر یہ گواہی نہ دے کہ حضرت محمدﷺ اللہ کے رسول ہیں تو اسے اس کی عبادت کوئی فائدہ نہیں دے گی اور وہ کافر رہے گا۔[74]

"اس سے بڑھ کر ذکر کی بلندی کیا ہوگی کہ کلمۂ شہادت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کا نام اپنے نام کے ساتھ ملایا، حضورﷺ کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا، ملائکہ کے ساتھ آپ پر درود بھیجا، اور ایمان والوں کو درود پڑھنے کا حکم دیا، جب بھی حضورﷺ کو خطاب فرمایا معزز القاب سے خطاب فرمایا: جیسے یٰۤاَیُّهَاالۡمُدَّثِّرُ، یٰۤاَیُّهَاالۡمُزَّمِّلُ، یٰۤاَیُّهَاالنَّبِیُّ، یٰۤاَیُّهَاالرَّسُوۡلُ۔پہلی آسمانی کتابوں میں آپ کا ذکر

74...تفسیر مظہری، الم نشرح، تحت الایۃ:4

فرمایا، تمام انبیاء اور ان کی امتوں سے وعدہ لیا کہ وہ حضور پر ایمان لائیں"۔ (75)

یہ بھی رفعتِ ذکر ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے دلوں میں آپ ﷺ کی محبت رکھ دی ہے۔ آپ کے متبعین آپ کی نعت پڑھتے اور آپ کے فضائل بیان کرتے ہیں، اور آپ پر درود پڑھتے ہیں، اور آپ کی سنتوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ قُرّاء آپ کے الفاظ کے طریقۂ ادائیگی کی حفاظت کرتے ہیں، مفسرین آپ کی کتاب کی تفسیر بیان کرتے ہیں، محدثین اور واعظین آپ کی احادیث کی تبلیغ کرتے ہیں۔

علماء وسلاطین آپ کے روضۂ اقدس کی چوکھٹ پر درود وسلام عرض کرتے ہیں اور آپ کے روضہ کی خاک اپنے چہروں پر سجاتے ہیں، اور آپ کی شفاعت کی امید رکھتے ہیں، پس آپ کا فضل وشرف قیامت تک باقی رہے گا"۔ (76)

اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب رسول ﷺ کا ذکر سب سے پہلے عالمِ ارواح میں بلند فرمایا، جب انبیاء کرام سے آپ کے متعلق عہد لیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

{وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَاۤ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ} "اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے اُن کا عہد لیا، "جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں، پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول کہ تمہاری کتابوں کی تصدیق فرمائے، تو تم ضرور ضرور اُس پر ایمان لانا اور ضرور ضرور اُس کی مدد کرنا"۔

(پھر اللہ نے) فرمایا: کیوں تم نے اقرار کیا؟ اور اس پر میرا بھاری ذمہ لیا؟ سب نے عرض کی، ہم نے اقرار کیا۔ (پھر اللہ نے) فرمایا: تو ایک دوسرے پر گواہ ہو جاؤ اور میں آپ تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں"۔ (پ3، ال عمران:81)

اس کی تفسیر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کے بعد جس کسی کو نبوت عطا فرمائی، ان سے سیدُ الانبیاء محمد مصطفی ﷺ کی نسبت عہد لیا اور ان انبیاء نے اپنی قوموں

75...روح المعانی، الم نشرح، تحت الایۃ:4

76... تفسیر کبیر، الم نشرح، تحت الایۃ:4

سے عہد لیا کہ اگر ان کی حیات میں سیدِ عالم ﷺ مبعوث ہوں تو وہ آپ پر ایمان لائیں اور آپ کی نصرت کریں۔[77]

حضور ﷺ کے ذکر کو اس طرح بھی بلند فرمایا کہ اگلی آسمانی کتب میں آپ کا ذکر کیا گیا اسی لیے اہلِ کتاب آپ کے وسیلے سے کافروں پر فتح مانگا کرتے تھے۔

{وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا}(پ1،بقرہ:89)

نیز حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آپ کی بعثت کی دعا مانگی۔

{رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ}(پ1،بقرہ:129)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آپ کی تشریف آوری کی بشارت دی۔{وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ}"اور (میں) اُن رسول کی بشارت سناتا ہوں جو میرے بعد تشریف لائیں گے، اُن کا نام احمد ہو گا"۔(پ28،صف:6)

آپ کے ذکر کو رب تعالیٰ نے اس طرح بھی بلند فرمایا کہ شجر و حجر آپ پر سلام پڑھتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں آقا و مولیٰ ﷺ کے ساتھ مکہ کی ایک جانب گیا۔ جو پہاڑ یا درخت آپ کے سامنے آتا وہ عرض کرتا: **السلامُ علیک یا رسولَ اللہ**۔[78]

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کا ذکر اس طرح بھی بلند فرمایا کہ ہر روز ستر ہزار فرشتے صبح اور ستر ہزار فرشتے شام کو روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر درود و سلام کے نذرانے پیش کرتے ہیں۔[79]

رب تعالیٰ نے آپ کا ذکر اس طرح بھی بلند کیا کہ زمین والے ہی نہیں آسمان والے بھی بلکہ خالقِ کائنات عزوجل ہر لمحہ ہر لحظہ آپ ہی کا ذکر فرما رہا ہے۔ ارشاد ہوا:{اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓىِٕكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا}

"بیشک اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں اُس غیب بتانے والے (نبی) پر، اے ایمان

77...خزائن العرفان، ال عمران، تحت الآیۃ:81

78...ترمذی، باب جاء فی الثوب الاصفر، حدیث:2814

79...دارمی، باب ما اکرم اللہ تعالیٰ نبیہ، حدیث:94

والو! اُن پر درود اور خوب سلام بھیجو"۔(پ22،احزاب:56)

اس آیتِ مبارکہ میں درود و سلام بھیجنے کا حکم مطلق دیا گیا، اس لیے ممنوع مواقع کے علاوہ جس وقت اور جس جگہ درود و سلام پڑھا جائے، مذکورہ آیت کے حکم ہی کی تعمیل ہوگی خواہ بیٹھ کر پڑھا جائے یا کھڑے ہو کر۔ حق یہی ہے کہ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ بلند فرمائے، اس کا ذکر کوئی ہرگز کم نہیں کر سکتا۔ بقول اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ،

مٹ گئے مٹتے ہیں مٹ جائیں گے اعداء تیرے
نہ مٹا ہے نہ مٹے گا کبھی چرچا تیرا

رفعتِ ذکرِ مصطفی ﷺ کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ دنیا کے ہر ملک میں جہاں ایک بھی مسلمان ہے وہاں اذان و نماز میں آپ کا ذکر ہوتا ہے۔ نیز دنیا میں ہر لمحہ کسی نہ کسی جگہ آفتاب غروب ہو رہا ہے اور وہاں مغرب کی اذان میں "اشھدُ اَنَّ محمداً رسولُ اللّٰہ" کی صورت میں ذکرِ مصطفی ﷺ بلند ہو رہا ہے۔

یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ کائنات میں سب سے زیادہ جس کا ذکر بلند ہوتا ہے اور سب سے زیادہ جس کی تعریف ہوتی ہے وہ ہمارے آقا و مولیٰ ﷺ ہی کی ذات پاک ہے۔ ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی حمد و پاکی بیان کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ خود اپنے حبیب ﷺ کی حمد و تعریف بیان کرتا ہے۔{يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ}

یہ ذہن نشین رہے کہ تمام مخلوق اور ساری کائنات محدود ہے اس لیے یہ سب مل کر رب کی جتنی بھی حمد کریں گے وہ محدود ہوگی۔ مگر رب تعالیٰ اپنے حبیب کی جو تعریف بیان فرماتا ہے وہ لامحدود ہے۔ اور محدود کو لامحدود سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا رب تعالیٰ کے حضور کا ذاکر ہونے کی وجہ سے ذکرِ مصطفی ﷺ ہر ذکر سے بلند ہے۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ ایک وقت آئے گا جب کائنات میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرنے والے فنا ہو جائیں گے مگر ذکرِ مصطفی ﷺ کا سلسلہ اُس وقت بھی جاری رہے گا۔

قرآن مجید میں ہے کہ قیامت آئے گی اور تمام مخلوق پر موت کا قانون نافذ ہو جائے گا، تو رب تعالیٰ فرمائے گا،{لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ} "آج کس کی بادشاہی ہے؟"۔ کوئی جواب دینے والا نہ ہو گا۔

پھر خود ہی ارشاد فرمائے گا:

{لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ} ”ایک اللہ،سب پر غالب کی بادشاہی ہے“۔

اُس وقت رب تعالیٰ کی حمد و تعریف کرنے والا کوئی موجود نہیں مگر مصطفیٰ کریم ﷺ کی تعریف کرنے والا اللہ تعالیٰ موجود ہے اور وہ ”یُصَلُّوْنَ“ کے تحت اپنے حبیب پر درود بھیج رہا ہے۔

{صَلَّى اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَاٰلِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلٰوةً وَّسَلَامًا عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ}

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا:

ارشاد ہوا: {فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا}

”تو بیشک دشواری کے ساتھ آسانی ہے، بیشک دشواری کے ساتھ آسانی ہے“۔

کفار و مشرکین حضور کو فقر و تنگدستی کا طعنہ دیتے اور کہتے، ”اس وجہ سے ہم آپ کا دین قبول نہیں کر سکتے“۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دی کہ جو سختی آپ برداشت فرما رہے ہیں وہ عنقریب ختم ہو جائے گی، یہ پہلی آسانی ہے۔ اور آپ کو فقر کے بعد غناء حاصل ہو گا، یہ دوسری آسانی ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا ارشاد ہے، رسول معظم ﷺ نے فرمایا: ایک مشکل دو آسانیوں پر کبھی غالب نہیں آسکتی۔ پھر آپ نے انہی دو آیات کی تلاوت فرمائی۔(80)

مفسرین کرام فرماتے ہیں: ان آیات میں عُسر یعنی تنگی ایک ہی ہے اور یُسر یعنی آسانیاں دو ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اگر مشکل اور تنگی کسی سوراخ کے اندر بھی ہو گی تو آسانی اس کی تلاش میں اس سوراخ کے اندر پہنچ جائے گی کیونکہ ایک تنگی یا دشواری دو آسانیوں پر غالب نہیں ہو سکتی۔(81)

دنیا میں مسلمان کے لیے بھی مختلف قسم کی آزمائشیں ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ o الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ o}

”اور ضرور ہم تمہیں آزمائیں گے کچھ ڈر اور بھوک سے، اور کچھ مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی

80... مستدرک، تفسیر سورۃ الم نشرح، حدیث:3950

81... تفسیر کبیر، الم نشرح، تحت الآیۃ:5

سے۔اور خوشخبری سناؤاُن صبر والوں کو، کہ جب اُن پر کوئی مصیبت پڑے تو کہیں، ہم اللہ کے مال ہیں اور ہم کو اُسی کی طرف پھرنا"۔(پ2،بقرہ:155-156)

حدیث شریف میں ہے کہ مصیبت کے وقت {اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْن} پڑھنا رحمتِ الٰہی کا سبب ہوتا ہے۔ایک حدیث پاک میں یہ بھی ارشاد ہوا، ناگوار چیز پر صبر کرنے میں بہت زیادہ بھلائی ہے، اور صبر کے ساتھ مدد ہے، اور تکلیف کے ساتھ راحت ہے اور مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔(82)

حضور ﷺ کا یہ بھی فرمان ہے، اللہ تعالیٰ کسی بندے کو اعلیٰ مقام عطا فرمانا چاہتا ہے جسے وہ نیک اعمال کے ذریعے حاصل نہیں کر سکتا تو اللہ تعالیٰ اُسے جان، مال یا اولاد کی پریشانیوں میں مبتلا کر دیتا ہے اور اُس بندے کو صبر بھی عطا فرماتا ہے یہاں تک کہ وہ بندہ اُس اعلیٰ مقام تک پہنچ جاتا ہے۔(83)

قانونِ الٰہی یہی ہے کہ جو شخص مصیبت پر صبر کرے، اور سچے دل سے اللہ تعالیٰ سے لَو لگائے اور اس کے فضل و کرم کو ایمان و یقین کے ساتھ طلب کرے، اللہ تعالیٰ ضرور اسے آسانی عطا فرمائے گا۔ان آیاتِ مبارکہ میں یہی بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مشکل کے ساتھ دو آسانیاں رکھی ہیں خواہ ایک آسانی دنیا میں ملے اور دوسری آخرت میں، یا دونوں آسانیاں دنیا ہی میں مل جائیں۔

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ:

ارشاد ہوا:{فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ۔ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ} یعنی "تو جب تم نماز سے فارغ ہو تو دعا میں محنت کرو اور اپنے رب ہی کی طرف رغبت کرو"۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ، ضحاک، مقاتل، کلبی رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ جب تم فرض نماز سے فارغ ہو جاؤ تو اپنے رب سے دعا مانگنے میں خوب محنت کرو۔(84)

اسی تفسیر کو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی رحمہ اللہ نے ترجمہ میں اختیار کیا ہے۔

چونکہ آیت کریمہ میں مطلق ارشاد ہے کہ "جب تم فارغ ہو تو محنت کرو"۔اس بناء پر مفسرین کرام فرماتے ہیں: جب تم ایک عبادت سے فارغ ہو جاؤ تو دوسری عبادت میں محنت کرو تاکہ تمہارا کوئی

82... معجم الکبیر، حدیث:12411

83...مسند امام احمد بن حنبل، حدیث:5478

84... تفسیر کبیر، الم نشرح، تحت الایۃ:7

وقت بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت سے خالی نہ گزرے۔

آقا و مولیٰ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے، اہلِ جنت کسی بات پر افسوس نہیں کریں گے مگر اس لمحہ پر حسرت وافسوس کریں گے جو انہوں نے دنیا میں یادِ الٰہی کے بغیر گزارا ہو گا۔(تفسیر مظہری)

فکر و عمل کی دنیا میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد سنہرے حروف سے لکھے جانے کے لائق ہے، فرمایا: ”مجھے یہ بات سخت ناپسند ہے کہ میں تمہیں فارغ بیٹھے ہوئے دیکھوں کہ نہ تم دنیا کا کوئی کام کرو اور نہ ہی آخرت کے لیے کوئی عمل“۔(روح المعانی)

اس سے معلوم ہوا کہ بیکار اور نکمار ہنا بڑا عیب ہے۔ اسی طرح فضول کاموں اور ناجائز مشاغل میں مصروف رہنا بھی بے عقلی اور ناشکری ہے۔ آقا و مولیٰ ﷺ کا فرمانِ عالیشان ہے، ”دو نعمتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے اکثر لوگ نقصان میں ہیں، وہ ہیں صحت اور فراغت“۔ [85]

یعنی ان نعمتوں کو غفلت کے ساتھ بیکار اور لغو کاموں میں برباد کرنا اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا باعث ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”حدیث شریف میں ہے کہ بیکار اور فارغ نوجوان کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جب جوان فارغ ہوتا ہے تو شیطان اس کے دل میں گھر بنا لیتا ہے اور اس کا دل و دماغ برے خیالات اور وسوسوں سے بھر دیتا ہے جس کی وجہ سے اس کے بھٹکنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ اس لیے ایسے جوان کو چاہیے کہ وہ اپنے جسم کو کسی اچھے کام میں مشغول رکھے تاکہ اس کا دل وسوسوں کی طرف مائل نہ ہو“۔ [86]

مذکورہ آیت میں { فَانْصَبْ} کا ترجمہ ہے، ”محنت کرو“۔ یعنی عبادت میں اس قدر محنت کی جائے کہ انسان تھکن محسوس کرے۔ ظاہر ہے کہ مشکل کام کرنے میں ہی محنت درکار ہوتی ہے۔ آسان کام تو معمولی کوشش سے ہی ہو جاتے ہیں۔

ایک عبادت سے فارغ ہوتے ہی دوسری میں مشغول ہو جانا یا کسی دنیاوی کام سے فرصت ملنے پر عبادت کے لیے کھڑا ہو جانا نفس پر گراں ہوتا ہے لیکن رب کی رضا کی خاطر نفل عبادات میں مصروف

85...مشکاۃ المصابیح، کتاب الرقاق، حدیث:5155

86...کیمیائے سعادت، ص213

ہونا رب کو محبوب ہے اور تزکیۂ نفس کا ذریعہ بھی۔

آخری آیت میں ارشاد ہوا: "اور اپنے رب ہی کی طرف رغبت کرو"۔ یعنی اپنے تمام معاملات میں خواہ دینی ہوں یا دنیاوی، اپنے رب ہی سے لَو لگاؤ، اپنی ضروریات اور حاجات میں اسی سے اس کا فضل و کرم مانگو اور ہر معاملے میں اسی پر بھروسہ کرو۔

حضرت عطاء رحمہ اللہ کا ارشاد ہے، اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جہنم کا خوف کرتے ہوئے اور جنت کی رغبت رکھتے ہوئے بارگاہِ الٰہی میں آہ وزاری کرو۔[87]

اس آیتِ مبارکہ میں ایک پیغام معلمین و مبلغین کیلیے ہے اور ایک عام مسلمانوں کے لیے۔ تعلیم و تبلیغ اور مسلمانوں کی اصلاح یقیناً عظیم عبادت ہے لیکن علماء و مبلغین کو کچھ وقت ضرور خلوت میں ذکرِ الٰہی، توجہ الی اللہ اور دعاوِاستِغفار کے لیے مخصوص کرنا چاہیے جس میں وہ پوری توجہ اور محبت سے اپنے رب سے مناجات کریں، اس سے دل میں نور اور زبان میں اثر پیدا ہوتا ہے۔

ایسے علماء و مبلغین اور نعت خواں حضرات جو لوگوں کو اچھی باتوں کی تلقین کرتے ہیں اور خود ان پر عمل نہیں کرتے، ان کے لیے عذاب کی وعید ہے۔ ارشادِ ربانی ہے،

{كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ}

"کیسی سخت ناپسند ہے اللہ کو وہ بات کہ وہ کہو جو نہ کرو"۔(پ28، صف:3)

ہمارے آقا و مولیٰ ﷺ نے ہر مسلمان کے ذمہ ایک کام لگایا ہے اور وہ ہے: **بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ اٰيَةً**۔ اگر کوئی صرف ایک آیت ہی جانتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ دوسروں تک پہنچائے۔[88]

یہ بھی حدیث پاک میں ہے کہ: علمِ دین سیکھنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔[89]

پس ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وقت اور صحت جیسی عظیم نعمتوں کی قدر کرتے ہوئے دین کا علم حاصل کرے اور پھر اس پر خود عمل کرتے ہوئے نیکی کی دعوت دوسروں تک پہنچائے اور یہ یاد رکھے کہ ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔

87... تفسیر مظہری، الم نشرح، تحت الایۃ:7

88... بخاری، کتاب احادیث الانبیا، حدیث:3461

89... ابن ماجہ، ابواب السنۃ، حدیث:224

تفسیر سورۃ التین

سورۃ التین مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں آٹھ آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَ التِّیۡنِ وَ الزَّیۡتُوۡنِ ﴿۱﴾ وَ طُوۡرِ سِیۡنِیۡنَ ﴿۲﴾ وَ ہٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِیۡنِ ﴿۳﴾ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ
فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ﴿۴﴾ ثُمَّ رَدَدۡنٰہُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ ﴿۵﴾ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
فَلَہُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ﴿۶﴾ فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعۡدُ بِالدِّیۡنِ ﴿۷﴾ اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِاَحۡکَمِ
الۡحٰکِمِیۡنَ ﴿۸﴾

"اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا (ہے)"

"انجیر کی قسم اور زیتون اور طورِ سینا اور اِس امان والے شہر کی، بے شک ہم نے آدمی کو اچھی صورت پر بنایا۔ پھر اسے ہر نیچی سے نیچی حالت کی طرف پھیر دیا۔ مگر جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے کہ انہیں بے حد ثواب ہے۔ تو اب کیا چیز تجھے انصاف کے جھٹلانے پر باعث ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں؟"۔

لفظی ترجمہ:

وَ	التِّیۡنِ	وَ	الزَّیۡتُوۡنِ
قسم	انجیر	اور	زیتون (کی)

وَ	طُوۡرِ	سِیۡنِیۡنَ
اور	طُورِ	سینا (کی)

وَ	ہٰذَا	الۡبَلَدِ	الۡاَمِیۡنِ
اور	اس	شہر	امن والے (کی)

تَقْوِيْم	اَحْسَنِ	فِيْۤ	الْاِنْسَانَ	خَلَقْنَا	قَدْ	لَ
ساخت	بہترین	میں	انسان (کو)	پیدا کیا ہم نے	بیشک	البتہ

سٰفِلِيْنَ	اَسْفَلَ	هُ	رَدَدْنٰا	ثُمَّ
سب نیچوں (سے)	زیادہ نیچے	اسے	پھیر لائے ہم	پھر

الصّٰلِحٰتِ	عَمِلُوا	وَ	اٰمَنُوْا	الَّذِيْنَ	اِلَّا
اچھے	کام کیے جنہوں نے	اور	ایمان لائے	وہ جو	مگر

مَمْنُوْنٍ	غَيْرُ	اَجْرٌ	هُمْ	لَ	فَ
ختم ہونے والا	نہ	ثواب	اُن (کے)	لیے	پس

الدِّيْنِ	بِ	بَعْدُ	كَ	يُكَذِّبُ	مَا	فَ
قیامت	کو	بعد (اسکے)	تجھے	جھٹلا سکتی ہے	کیا چیز	تو

الْحٰكِمِيْنَ	اَحْكَمِ	بِ	اللّٰهُ	لَيْسَ	اَ
سب حاکموں (سے)	بڑا حاکم	-	اللہ	نہیں	کیا

ربط و مناسبت:

اس سورت کے آغاز میں چار چیزوں کی قسم ارشاد فرمائی گئی ہے۔ ’’تِین‘‘ اور ’’زیتون‘‘ سے مراد وہی انجیر اور زیتون ہیں جنہیں لوگ کھاتے ہیں۔ یا پھر وہ مقام ہیں جہاں یہ برکت و فوائد والے درخت پیدا ہوتے ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جہاں پیدا ہوئے وہاں انجیر و زیتون کے درخت بکثرت ہیں۔

طور سینا وہ جگہ ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے اور بلدِ الامین یعنی مکہ مکرمہ میں آقا و مولیٰ ﷺ کی ولادتِ باسعادت ہوئی۔

اس گفتگو سے اس سورت کی سابقہ سورت سے ربط و مناسبت واضح ہوتی ہے کہ سابقہ سورت میں صریحاً امامُ الانبیاء ﷺ کی عظمت و شان کا بیان تھا جبکہ اس سورت میں اجمالاً آپ کی شان اور ساتھ ہی دیگر اولوالعزم انبیاء کا ذکر موجود ہے۔

حضور ﷺ کی شان اس طرح بیان ہوئی کہ آپ اُس اشرفُ المخلوقات کے سردار ہیں جس کو رب تعالیٰ نے سب سے زیادہ خوبصورت سانچے میں ڈھالا ہے۔ نیز اُس شہر کی خوبی بیان ہوئی جس میں حضور ﷺ کی ولادت و بعثت ہوئی اور آپ نے اپنی حیاتِ مبارکہ کا بیشتر حصہ وہاں گزارا۔

سابقہ سورت میں رسولِ معظم ﷺ کو ذکر بلند کرنے کی بشارت عطا ہوئی تھی جبکہ اس سورت میں آپ پر ایمان لانے اور عملِ صالح کرنے والوں کو کبھی نہ ختم ہونے والے اجر کی خوشخبری دی گئی ہے۔

سابقہ سورت میں ارشاد ہوا تھا کہ ”جب ایک نیکی سے فارغ ہو جاؤ تو دوسری نیکی میں محنت کرو اور اپنے رب ہی کی طرف رغبت کرو“۔اس سورت میں بتایا گیا کہ انسان کی تخلیق ایسی ہوئی ہے کہ وہ ان کاموں کو بہتر طور پر انجام دے سکتا ہے۔ نیز یہ بھی بیان کیا گیا کہ ایک دن ضرور آئے گا جب احکمُ الحاکمین ہر شخص کو اس کے اچھے برے اعمال کے مطابق جزا و سزا دے گا۔

شانِ نزول:

یہ سورت، سورۃ البروج کے بعد نازل ہوئی۔ اُس وقت کے حالات یہ تھے کہ کفار و مشرکین قیامت کا انکار کر رہے تھے اور ان کے اذہان اچھے برے اعمال کی باز پُرس اور ان پر جزا و سزا کا تصور قبول کرنے سے انکاری تھے۔ قیامت کے ان منکرین کی نصیحت کے لیے یہ سورت نازل ہوئی۔

اس سورت میں انہیں بتا دیا گیا کہ تمہارا خالق و مالک جو سب حاکموں سے بڑا حاکم ہے، اس کے عدل و انصاف کا تقاضا ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق جزا و سزا ملے۔ کیا اللہ تعالیٰ کو احکمُ الحاکمین ماننے کے باوجود قیامت کو جھٹلانے اور اعمال کی جزا و سزا کے انکار کی کوئی گنجائش ہے؟ ہر گز نہیں۔

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ:

"تِین" کا معنی ہے، انجیر جو کہ ایک عمدہ میوہ اور پاکیزہ و مفید پھل ہے۔ حضرت ابن عباس، مجاہد، حسن بصری، ابراہیم نخعی رضی اللہ عنہم و دیگر مفسرین کا ارشاد ہے، تِین اور زَیْتُوْن سے مراد وہی انجیر اور زیتون ہیں جنہیں لوگ کھاتے ہیں۔

جب جنتی لباس حضرت آدم علیہ السلام کے جسم سے جدا ہوا تو قرآن مجید میں ہے کہ وہ اپنے بدن پر پتے چپٹانے لگے۔ {يَخۡصِفٰنِ عَلَيۡهِمَا مِنۡ وَّرَقِ الۡجَنَّةِ} اور وہ انجیر کے درخت کے پتے تھے۔ اسی بناء پر انجیر کی قسم ارشاد ہوئی۔[90]

انجیر کی چند ظاہری خصوصیات ہیں۔ یہ خوش ذائقہ غذا ہے اور بہترین دوا بھی۔ اسے نہار منہ کھانا زیادہ نفع دیتا ہے۔ یہ لطیف اور زود ہضم ہے، بلغم تحلیل کرتا ہے، جگر اور تِلی کے سُدّوں کو کھولتا ہے، گردوں کو صاف کرتا ہے، مثانہ سے پتھری کو خارج کرتا ہے، فاسد مواد کو پسینہ کے ذریعہ نکالتا ہے، بدن کو فربہ کرتا ہے۔ یہ منہ کی بو کو زائل کرتا ہے، سر کے بالوں کو لمبا کرتا ہے اور بدن کو فالج سے محفوظ رکھتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انجیر تناول فرمائے اور صحابہ سے فرمایا: اسے کھاؤ۔ اگر میں کہتا کہ کوئی پھل جنت سے نازل ہوا ہے تو میں کہتا، وہ یہی پھل ہے۔ کیونکہ جنت کے پھل بغیر گٹھلی کے ہوتے ہیں۔ اسے کھاؤ، یہ بواسیر کو ختم کرتا ہے اور جوڑوں کے درد میں فائدہ دیتا ہے۔

انجیر کی بعض باطنی خصوصیات بھی ہیں جو اہلِ فضل و کمال سے مشابہہ ہیں۔

اول: اہلُ اللہ کی طرح اس کا ظاہر و باطن یکساں ہے۔ کیونکہ اس میں گٹھلی ہے نہ چھلکا اور نہ ہی اس میں پھینکنے کی کوئی اور چیز ہے یعنی پورے کا پورا قیمتی ہے۔

دوم: انجیر کا درخت پھول آنے سے پہلے پھل دیتا ہے جبکہ دوسرے درختوں پر پہلے پھول آتے ہیں پھر پھل۔ گویا اس میں ایثار کی صفت پائی جاتی ہے کہ یہ خود پھولوں سے آراستہ ہونے سے پہلے دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ جبکہ دوسرے درخت پہلے اپنا اور پھر دوسروں کا خیال کرتے ہیں۔

90... تفسیر قرطبی، التین، تحت الآیۃ: 1

سوم: دوسرے درخت سال میں ایک ہی بار پھل دیتے ہیں جبکہ یہ سال میں کئی بار پھل دیتا ہے۔ اس لیے اس کا فیض دوسرے پھل دار درختوں سے زیادہ ہے۔

چہارم: یہ درخت زیادہ بلند نہیں ہوتا اور نہ ہی اس میں کانٹا ہوتا ہے۔ یعنی اس سے پھل حاصل کرنا آسان ہوتا ہے اور اس میں کسی طرح کی اذیت کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ یہ بھی اہلُ اللہ کی صفت ہوتی ہے کہ وہ طالبانِ فیض کے قریب ہوتے ہیں اور بداخلاق بھی نہیں ہوتے۔

زیتون ایک برکت والا درخت ہے۔ قرآن کریم میں اسے شجرۂ مبارکہ فرمایا گیا۔ حدیث شریف میں ارشاد ہے، زیتون کھاؤ اور اس کا تیل استعمال کرو کیونکہ یہ برکت والے درخت سے ہے۔ [91]

انجیر کی طرح یہ غذا بھی ہے، دوا بھی اور میوہ بھی۔ زیتون کے درخت کے پتے نہیں گرتے۔ انجیر میں جو فوائد ہیں ان میں سے اکثر زیتون میں بھی پائے جاتے ہیں اور بعض اس سے زائد بھی ہیں۔

کچے زیتون کا روغن چراغ میں جلانے کے کام آتا ہے، نہایت صاف وپاکیزہ روشنی دیتا ہے۔ پکے زیتون کا تیل جوڑوں کے درد میں فائدہ مند ہے، جسم اور سر پر بھی لگایا جاتا ہے، نیز سالن کی جگہ روٹی سے بھی کھایا جاتا ہے۔ اس میں کولیسٹرول نہیں ہوتا بلکہ یہ کولیسٹرول کم کرنے کے لیے بہترین دوا ہے۔ اس کے پینے سے پیٹ کے کیڑے اور پِتے کی پتھری خارج ہو جاتی ہے۔ یہ بصارت کو تقویت دیتا ہے اور موتیا کو روکتا ہے۔

زیتون کی لکڑی مسواک کے لیے مفید ہے۔ سرکارِ دوعالم ﷺ زیتون کے درخت کے پاس سے گزرے تو آپ نے اس سے مسواک توڑی اور فرمایا، بہترین مسواک برکت والے درخت زیتون کی ہے۔ یہ منہ کو پاکیزہ بناتی ہے اور بدبو دور کرتی ہے۔ زیتون کی مسواک میری اور مجھ سے پہلے انبیاء کی سنت ہے۔ [92]

زیتون کی بھی چند باطنی خصوصیات ہیں جو اولیاء اللہ سے مشابہہ ہیں۔

اول: زیتون کا تیل چمکدار ہوتا ہے، اور جلایا جائے تو اعلیٰ درجہ کی روشنی دیتا ہے جو دھوئیں سے پاک ہوتی ہے۔ اولیاء اللہ کے وجود بھی نورانی ہوتے ہیں اور ان کی نورانیت نفسانی کدورتوں سے پاک

91...ابن ماجہ، کتاب الاطعمہ، الزیت، حدیث: 332   92...طبرانی، حدیث: 1941

ہوتی ہے۔

دوم: قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو زیتون کے درخت سے تشبیہ دی گئی ہے۔

ارشاد ہوا: {يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ}(پ18،نور:35)

"روشن ہوتا ہے برکت والے درخت زیتون سے"۔

اولیاء اللہ بھی نورِ مصطفی ﷺ سے فیض پاکر ایسے روشن ہوتے ہیں کہ ان پر انوارِ الٰہیہ منکشف ہوتے ہیں اور وہ اپنے طالبانِ فیض کو نورِ ہدایت عطا کرتے ہیں۔

سوم: زیتون کا درخت خشک پہاڑوں میں اُگتا ہے اور بغیر دیکھ بھال کے ہزاروں برس تک رہتا ہے۔ اولیاء اللہ کے فیوض وبرکات بھی دنیا میں طویل مدت تک لوگوں کو نفع دیتے رہتے ہیں۔

چہارم: زیتون کا وطن ملک شام، کثیر انبیاء کرام علیہم السلام کا معدن ومرکز رہا ہے اور اہلِ وطن کو اپنے دوسرے اہلِ وطن سے خاص مناسبت ہوتی ہے۔

"تین" اور "زیتون" کی تفسیر میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ 'تین' سے مراد وہ مسجد ہے جو طوفان کے بعد نوح علیہ السلام نے کوہِ جُودی پر تعمیر کی تھی، اور 'زیتون' سے مراد بیت المقدس کی مسجد ہے۔

ایک اور قول یہ ہے کہ تین اور زیتون سے مراد وہ علاقے ہیں جہاں یہ درخت بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ ملک شام ہے جو کثیر انبیاء کرام کا مولد ومسکن ہے اور قرآن کریم نے اسے برکت والی زمین فرمایا ہے۔ ارشاد ہوا: {اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ} (پ17،انبیاء:71)

"اُس زمین کی طرف جس میں ہم نے جہاں والوں کے لیے برکت رکھی"۔

وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ:

'طور' سے مراد پہاڑ ہے اور 'سینین' سے مراد خوبصورت اور مبارک۔ طُورِ سینا وہ مقام ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے۔

اَلْبَلَدِ الْاَمِيْنِ:

اس سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ شہر کے امین ہونے کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے اندر داخل ہونے والے

کی اس طرح حفاظت کرتا ہے جیسے امانت دار، امانت کی حفاظت کرتا ہے۔ چنانچہ جو انسان یا جانور مکہ میں داخل ہو، وہ امن والا ہو جاتا ہے۔

یہ چاروں چیزیں برکت و نفع والی ہیں۔ اس لیے ان کی قسمیں ارشاد فرما کر انسان کے احسنِ تقویم یعنی "بہترین ساخت پر" یا "شکل و عقل کے لحاظ سے بہترین اعتدال پر" ہونے کا اعلان فرمایا گیا۔

اس میں اشارہ ہے کہ جس طرح انسان کی جسمانی غذا اور امراض سے شِفا کے لیے انجیر اور زیتون پیدا کیے گئے، انسان کی روحانی غذا اور امن و سکون کے لیے طورِ سینا اور مکہ مکرمہ بنائے گئے، ایسے ہی انسان کی روحانی تربیت اور فلاحِ دارین عطا کرنے کے لیے انبیاء کرام مبعوث فرمائے گئے جو احسنِ تقویم کی بہترین مثال ہیں۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ انجیر کی پیداوار کی جگہ، بیت المقدس عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی جگہ ہے اور زیتون کی پیداوار کی جگہ، ملک شام کثیر انبیاء کرام کی پیدائش کی جگہ ہے۔ کوہِ طور پر موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے اور مکہ مکرمہ میں رحمتِ عالم ﷺ کی ولادت ہوئی۔ ان قسموں کا مقصد درحقیقت انبیاء کرام کی عظمت وشان کا اظہار ہے کیونکہ یہ ہستیاں احسنِ تقویم کی بہترین مثال ہیں۔ اور ان نفوسِ قدسیہ کی ذات و صفات اور سیرت و کردار اس بات پر گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و شکل کے اعتبار سے بہترین اعتدال پر پیدا فرمایا ہے۔

ایک اور تفسیر یہ ہے کہ تین اور زیتون پہاڑ کے نام ہیں جو بیت المقدس میں ہیں جہاں عیسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ طورِ سینا پر موسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے اور مکہ میں سیدنا محمد مصطفی ﷺ مبعوث ہوئے۔ ان جلیل القدر انبیاء کرام کی بعثت کے یہ مقامات گواہ ہیں کہ انسانی فطرت کو بہترین عدل واعتدال کے سانچے میں ڈھالا گیا ہے۔

فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ:

ارشاد ہوا: "بے شک ہم نے آدمی کو اچھی صورت پر بنایا"۔

یہ مذکورہ قسموں کا جواب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے انسان کو شکل و صورت، قد و قامت،

جبلت وفطرت، عقلی وذہنی قوت، غرض یہ کہ ہر اعتبار سے بہترین بنایا ہے۔

فِيۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِيۡمٍ سے مراد ہے، فِيۡ اَعۡدَلِ خَلۡقٍ۔ یعنی ”عدل واعتدال کی بہترین ساخت میں (پیدا کیا)“۔ (93)

مفسرین کرام کے تمام اقوال کا خلاصہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جسمانی اور عقلی اعتبار سے جیسا بہترین ہونا چاہیے، ویسا ہی پیدا فرمایا ہے۔

شیخ ابن عربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے انسان سے زیادہ خوبصورت کسی اور مخلوق کو پیدا نہیں کیا۔ رب کریم نے انسان کو حیات، علم، قدرت، ارادہ، باتیں کرنے، سننے، دیکھنے، تدبیر کرنے اور حکمت کی صفات عطا کیں۔ (94)

یہ سب اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں گویا انسان باری تعالیٰ کی صفات کا مظہر ہے۔ آقا و مولیٰ ﷺ کا ارشاد ہے، بیشک اللہ نے انسان کو اپنی صفت پر پیدا کیا ہے۔ (بخاری)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو نورِ عقل اور بصیرتِ قلبی سے نوازا، اور ظاہری وباطنی حواس سے آراستہ کر کے زمین میں خلافتِ الٰہیہ کا منصب عطا فرمایا۔ پھر عزت وفضیلت کا تاج اس ”احسنِ تقویم“ کے سر پر سجا دیا۔ ارشاد ہوا:

{وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِيۡۤ اٰدَمَ وَحَمَلۡنٰهُمۡ فِي الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ وَرَزَقۡنٰهُمۡ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلۡنٰهُمۡ عَلٰى كَثِيۡرٍ مِّمَّنۡ خَلَقۡنَا تَفۡضِيۡلًا} (پ15، بنی اسرائیل:70)

”اور بیشک ہم نے اولادِ آدم کو عزت دی، اور ان کو خشکی اور تری میں سوار کیا، اور ان کو ستھری چیزیں روزی دیں، اور ان کو اپنی بہت مخلوق سے افضل کیا“۔

حدیث پاک میں ہے کہ مومن اللہ تعالیٰ کے نزدیک ملائکہ سے زیادہ کرامت رکھتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ فرشتوں میں عقل ہے مگر خواہشات نہیں۔ اسی لیے وہ ہر لمحہ رب تعالیٰ کی اطاعت میں ہیں۔ جبکہ جانوروں میں خواہشات ہیں، عقل نہیں۔ اس لیے وہ اپنی خواہشات پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ اور انسان خواہشات اور عقل دونوں کا جامع ہے۔ جس نے عقل کو شہوت پر غالب کیا وہ ملائکہ سے افضل

93... تفسیر ابن جریر، التین، تحت الآیۃ:4

94... تفسیر قرطبی، التین، تحت الآیۃ:4

ہے اور جس نے شہوت کو عقل پر غالب کیا وہ جانوروں سے بد تر ہے۔[95]

تمام جانور زمین پر سر جھکا کر چلتے ہیں اور ہر جانور کو غذا حاصل کرنے کے لیے اپنا سر زمین کی طرف جھکانا پڑتا ہے لیکن رب تعالیٰ نے انسان کو دراز قد بنایا۔ اسی لیے چلتے ہوئے اس کا چہرہ زمین کی طرف نہیں ہوتا اور اسے اپنی غذا کے لیے زمین کی طرف سر نہیں جھکانا پڑتا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے لقمہ اُٹھا کر منہ میں ڈال لیتا ہے۔

"احسنِ تقویم" کے مفہوم میں یہ بات داخل ہے کہ جس مقصد کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا، وہ اس مقصد کے لیے بالکل ٹھیک اور مناسب بنایا گیا۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

{وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا۝}(پ30، شمس:7-10)

"اور جان کی قسم! اور اُس کی جس نے اسے ٹھیک بنایا۔ پھر اس کی بدکاری اور اس کی پرہیز گاری دل میں ڈالی۔ بیشک مراد کو پہنچایا جس نے اسے (نفس کو) ستھرا کیا، اور نامراد ہوا جس نے اسے معصیت میں چھپایا"۔

انسان اور جانوروں میں سماعت، بصارت، بھوک پیاس، شہوَت اور بقائے نسل، دشمن سے لڑائی اور حفاظت وغیرہ متعدد معاملات میں کوئی فرق نہیں۔ فرق ہے تو عقل وشعور اور اس الہامی ہدایت کا، جس کی بناء پر انسان کو یہ حکم ہے کہ وہ اپنے ارادہ واختیار سے نیکی کا راستہ اختیار کرے اور اپنے نفس کو گناہوں سے بچائے۔

اس آیت کے تحت علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ خلیفہ منصور کے مصاحب عیسیٰ بن موسیٰ نے اپنی بیوی سے کہہ دیا، اگر تو چاند سے زیادہ حسین نہ ہو تو تجھے تین طلاق۔ وہ یہ سن کر پردہ میں چلی گئی اور کہا، آپ نے مجھے طلاق دیدی۔ عیسیٰ پریشان ہو گیا۔ اس نے خلیفہ سے یہ واقعہ بیان کیا۔ علماء سے پوچھا گیا، سب نے کہا، طلاق ہو گئی۔ ایک عالم جو امام اعظم رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے، وہ خاموش رہے۔

95...خزائن العرفان، التین، تحت الآیۃ:4

خلیفہ نے ان سے پوچھا تو انہوں نے بسم اللہ پڑھ کر سورۃ والتین تلاوت کی اور کہا، اے امیر المومنین! اللہ تعالیٰ نے انسان کو سب سے بہترین صورت میں بنایا ہے، کوئی شے اس سے زیادہ حسین نہیں ہو سکتی۔ یہ سن کر سب علماء حیران رہ گئے اور انہوں نے متفقہ طور پر کہا، واقعی اس عورت کو طلاق نہیں ہوئی۔

اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ:

پھر ارشاد فرمایا گیا، ''پھر اسے ہر نیچی سے نیچی حالت کی طرف پھیر دیا''۔

یہ حقیقت ہے کہ جو چیز زیادہ بلند ہوتی ہے جب وہ گرتی ہے تو زیادہ بلندی سے گرنے کے نتیجے میں نقصان بھی زیادہ ہوتا ہے۔ چونکہ انسان کو عقل و خرد اور ارادہ و اختیار کی نعمتوں سے نوازا گیا اس لیے جب وہ عقل و فہم کی روشنی بجھا کر نفسانی خواہشات کی تکمیل میں اس قدر مگن ہو جاتا ہے کہ اسے اپنے خالق و مالک عزوجل اور آقا و مولیٰ ﷺ کی اطاعت کا خیال ہی نہیں آتا تو وہ اشرف المخلوقات کے مرتبہ سے گر کر نا سمجھ حیوانوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔

جب ایسا شخص حق بات کا مسلسل انکار کرتے ہوئے جانتے بوجھتے برائی کے راستے پر چلتا رہتا ہے تو ہم اُسے اُس کے اختیار کیے ہوئے سب سے نیچی حالت والے کاموں میں غرق ہونے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ جن کا ٹھکانا جہنم ہے جو یقیناً سب سے اسفل و بدتر ٹھکانا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

{وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ}

''اور اُن جیسے نہ ہو جو اللہ کو بھول بیٹھے تو اللہ نے اُنہیں بلا میں ڈالا کہ اپنی جانیں یاد نہ رہیں، وہی فاسق ہیں''۔ (پ28، حشر:19)

چونکہ انسان کو رب تعالیٰ نے بہترین عقل و شکل عطا کی ہے اور اپنی صفات کا مظہر بننے کی صلاحیت بخشی ہے۔ اب اگر یہ اس صلاحیت کو ضائع کر دے تو یہ اسفل سافلین کے حقیر مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''انسان جب اپنی صلاحیت ضائع کر دیتا ہے، اور شکرِ الٰہی، فوز و فلاح دینے والے کام اور رضائے الٰہی والے اسباب چھوڑ دیتا ہے اور اُن کاموں کو کرنے لگتا ہے جو کفر

اور غضبِ الٰہی کا باعث ہیں تو بد سے بدتر ہو جاتا ہے اور اس کا مرتبہ ہر پست مخلوق سے بھی نیچے ہو جاتا ہے۔ پھر اس کا حال اور انجام کتے اور خنزیر سے بھی برا ہو جاتا ہے بلکہ شیاطین سے بھی"۔ (96)

مذکورہ عبارت تنگ نظری اور تعصب کی بناء پر نہیں ہے بلکہ یہ افکارِ قرآن سے مستفاد ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے، {قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ أُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ}

"(اے حبیب ﷺ) تم فرماؤ! کیا میں بتادوں جو اللہ کے یہاں اس سے بدتر درجہ میں ہیں، وہ جن پر اللہ نے لعنت کی اور اُن پر غضب فرمایا، اور اُن میں سے کر دیے بندر اور سؤر اور شیطان کے پجاری۔ ان کا ٹھکانا زیادہ بُرا ہے، اور یہ سیدھی راہ سے زیادہ بہکے"۔ (پ6، مائدہ:60)

آیت ٦ کی تفسیر:

جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیبِ لبیب ﷺ پر ایمان لاتے ہیں اور اعمالِ صالحہ پر کاربند رہتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جو اُس احسنِ تقویم پر قائم رہتے ہیں جس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا کیا تھا۔ ایسے سعادت مندوں کے لیے رب کریم کی طرف سے ایسا اجر ہے جو کبھی ختم نہ ہو گا۔ یہ خوش نصیب جب دنیا سے رخصت ہو رہے ہونگے تو انہیں یہ نویدِ جانفزا سنائی جائے گی،

{يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۝ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ} (پ30 فجر، 27-30)

"اے اطمینان والی جان! اپنے رب کی طرف واپس ہو یوں کہ تُو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی، پھر میرے خاص بندوں میں داخل ہو اور میری جنت میں آ"۔

ایک قول یہ ہے کہ اَسْفَلَ سَافِلِيْن سے مراد بڑھاپے کی حالت ہے۔ اس قول کی بناء پر آیت کی تفسیر یہ ہو گی کہ بڑھاپے میں اعمال کم ہو جانے کے باوجود صالح مومن کے نامۂ اعمال میں وہی اعمال درج کیے جاتے ہیں جو وہ صحت و جوانی کے دنوں میں کیا کرتا تھا۔ تفسیر جلالین میں ہے،

96... تفسیر مظہری، حشر، تحت الایۃ:19

"جب کوئی اس قدر بوڑھا ہو جائے کہ عمل کرنے سے عاجز آ جائے تو اُسکے لیے وہی عمل لکھے جاتے ہیں جو وہ پہلے کیا کرتا تھا"۔

رسولِ معظم ﷺ کا ارشاد ہے، جب مسلمان بیمار ہو جاتا ہے یا سفر کرتا ہے (اور اس مجبوری کی وجہ سے معمول کے نیک عمل نہیں کر پاتا) تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ جو نیک اعمال یہ صحت یا اقامت کے دنوں میں کیا کرتا تھا، وہ اب بھی اس کے نامۂ اعمال میں لکھتے رہو۔[97]

آیت ۷،۸ کی تفسیر:

اس آیت کا ایک مفہوم یہ ہے کہ "اے منکر! تو اب کیا چیز تجھے انصاف یعنی جزاو سزا کے جھٹلانے کا باعث ہے"۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ "اے حبیب ﷺ! اِس قدر دلائل کے بعد جزاو سزا کے معاملہ میں تمہیں کون جھٹلا سکتا ہے"۔

انسان خوب جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے پانی کی ایک بوند سے پیدا کیا، پھر اسے تدریجاً اچھی شکل عطا فرمائی، پھر اسے بچہ سے جوان کیا، پھر اسے ادھیڑ عمر تک پہنچایا حتیٰ کہ اس پر بڑھاپا طاری کر دیا۔ یہ جسمانی تغیر اس بات کی روشن دلیل ہے کہ وہ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ ارشاد ہوا:

{قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ}

"(کافر) بولا، ایسا کون ہے کہ ہڈیوں کو زندہ کرے جب وہ بالکل گل گئیں؟ (اے حبیب ﷺ) تم فرماؤ! انہیں وہ زندہ کرے گا جس نے پہلی بار انہیں بنایا، اور اسے ہر پیدائش کا علم ہے"۔ (پ23، یس: 78-79)

انسان خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ کچھ لوگ ایمان اور اعمالِ صالحہ کے ساتھ احسنِ تقویم والی زندگی گزارتے ہیں اور کچھ لوگ حرص و ہوس، خود غرضی و کمینہ پن اور ظلم و تکبر کے ساتھ دیگر برائیوں میں مبتلا ہو کر اخلاقی پستی میں سب سے نچلے درجے تک پہنچ جاتے ہیں حتیٰ کہ ان کی زندگی اور

97...بخاری، کتاب الجهاد والسیر، حدیث: 2996

کسی جانور کی زندگی کے مقاصد میں کوئی نمایاں فرق باقی نہیں رہتا۔

آپ خود فیصلہ کیجیے کہ کیا عقل وشعور کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں کا انجام ایک جیسا ہو؟ کیا عدل وانصاف یہ چاہے گا کہ پاکیزہ اور اخلاقِ حسنہ والی زندگی گزارنے والے کو کوئی جزا نہ دی جائے اور اسفل سافلین میں گرنے والوں کو کوئی سزا نہ ملے؟

سورۃ القلم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: {اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ كَالْمُجْرِمِیْنَ o مَا لَكُمْ كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ} (پ29، قلم:35-36) "کیا ہم مسلمانوں کو مجرموں جیسا کر دیں؟ تمہیں کیا ہوا، کیسا حکم لگاتے ہو"۔

{اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ} (پ25، جاثیہ:21) "کیا جنہوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا، (وہ) یہ سمجھتے ہیں کہ ہم انہیں اُن جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے، کہ اِن کی (اور) اُن کی زندگی اور موت برابر ہو جائے؟ (ہر گز نہیں) کیا بُرا حکم لگاتے ہیں"۔

یعنی جب نیک اور بُرے لوگوں کی زندگی یکساں نہیں تو ان کی موت اور آخرت بھی یکساں نہیں ہو سکتی، عدل کا یہی تقاضا ہے۔ جب دنیا کے کسی چھوٹے سے علاقے کے حاکم سے تم انصاف کی توقع رکھتے ہو اور تم یہ چاہتے ہو کہ وہ مجرموں کو سزا دے اور اچھے کام کرنے والوں کو انعام دے۔ تو تم خود ہی بتاؤ کہ کیا اللہ تعالیٰ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟ یقیناً ہے تو پھر کیا تم اس سے یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ عدل وانصاف نہیں کرے گا؟ کیا وہ بُروں اور اچھوں کو ایک جیسا کر دے گا؟ ہر گز نہیں۔ وہ خود فرماتا ہے،

{وَمَا یَسْتَوِی الْاَعْمٰى وَالْبَصِیْرُ o وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ o وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ o وَمَا یَسْتَوِی الْاَحْیَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ} "اور برابر نہیں اندھا اور آنکھوں والا، اور نہ اندھیریاں اور اجالا، اور نہ سایہ اور تیز دھوپ، اور برابر نہیں زندے اور مُردے"۔ (پ22، فاطر:19-22)

اسی طرح سورۃ المجادلہ میں {حِزْبُ الشَّیْطٰنِ} اور {حِزْبُ اللّٰهِ} کا ذکر فرمایا گیا اور ارشاد ہوا، شیطان کا گروہ نقصان میں ہے اور اللہ کا گروہ کامیاب ہے۔

سورۃ التین کی آخری آیت میں حضور ﷺ کو تسلی دی گئی کہ اے حبیب ﷺ! آپ رنجیدہ نہ ہوں،

کیا اللہ تعالیٰ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں؟ یقیناً ہے تو وہ تمہارے اور تمہیں جھٹلانے والوں کے درمیان فیصلہ فرمادے گا اور منکروں کو عذاب دے گا۔

آقا و مولیٰ ﷺ کا ارشاد ہے: جب اس سورت کی تلاوت کرو اور آخری آیت پڑھو تو کہو، بَلٰی وَاَنَا عَلٰی ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْن۔ ہاں! میں بھی اس پر گواہی دینے والوں میں سے ہوں۔ [98]

98...ابو داود، کتاب الصلوۃ، حدیث:887

تفسیر سورۃ العلق

سورۃ العلق مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں اُنیس آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ خَلَقَ‌ۚ ﴿۱﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ‌ۚ ﴿۲﴾ اِقۡرَاۡ وَرَبُّكَ الۡاَكۡرَمُۙ ﴿۳﴾
الَّذِىۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِۙ ﴿۴﴾ عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ يَعۡلَمۡؕ ﴿۵﴾ كَلَّاۤ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَيَطۡغٰٓىۙ ﴿۶﴾ اَنۡ رَّاٰهُ
اسۡتَغۡنٰىؕ ﴿۷﴾ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجۡعٰىؕ ﴿۸﴾ اَرَءَيۡتَ الَّذِىۡ يَنۡهٰىۙ ﴿۹﴾ عَبۡدًا اِذَا صَلّٰىؕ ﴿۱۰﴾ اَرَءَيۡتَ اِنۡ
كَانَ عَلَى الۡهُدٰٓىۙ ﴿۱۱﴾ اَوۡ اَمَرَ بِالتَّقۡوٰىؕ ﴿۱۲﴾ اَرَءَيۡتَ اِنۡ كَذَّبَ وَتَوَلّٰىؕ ﴿۱۳﴾ اَلَمۡ يَعۡلَمۡ بِاَنَّ اللّٰهَ
يَرٰىؕ ﴿۱۴﴾ كَلَّا لَـئِنۡ لَّمۡ يَنۡتَهِ ۙ لَنَسۡفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِۙ ﴿۱۵﴾ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ‌ۚ ﴿۱۶﴾ فَلۡيَدۡعُ
نَادِيَهٗۙ ﴿۱۷﴾ سَنَدۡعُ الزَّبَانِيَةَۙ ﴿۱۸﴾ كَلَّا ؕ لَا تُطِعۡهُ وَاسۡجُدۡ وَاقۡتَرِبْ۩ ﴿۱۹﴾

"اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا (ہے)"

"پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، آدمی کو خون کی پھٹک سے بنایا۔ پڑھو! اور تمہارا رب ہی سب سے بڑا کریم، جس نے قلم سے لکھنا سکھایا، آدمی کو سکھایا جو نہ جانتا تھا۔

ہاں ہاں! بیشک آدمی سرکشی کرتا ہے، اس پر کہ اپنے آپ کو غنی سمجھ لیا، بیشک تمہارے رب ہی کی طرف پھرنا ہے۔

بھلا دیکھو تو جو منع کرتا ہے بندے کو جب وہ نماز پڑھے۔ بھلا دیکھو تو اگر وہ ہدایت پر ہوتا یا پرہیزگاری بتاتا تو کیا خوب تھا۔ بھلا دیکھو تو اگر جھٹلایا اور منہ پھیرا تو کیا حال ہوگا۔ کیا نہ جانا کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔

ہاں ہاں! اگر باز نہ آیا تو ضرور ہم پیشانی کے بال پکڑ کر کھینچیں گے۔ کیسی پیشانی؟ جھوٹی، خطاکار۔ اب پکارے اپنی مجلس کو، ابھی ہم سپاہیوں کو بلاتے ہیں۔ ہاں ہاں! اس کی نہ سنو، اور سجدہ کرو اور ہم سے قریب ہو جاؤ"۔

لفظی ترجمہ:

اِقْرَاْ	بِ	اسْمِ	رَبِّ	كَ	الَّذِیْ	خَلَقَ
پڑھو	ساتھ	نام	رب (کے)	اپنے	وہ	جس نے پیدا کیا

خَلَقَ	الْاِنْسَانَ	مِنْ	عَلَقٍ
پیدا کیا اُس نے	انسان	سے	جمے ہوئے خون

اِقْرَاْ	وَ	رَبُّ	كَ	الْاَكْرَمُ
پڑھو	اور	رب	تمہارا	سب سے بڑا کریم

الَّذِیْ	عَلَّمَ	بِ	الْقَلَمِ
وہ جس	(نے) سکھایا	ساتھ	قلم (کے)

عَلَّمَ	الْاِنْسَانَ	مَا	لَمْ	يَعْلَمْ
سکھایا اُس نے	آدمی (کو)	جو	نہ	جانتا تھا وہ

كَلَّآ	اِنَّ	الْاِنْسَانَ	لَ	يَطْغٰۤى
ہرگز نہیں	بیشک	آدمی	البتہ	سرکشی کرتا ہے

اَنْ	رَّاٰ	هُ	اسْتَغْنٰى
کہ	دیکھتا ہے	اپنے آپ کو	غنی/بے نیاز

اِنَّ	اِلٰى	رَبِّ	كَ	الرُّجْعٰى
بیشک	طرف	رب	تمہارے	لَوٹنا (ہے)

اَ	رَءَیْتَ	الَّذِیْ	یَنْھٰی
کیا	دیکھا تم نے	(اُسے) جو	منع کرتا ہے

عَبْدًا	اِذَا	صَلّٰی
بندے (کو)	جب	نماز پڑھے وہ

اَ	رَءَیْتَ	اِنْ	کَانَ	عَلَی	الْھُدٰٓی
کیا	دیکھا تم نے	اگر	ہوتا وہ	پر	ہدایت

اَوْ	اَمَرَ	بِ	التَّقْوٰی
یا	حکم دیتا	ساتھ	پرہیزگاری (کے)

اَ	رَءَیْتَ	اِنْ	کَذَّبَ	وَ	تَوَلّٰی
کیا	دیکھا تم نے	یہ کہ	جھٹلایا اُس نے	اور	منہ پھیرا اُس نے

اَ	لَمْ	یَعْلَمْ	بِاَنَّ	اللّٰهَ	یَرٰی
کیا	نہ	جانا اُس نے	کہ	اللہ	دیکھ رہا ہے

کَلَّا	لَ	اِنْ	لَّمْ	یَنْتَهِ	لَ	نَسْفَعًا	بِ	النَّاصِیَةِ
ہاں ہاں	البتہ	اگر	نہ	باز آیا وہ	(تو) ضرور	گھسیٹیں گے ہم	ساتھ	پیشانی (کے)

نَاصِیَةٍ	کَاذِبَةٍ	خَاطِئَةٍ
پیشانی	جھوٹی	خطاکار

فَ	لْ	یَدْعُ	نَادِیَ	ہٗ
پس	چاہیے	وہ بلائے	مجلس (کو)	اپنی

سَ	نَدْعُ	الزَّبَانِيَةَ
ابھی	ہم بلاتے ہیں	عذاب کے فرشتوں (کو)

كَلَّا	لَا	تُطِعْ	هُ	وَ	اسْجُدْ	وَ	اقْتَرِبْ
ہاں ہاں	نہ	مانو تم	اُس (کی)	اور	سجدہ کرو	اور	قریب ہو جاؤ

اس آیت کی تلاوت کرنے یا سننے والے پر سجدۂ تلاوت واجب ہے۔

ربط و مناسبت:

سورۃ التین سے اس سورت کا گہرا ربط و تعلق ہے۔ سورۃ التین میں انسان کو احسنِ تقویم میں پیدا کرنے کا ذکر تھا، اس سورت میں انسان کو احسنِ تقویم کے سانچے پر قائم رکھنے کے لیے راہِ ہدایت بتائی گئی ہے جس کا پہلا مرحلہ علم کا حصول ہے۔

سورۃ التین میں انسان کی صورت کی تشکیل کا ذکر تھا یہاں اس کی مادی تخلیق کا بیان ہے۔ سابقہ سورت میں انسان کا بہترین ساخت میں پیدا کرنا بیان ہوا، اس سورت میں انسان کی جمے ہوئے خون سے پیدائش کا ذکر کیا گیا۔

سابقہ سورت میں انسان کا اشرف المخلوقات اور جامع الکمالات ہونا مذکور تھا، یہاں انسان کی حقیقت بیان ہوئی کہ خون کی پھٹکی سے پیدا ہوا مگر علومِ الٰہیہ نے اسے جامع الکمالات اور اشرف المخلوقات بنا دیا۔

سورۃ التین میں جھٹلانے والوں کی مذمت کی گئی اور انہیں اسفل سافلین میں پہنچنے کی وعید سنائی گئی جبکہ اس سورت میں جھٹلانے والوں کے سردار ابو جہل کے تکبر اور اس کی ناپاک حرکتوں کا تذکرہ ہے جن کی بناء پر وہ اسفل السافلین کا مستحق ہوا۔

شانِ نزول:

اس سورت کے دو حصے ہیں۔ اس کی پہلی پانچ آیات سے رسولِ معظم ﷺ پر نزولِ وحی کا آغاز ہوا، جبکہ چھٹی آیت سے آخر تک آیات اس وقت نازل ہوئیں جب حضورِ اکرم ﷺ نے حرمِ کعبہ میں نماز

پڑھنا شروع کی اور ابو جہل نے آپ کو دھمکیاں دے کر اس سے روکنے کی ناپاک کوشش کی۔

جمہور مفسرین کے نزدیک نبی کریم ﷺ پر پہلی وحی کے طور پر سورۃ العلق کی پہلی پانچ آیات نازل ہوئیں البتہ جو مکمل سورت آپ ﷺ پر سب سے پہلے نازل ہوئی، وہ سورت فاتحہ ہے۔

اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، رسولِ معظم ﷺ پر وحی کی ابتدا سچے خوابوں کی صورت میں ہوئی۔ آپ جو خواب دیکھتے، بالکل ویسے ہی واقعہ رونما ہو جاتا۔ پھر حضور ﷺ کے دل میں خلوت نشیں ہونے کا شوق پیدا ہو گیا۔ آپ غارِ حرا جا کر تنہائی میں اپنے رب کی عبادت کرنے لگے۔ آپ کھانے پینے کا ضروری سامان ساتھ لے جاتے اور کئی کئی راتیں وہاں عبادت میں مصروف رہتے۔

اسی دوران آپ پر اچانک وحی نازل ہوئی۔ جبریل علیہ السلام آئے اور عرض کیا، اِقْرَأْ۔ پڑھیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: مَا اَنَا بِقَارِیءٍ۔ ”میں پڑھنے والا نہیں ہوں“۔ حضرت جبریل نے آپ کو اپنے سینے سے لگا کر نہایت زور سے دبایا، پھر چھوڑ کر کہا، پڑھیے۔ آپ نے وہی جواب دیا۔ تین مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ پھر جبریل علیہ السلام نے کہا،

{اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۔ اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ۔ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ}

”پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، آدمی کو خون کی پھٹک سے بنایا۔ پڑھو! اور تمہارا رب ہی سب سے بڑا کریم (ہے)، جس نے قلم سے لکھنا سکھایا، آدمی کو سکھایا جو نہ جانتا تھا“۔

حضور ﷺ نے یہ پانچ آیات تلاوت فرمادیں۔ اس واقعہ سے آپ پر خوف طاری ہو گیا۔ گھر لوٹے تو بدن پر کپکپی طاری تھی۔ آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: مجھے چادر اوڑھادو۔ انہوں نے چادر اوڑھادی۔ جب خوف دور ہو گیا تو آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو سارا واقعہ سنادیا اور فرمایا، مجھے تو اپنی جان کا اندیشہ ہے۔

اس پر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی، ہر گز نہیں! اللہ تعالیٰ کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کو ہر گز شر مندہ نہیں ہونے دے گا۔ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں،

محتاجوں کو مال دیتے ہیں، مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں اور مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔

پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو انجیل کو عربی میں لکھتے تھے۔ وہ بہت بوڑھے تھے اور انکی بینائی ختم ہو چکی تھی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا، اے چچازاد! اپنے بھتیجے کی بات سنو۔

حضور ﷺ نے سارا واقعہ سنا دیا تو ورقہ نے کہا، آپ پر وہی فرشتہ نازل ہوا ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوتا تھا۔ کاش میں اس وقت جوان ہوتا۔ کاش میں اُس وقت زندہ ہوتا جب آپ کی قوم آپ کو وطن سے نکال دے گی۔

حضور ﷺ نے فرمایا: کیا میری قوم مجھے یہاں سے نکال دے گی؟ ورقہ نے کہا، ہاں! جب بھی کوئی آپ جیسا پیغام لیکر آیا، اسے تکلیفیں دی گئیں۔ اگر میں اُس وقت زندہ ہوا تو آپ کی بھرپور مدد کروں گا۔ (99)

حدیث کے چند نکات:

پہلے سچے خوابوں کے ذریعے حضور ﷺ کے دل میں علومِ غیبیہ اِلقاء کیے جاتے رہے پھر تنہائی کی محبت پیدا کی گئی تاکہ آپ کا قلبِ اطہر دنیاوی معاملات اور تفکرات سے خالی ہو اور آپ اپنے رب کی طرف یکسوئی سے متوجہ رہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے قلبِ انور میں اپنی معرفت کا جو نور القاء کیا تھا، آپ غارِ حرا میں اس کے مطابق عبادت کیا کرتے، حتیٰ کہ آپ کو بیداری میں عالمِ ملکوت کا مشاہدہ ہونے لگا۔ اسی بناء پر آپ نے جبریل علیہ السلام کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔

جس طرح ہم انسانوں اور جانوروں کے درمیان فرق کر لیتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر نبی کو ایسی صفت عطا فرماتا ہے جس کی بناء پر وہ فرشتوں کا مشاہدہ کرتے ہیں نیز فرشتوں اور شیاطین کے درمیان امتیاز کر لیتے ہیں۔

وحی کے نزول کے بعد حضور پر خوف اور گھبراہٹ طاری ہونا اور یہ فرمانا کہ "مجھے اپنی جان کا

99...بخاری، کتاب بدء الوحی، حدیث:3

اندیشہ ہے" یہ کسی شبہ کی وجہ سے نہیں تھا۔ غور طلب بات ہے کہ جب حضور ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو پہچان لیا، اور وحی نازل ہو چکی، اور آپ نے وحی کا کلامُ اللہ ہونا یقین کر لیا تو کیا پھر بھی آپ کو اپنے نبی ہونے میں شک ہو سکتا تھا؟ ہر گز نہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ خوف نبوت ورسالت کی ذمہ داری کے عظیم ہونے کے باعث تھا کہ کہیں فرائضِ نبوت ورسالت کی ادائیگی میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔

امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ قاضی عیاض مالکی رحمہ اللہ نے فرمایا:

"نبی کریم ﷺ کے خوف کی وجہ یہ نہیں تھی کہ آپ کو اس کلام کے وحیٔ الٰہی ہونے میں کوئی شک تھا۔ بلکہ آپ کو یہ خوف تھا کہ اس عظیم ذمہ داری کو ادا کرنے میں آپ سے کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے یا ایسا نہ ہو کہ آپ وحیٔ الٰہی کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکیں"۔

اسی لیے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو یہ جواب دیا،

كَلاَّ وَاللهِ مَا يُخْزِيْكَ اللهُ اَبَداً۔ "ہر گز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی شرمندہ نہیں ہونے دے گا یا آپ کو کبھی ناکام نہیں ہونے دے گا"۔

وحی کی اقسام:

وحی کے لغوی معنی ہیں، "خفیہ طریقے سے خبر دینا"۔ اسی بناء پر الہام کو بھی وحی کہا جاتا ہے۔ محدث علی قاری رحمہ اللہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں:

وحی کا اصطلاحی معنی یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو قلبِ نبوی سے واصل ہوتا ہے۔ پس جس کلام کے الفاظ اور معانی دونوں نازل ہوئے اور یہ نزول جبریل علیہ السلام کے ذریعے سے ہوا، وہ قرآن کریم ہے۔ اور جس کلام کو حضور ﷺ پر صرف معنًا نازل کیا گیا اور اس کلام کو آپ نے اپنے الفاظ میں بیان فرمایا، وہ حدیثِ نبوی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

{وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ}

"اور کسی آدمی کے لائق نہیں کہ اللہ اس سے کلام فرمائے مگر وحی کے طور پر، یا یوں کہ وہ بشر پردۂ عظمت کے اِدھر ہو (کہ متکلم کو دیکھتا نہ ہو)، یا کوئی فرشتہ بھیجے کہ وہ اس کے حکم سے وحی کرے جو وہ چاہے"۔(پ25،شوریٰ:51)

قرآن واحادیث کی روشنی میں وحی کی چند اقسام درج ذیل ہیں:۔

☆ حضور ﷺ کا کلامِ قدیم سننا جیسے موسیٰ علیہ السلام نے کلامِ قدیم سنا۔

☆ مقرب فرشتے کے ذریعے وحی نازل ہونا۔

☆ دل میں کسی بات کا الہام کیا جانا (خواب میں ہو یا بیداری میں)۔

☆ گھنٹی (جرس) کی آواز کی صورت میں وحی کا نازل ہونا۔

☆ خواب میں اللہ تعالیٰ کا حضور ﷺ سے کلام فرمانا جیسا کہ ترمذی میں حدیث ہے۔

☆ بیداری میں اللہ تعالیٰ کا حضور ﷺ سے کلام فرمانا جیسا کہ شبِ معراج میں ہوا۔

☆ حضرت جبریل علیہ السلام کا کسی صحابی یا اعرابی کی صورت میں آکر کلام کرنا۔

☆ جبریل علیہ السلام کا اصل شکل میں آنا جیسے وہ چھ سو پروں کے ساتھ آئے۔

☆ حضورِ اکرم ﷺ کو خواب میں کوئی واقعہ دکھایا جانا، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔

اعلان سے قبل نبوت:

صدرُ الشریعہ علامہ محمد امجد علی اعظمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "نبوت کسبی نہیں کہ آدمی عبادت و ریاضت کے ذریعہ سے حاصل کر سکے، بلکہ محض عطائے الٰہی ہے کہ جسے چاہتا ہے اپنے فضل سے دیتا ہے۔ہاں! دیتا اُسی کو ہے جسے اسے منصبِ عظیم کے قابل بناتا ہے"۔[100]

ارشادِ باری تعالیٰ ہوا، {اَللّٰهُ اَعۡلَمُ حَيۡثُ يَجۡعَلُ رِسَالَتَهٗ}

"اللہ خوب جانتا ہے جہاں اپنی رسالت رکھے"۔(پ8،انعام:124)

ہر نبی پیدائشی نبی ہوتا ہے اور عارفِ الٰہی ہوتا ہے۔ البتہ وہ اپنی نبوت کا اعلان رب تعالیٰ کے حکم

100...بہارِ شریعت، حصہ 1،1/36

سے کرتا ہے خواہ وہ بچپن ہی میں اعلان کرے جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا، یا چالیس سال کی عمر میں اعلان فرمائے جیسا کہ حضور رحمتِ عالم ﷺ کو حکم دیا گیا۔

{يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ o قُمْ فَاَنْذِرْ}

”اے چادر اوڑھنے والے! کھڑے ہو جاؤ پھر ڈر سناؤ“۔(پ29،مدثر:1-2)

ہمارے آقا کریم ﷺ کو بچپن ہی سے رب تعالیٰ کی سب سے زیادہ معرفت حاصل تھی۔ آپ جب پیدا ہوئے تو آپ نے سجدہ کیا۔[101]

سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، میں نے دیکھا کہ ولادت کے بعد آپ نے دونوں ہاتھ زمین پر رکھے ہوئے تھے اور سر مبارک آسمان کی طرف اٹھایا ہوا تھا۔

نبی کریم ﷺ کے خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ آپ نے پیدا ہوتے ہی کلام فرمایا اور آپ کا پہلا کلام یہ تھا، اللہ اکبر کبیراً والحمد للہ کثیراً۔[102]

قرآن کریم میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا ہوتے ہی نبوت کا منصب عطا ہوا۔ اور آپ نے ارشاد فرمایا:

{اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا}

”میں ہوں اللہ کا بندہ، اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے غیب کی خبریں دینے والا (نبی) کیا“۔(پ16،مریم:30)

قرآن کریم میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جب انکے بھائیوں نے کنوئیں میں ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی فرمائی، اُس وقت ان کی عمر سات یا بارہ سال تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بھی بچپن میں وحی نازل ہوئی۔[103]

ایمان و عقل کا تقاضا یہی ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا ہوتے ہی نبوت ملے اور یحییٰ علیہ السلام و دیگر بھی بچپن ہی میں نبوت سے سرفراز کیے جائیں تو آقا و مولیٰ ﷺ، امامُ الانبیاء اور افضلُ الرُسُل

101...خصائص الکبری، ص127

102...خصائص الکبری، ص130

103...مدارج النبوۃ، ص249

ہونے کی وجہ سے زیادہ حقدار ہیں کہ پیدا ہوتے ہی منصبِ نبوت پر فائز ہوں۔ عظیم مفسر علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

جب حضرت یحییٰ علیہ السلام کو نہایت کم عمر میں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا ہوتے ہی نبوت مل سکتی ہے تو رسولِ معظم ﷺ پیدائش کے وقت نبوت سے کیونکر محروم ہو سکتے ہیں جبکہ آپ اللہ کے محبوب ہیں اور آپ ہی کے صدقے میں اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کو نبوت عطا فرمائی ہے۔[104]

متعدد احادیث اس بات پر شاہد ہیں کہ بچپن میں رسول کریم ﷺ کا شقِ صدر کیا گیا۔ خود حضور ﷺ نے شقِ صدر کے واقعے کو اپنی نبوت کی نشانی سمجھا اور اسے اپنی نبوت کی دلیل قرار دیا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے بارگاہِ رسالت میں عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! آپ کو کیسے علم ہوا کہ آپ اللہ کے نبی ہیں؟

حضور ﷺ نے فرمایا: اے ابوذر! میں مکہ میں تھا۔ میرے پاس دو فرشتے آئے۔ ایک زمین پر آ گیا اور دوسرا فضا میں رہا۔ ایک نے پوچھا، کیا یہ وہی ہیں؟ دوسرے نے کہا، ہاں۔ اُس نے کہا، ان کا ایک مرد کے ساتھ وزن کرو۔ جب وزن کیا گیا تو میں غالب رہا۔ پھر اس نے کہا، ان کا دس مردوں کے ساتھ وزن کرو۔ جب وزن کیا گیا تو میں پھر غالب رہا۔ پھر اس کے کہنے پر میرا سو اور پھر ہزار مردوں کے ساتھ وزن کیا گیا تو میں ان پر بھی غالب رہا۔

پھر ایک فرشتے نے کہا، ان کا سینہ شَق کرو۔ چنانچہ میرا سینہ چاک کیا گیا اور میرے دل کو نکالا گیا پھر اس میں سے سیاہ خون کا لوتھڑا نکال دیا گیا۔ پھر ایک نے کہا، ان کا سینہ سی دو۔ تو انہوں نے میرا سینہ سی دیا۔ پھر انہوں نے میرے کندھوں کے درمیان مہرِ نبوت کو رکھ دیا۔ میں یہ تمام واقعہ دیکھ رہا تھا۔[105]

تقریباً ایسا ہی مضمون عتبہ بن عبد السلمی رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن ہے۔[106]

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے بھی شقِ صدر کا واقعہ روایت کیا ہے اور اس میں تصریح ہے کہ وہ دو

104...روح المعانی، مریم، تحت الآیۃ:30

105...مسند امام احمد بن حنبل، حدیث:13247

106...مسند امام احمد بن حنبل، حدیث:13248

فرشتے حضرت جبریل علیہ السلام اور حضرت میکائیل علیہ السلام تھے۔ حافظ ہیثمی نے اس حدیث کے راویوں کو ثقہ قرار دیا ہے۔(107)

ہمارے آقا و مولیٰ، امامُ الانبیاء ﷺ منصبِ نبوت پر کب فائز ہوئے؟ اس بارے میں امام ترمذی رحمہ اللہ نے صحیح سند سے درج ذیل حدیث روایت کی ہے۔

نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا گیا: مَتٰی وَجَبَتْ لَکَ النُّبُوَّۃُ۔ یارسول اللہ ﷺ! آپ کے لیے نبوت کب ثابت ہوئی؟ رحمتِ عالم نورِ مجسم ﷺ نے ارشاد فرمایا: {وَاٰدَمُ بَیْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ} "اُس وقت جب کہ آدم علیہ السلام روح اور جسم کے درمیان تھے"۔(108)

"امام تقی الدین سبکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جس نے اس حدیث کا یہ مطلب بیان کیا کہ حضور ﷺ علمِ الٰہی میں نبی تھے، وہ اس حدیث کے معنی نہیں سمجھا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا علم تو تمام اشیاء کو محیط ہے (یعنی علمِ الٰہی میں تو تمام انبیاء ہی نبی تھے پھر اس میں حضور کی کیا خصوصیت ہوئی) پس نبی کریم ﷺ کو اُس وقت نبوت سے موصوف کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کی نبوت اُس وقت ثابت ہو چکی تھی۔

اسی لیے حضرت آدم علیہ السلام نے عرش پر آپ کا نام یوں لکھا دیکھا، محمدٌ رَّسولُ اللہ۔ محمد اللہ کے رسول ہیں۔... لہٰذا ضروری ہے کہ رسول کریم ﷺ کی اس خصوصیت کو ثابت اور متحقق مانا جائے۔ اسی بناء پر حضور ﷺ نے اپنی امت کو اس خصوصیت سے آگاہ فرما دیا تاکہ امت کو آپکے اس مرتبہ کی معرفت حاصل ہو جو اللہ کے نزدیک آپ کو حاصل ہے، پھر انہیں اس معرفت کے ذریعے بھلائی ملے"۔(109)

امام بخاری و امام مسلم کے استاذُ الاستاذ اور امام احمد بن حنبل کے استاذ امام عبد الرزاق رحمہم اللہ نے اپنی کتاب المصنف میں اس حدیث کو صحیح سند سے روایت کیا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بارگاہِ نبوی میں عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے کسے پیدا فرمایا؟ نورِ مجسم ﷺ نے فرمایا:

107... دلائل النبوۃ، ص 351

108... ترمذی، کتاب المناقب، حدیث: 3609

109... خصائص الکبری، ص 211

"اے جابر! اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے تیرے نبی کے نور کو اپنے نور (کے فیض) سے پیدا فرمایا۔ پھر وہ نور جہاں خدا نے چاہا سیر کرتا رہا۔ اُس وقت نہ لوح تھی نہ قلم نہ جنت نہ دوزخ نہ فرشتے نہ آسمان نہ زمین نہ سورج نہ چاند نہ جن نہ انسان...الخ"۔

امام سیوطی رحمہ اللہ، امام سبکی رحمہ اللہ کا مزید کلام نقل کرتے ہیں،"پس نبی کریم ﷺ کی وہ حقیقت (یعنی نورِ محمدی) جو آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے موجود تھی، اللہ تعالیٰ نے اسے وصفِ نبوت عطا فرمایا اور اُسے اُسی وقت فیض عطا فرمایا تو آپ نبی ہوگئے۔ باری تعالیٰ نے آپ کا نام عرش پر لکھ دیا پھر ملائکہ اور دیگر مخلوق کو اس پر آگاہ فرمادیا تاکہ سب آپ کے عظیم مرتبہ کو پہچان لیں"۔ (110)

مذکورہ حدیث کے متعلق امام شعرانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضور ﷺ کو تمام انبیاء سے پہلے نبوت دی گئی۔ اور نبوت اُسی وقت ثابت اور متحقق ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر کی ہوئی شریعت کی معرفت حاصل ہوجائے۔ (الیواقیت والجواہر)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک اور حدیث پاک میں ارشاد ہے: كُنْتُ اَوَّلَ النَّبِيِّيْنَ فِي الْخَلْقِ وَاٰخِرَهُمْ فِي الْبَعْثِ۔ "میں تخلیق میں سب نبیوں سے پہلا ہوں اور بعثت کے لحاظ سے آخری ہوں"۔ (111)

خاتم الانبیاء ﷺ کو نبوت بلکہ ختمِ نبوت کا مرتبہ آدم علیہ السلام کی پیدائش سے قبل مل چکا تھا اگرچہ اس منصب ومرتبہ کا ظہور عمرِ مبارک کے چالیسویں سال میں ہوا۔ بقول شخصے:

"یہ تأخر مرتبۂ ظہور میں ہے، مرتبۂ ثبوت میں نہیں"۔ (نشرُ الطیب)

ان تمام دلائل وبراہین سے ثابت ہوگیا کہ ہر نبی پیدائشی نبی ہوتا ہے البتہ وہ نبوت کا اعلان حکمِ الٰہی کے مطابق کرتا ہے۔ نیز ہمارے آقا ومولیٰ حبیبِ کبریاء ﷺ سب انبیاء سے قبل منصبِ نبوت پر فائز ہوئے اور سب سے آخر میں مبعوث ہوئے۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ:

رحمتِ عالم نورِ مجسم ﷺ غارِ حرا میں مصروفِ عبادت تھے کہ فرشتے نے آکر عرض کی، پڑھیے۔ تو

110...خصائص الکبریٰ، ص239
111...دلائل النبوۃ، ص289

آپ ﷺ نے انکار فرمایا۔ ایسا تین بار ہوا۔ دراصل آپ نے نہ چاہا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں خلل آئے۔ جب چوتھی بار فرشتے نے کہا، "اپنے رب کے نام سے پڑھیے"۔ تو آپ اس طرف متوجہ ہوئے کہ جس ذات کی تجلیات کے مشاہدے میں اور جس کی محبت و عبادت میں، مَیں مستغرق ہوں، یہ بھی تو اسی کا ذکر کر رہا ہے۔ پھر آپ نے وہ آیات تلاوت فرمائیں۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ "بِاسْمِ رَبِّکَ" میں باء استعانت کے لیے ہے۔ گویا آپ نے فرشتے سے فرمایا: میں تیری قوت اور تیرے پڑھانے سے پڑھنے والا نہیں ہوں۔ اس پر جبریل علیہ السلام نے مذکورہ آیات تلاوت کیں۔ گویا یوں عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! آپ اپنے رب کی مدد اور قوت سے پڑھیے۔ آپ کا رب فرماتا ہے، اے حبیب! میرا نام لے کر پڑھو۔ پڑھنا تمہارا کام ہے اور تمہارے سینے کو علوم و معارف سے لبریز کر دینا میرا کام ہے۔

یہاں "بسم اللہ" نہیں فرمایا بلکہ "بِاسْمِ رَبِّکَ" فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ "اللہ" باری تعالیٰ کا ذاتی نام ہے۔ جبکہ معرفتِ ذات کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے آثار و صفات میں غور و فکر کیا جائے۔ صفاتِ باری تعالیٰ میں انسانوں سے سب سے زیادہ نمایاں تعلق رکھنے والی صفات تخلیق اور ربوبیت کی صفات ہیں۔

یہ صفات اس پر شاہد ہیں کہ ہر مخلوق پہلے معدوم تھی۔ اسے تخلیق کیا گیا اور پھر اس کی پرورش کی گئی۔ نیز ہر مخلوق کا وجود اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا کوئی خالق بھی ہے اور جو خالق ہے وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اُس کی صفات زوال پذیر نہیں اور اس میں کوئی نقص یا عیب نہیں۔ لہٰذا ذاتِ الٰہی کی معرفت کے لیے معرفتِ ربوبیت پہلی شرط ہے۔[112]

"بِاسْمِ رَبِّکَ" فرمانے کا ایک مفہوم یہ ہے کہ اپنے رب کے نام کی مدد سے قرآن پڑھو۔ یعنی دین و دنیا کے تمام کاموں میں اللہ تعالیٰ کے نام کو سہارا بناؤ۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اس عمل کو محض اپنے رب کے لیے کرو۔ گویا جب عبادت اللہ تعالیٰ کے لیے ہو گی تو اس میں شیطان تصرف نہ کر سکے گا۔[113]

112... تفسیر مظہری، علق، تحت الآیۃ: 1

113... تفسیر کبیر، علق، تحت الآیۃ: 1

آج تعلیم تو عام ہو رہی ہے مگر انسانیت زوال پذیر ہے۔ سبب یہ ہے کہ علم کا حصول محض رزق حاصل کرنے کے لیے یا کسی اور دنیاوی مفاد کی غرض سے ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی یاد حصولِ علم کا جزو بن جائے اور ہر لمحہ بندہ یہ تصور رکھے کہ اس کا رب اسے دیکھ رہا ہے، تو یقیناً کردار میں پاکیزگی اور سیرت میں حسن پیدا ہو گا۔

شانِ ربوبیت کا تقاضا ہے کہ مخلوق کو کم درجہ سے اعلیٰ درجہ تک لے جایا جائے۔ یہاں لفظ ''رب'' سے اس طرف اشارہ ہے کہ آپ کا رب آپ کی مکمل تربیت فرمائے گا اور آپ کو نبوت ورسالت کے اعلیٰ درجات تک پہنچائے گا۔

جب جبریل علیہ السلام نے کہا، اپنے رب کے نام سے پڑھیے۔ تو نبی کریم ﷺ نے یہ نہ دریافت فرمایا کہ رب کون ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آقا و مولیٰ ﷺ کو پہلے ہی اپنے رب کی معرفت حاصل تھی ورنہ آپ ضرور دریافت فرماتے۔ پھر قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ پہلی آیت میں ہی ربوبیت کی اضافت ونسبت اپنے محبوب کی طرف فرمائی، یہ حضور ﷺ کی شانِ محبوبیت پر روشن دلیل ہے۔ اس سورت میں تین بار صفت ربوبیت کا ذکر آیا ہے اور ہر جگہ ''ربک'' ارشاد ہوا ہے۔

ضمناً عرض کر دوں کہ سورۃ النساء آیت ۶۵ میں ''وَرَبِّکَ'' ارشاد ہوا ہے جس کے معنی ہیں، ''(اے محبوب!) تمہارے رب کی قسم''۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی قسم ارشاد فرمائی مگر اپنا نام نہ ذکر فرمایا بلکہ محبوب کی طرف نسبت فرمائی۔

کیا وجد آفریں کلام ہے اور کیا محبت بھرا انداز ہے۔ اس کلام کا کیف وسُرور اور لطف ولذت وہی محسوس کر سکتے ہیں جن کے دل میں عشقِ حقیقی کی شمع فروزاں ہو۔

یہاں بھی وہی انداز ہے۔ اس اندازِ تخاطب کی ایک حکمت یہ ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ ''رب تعالیٰ کو مانو اور مصطفی ﷺ کے وسیلے سے مانو''۔ اسی لیے بارگاہِ رسالت میں عاشقِ صادق امام احمد رضا محدث بریلوی رحمہ اللہ عرض کرتے ہیں،

وہی رب ہے جس نے تجھ کو ہمہ تن کرم بنایا

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اے حبیب! تو میرے لیے ہے اور میں

تیرے لیے ہوں"۔اس کی تائید اس آیت کریمہ سے بھی ہوتی ہے،

{مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ}

"جس نے رسول کا حکم مانا بے شک اس نے اللہ کا حکم مانا"۔(پ5،نساء:80)

ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا اپنی ذاتِ اقدس کی اضافت اپنے بندے کی طرف کرنا اس سے احسن ہے کہ بندے کی نسبت اس کی طرف ہو۔[114]

حضور ﷺ کی محبوبیت پر امام رازی رحمہ اللہ نے جس آیت کو دلیل بنایا ہے اس طرح کی کئی آیات سورۃ الضحیٰ کی تفسیر میں ایک جگہ جمع کر دی گئی ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ جلّ جلالہٗ نے اپنی ذات کو دیگر ذوات سے ممتاز کرنے کے لیے صفتِ خالقیت ذکر فرمائی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اس صفت میں کسی اور کی شرکت محال ہے۔اسی سے علماء نے استدلال کیا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی خالق نہیں، یہ اس کی صفتِ خاص ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ:

پہلی آیت میں "خَلَقَ " مطلقاً فرمایا گیا یعنی ارشاد ہوا: "پیدا کیا"۔ یہ نہیں فرمایا کہ کیا پیدا کیا۔ اس لیے معنی یہ ہوئے کہ ساری مخلوق کو پیدا کیا۔ دوسری آیت میں بطورِ مخلوق انسان کا ذکر کیا گیا۔

اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اجزاء کے اعتبار سے انسان کامل ترین مخلوق ہے کیونکہ جو چیز عالَمِ کبیر میں ہے وہ انسان میں موجود ہے۔ اسی لیے انسان کو عالَمِ صغیر بھی کہا جاتا ہے۔انسان کی تخلیق کا ذکر گویا یہ ارشاد فرمانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عالَمِ خَلق اور عالَمِ اَمر کی تمام مخلوق کو پیدا کیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس میں رب تعالیٰ کی تجلیات کو اخذ کرنے کی استعداد موجود ہے، اس لیے یہ معرفت کا مستحق ہے اور معرفتِ الٰہی ہی کائنات کی تخلیق کا مقصود ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

{وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ} "اور میں نے جن اور آدمی اتنے ہی (اسی لیے) بنائے کہ میری بندگی کریں"۔(پ27،ذاریات:56)

114... تفسیر کبیر، نساء، تحت الآیۃ:80

اس آیت میں لِیَعْبُدُوْنِ کا معنی ہے، لِیَعْرِفُوْنِ۔ کہ وہ مجھے پہچانیں۔

حدیثِ قدسی ہے، لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ وَلَمَا اَظْھَرْتُ الرَّبُوْبِیَّۃَ۔ یعنی ”اے حبیب! اگر تمہیں پیدا نہ کرتا تو کائنات پیدا نہ کرتا اور نہ ہی اپنا رب ہونا ظاہر کرتا“۔

دوسری حدیثِ قدسی میں رب تعالیٰ کا ارشاد ہے: کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیاً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ۔ ”میں مخفی خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں تو میں نے مخلوق کو پیدا کیا“۔

یہاں مخلوق سے مراد انسان ہے اور اس کی عظمت و شرافت کا اظہار مقصود ہے۔ یہ احتمال بھی موجود ہے کہ اس آیت میں ’الانسان‘ سے مراد حضورِ اکرم ﷺ کی ذات ہو۔ آپ کا ذکر اس لیے فرمایا تاکہ آپ کے خصوصی فضل و شرف کا اظہار ہو۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ان آیات میں آپ ﷺ ہی مخاطب ہیں۔

مِنْ عَلَقٍ:

”عَلَق“ کا معنی ہے ”جما ہوا خون“۔ یہ تخلیقِ انسانی کا درمیانی مرحلہ ہے اور درمیانی مرحلہ کا ذکر ہونا سب مراحل کی طرف اشارہ ہے۔ سب سے پہلے انسان کی غذا سے خون بنتا ہے پھر خون سے مادّۂ تولید بنتا ہے پھر اس سے رحم میں نُطفہ قرار پاتا ہے۔ پھر چالیس دن بعد نطفہ، عَلَقہ یعنی جما ہوا خون بنتا ہے، پھر چالیس دن گزرنے کے بعد گوشت کی شکل اختیار کرتا ہے، پھر چالیس دن بعد اس میں روح پھونکی جاتی ہے، اور پھر مخصوص مدت گزار کر انسان پیدا ہوتا ہے۔ ارشاد ہوا:

{ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ}

”پھر ہم نے اس پانی کی بوند کو خون کی پھٹک کیا، پھر خون کی پھٹک کو گوشت کی بوٹی، پھر گوشت کی بوٹی کو ہڈیاں، پھر ان ہڈیوں پر گوشت پہنایا، پھر اسے اور صورت میں اُٹھان دی، تو بڑی برکت والا ہے اللہ سب سے بہتر بنانے والا“۔ (پ18، مومنون:14)

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ:

اس آیت میں دوسری بار پڑھنے کا حکم تاکید کے لیے ہے۔ یا پہلے ”اِقْرَاْ“ سے مراد ہے ”اپنے لیے پڑھو“۔ اور دوسرے ”اِقْرَاْ“ سے مراد ہے، ”دوسروں کو تبلیغ و تعلیم کے لیے پڑھو“۔

"الْاَکْرَمُ" یا تو رَبُّکَ کی صفت ہے یا اس کی خبر ہے۔ "'اکرم' میں کریم سے زیادہ مبالغہ ہے۔ اکرم اُسے کہتے ہیں جو ہر کریم سے بڑھ کر ہو کیونکہ "اکرم" بغیر کسی غرض کے احسان فرماتا ہے اور اس قدر زیادہ احسانات کرتا ہے کہ اس کے احسانات کو مقدار اور کیفیت کے اعتبار سے شمار نہیں کیا جا سکتا۔

ہر مخلوق کو زندگی کی بقا کے لیے جو جو چیزیں درکار ہیں، رب کریم نے ہر ہر چیز اسی مخلوق کی ضرورت کے اعتبار سے مہیا فرما دی ہے۔ ہوا، فضا، پانی، مٹی، کھیت، صحرا، بادل، پہاڑ، چشمے، دریا، سورج، چاند، روشنی، حرارت، غرض یہ کہ کائنات میں جس طرف نگاہ ڈالیے، رب کریم کی شانِ ربوبیت کے جلوے نظر آرہے ہیں۔ ارشاد ہوا: {وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ○ وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ} "اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین والوں کو۔ اور خود تم میں، تو کیا تمہیں سوجھتا نہیں"۔ (پ27، ذاریات:20-21)

یعنی زمین و آسمان میں، تمہاری پیدائش اور تمہارے ظاہر و باطن میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ایسے بیشمار عجائب و غرائب ہیں جن سے اُس کی شان معلوم ہوتی ہے۔

درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کریم ہے۔ اس کی ذات وصفات میں کوئی شریک نہیں۔ کریم، رحیم، سمیع، بصیر یا اس جیسی دوسری صفات کا جب اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور پر اطلاق کیا جائے تو وہ بطور مجاز ہوتا ہے کیونکہ دوسرا شخص تو صرف اللہ تعالیٰ کی صفت کرم اور رحمت وغیرہ کا مظہر یا آئینہ ہوتا ہے۔[115]

توحید و شرک کے متعلق تفصیلی گفتگو اِنْ شاءاللہ سورۃ الاخلاص کے تحت تحریر ہوگی۔

الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ:

اس سورت کے آغاز میں رب کریم نے دوبار پڑھنے کا حکم ارشاد فرما کر مسلمانوں کو علم و دانش کی درسگاہ کا طالبِ علم بننے اور جہالت کے اندھیروں سے نکل کر علم کی روشنی کی طرف آنے کا حکم دیا ہے۔ قرآن حکیم علم کی برتری کا علمبردار ہے اور علم مومن کا ہتھیار ہے۔ علم کے بغیر دنیا میں کوئی کمال حاصل نہیں ہوتا۔

115... تفسیر مظہری، ذاریات، تحت الایۃ:21

اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی شے علم سے بہتر ہوتی تو ملائکہ کے مقابلے میں حضرت آدم علیہ السلام کو دی جاتی، جب فرشتوں کی تسبیح وعبادت حضرت آدم علیہ السلام کے علمِ اَسماء کے برابر نہ ٹھہری تو علمِ دین کا کس قدر اعلیٰ مقام ہوگا!! ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

{وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓىٕكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ}

"اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام (اشیاء کے) نام سکھائے پھر سب (اشیاء) کو ملائکہ پر پیش کر کے فرمایا، سچے ہو تو ان کے نام تو بتاؤ"۔(پ1، بقرہ:31)

قرآن کریم میں یہ بھی فرمایا گیا کہ جاہل اور عالم ہرگز برابر نہیں ہیں۔ ارشاد ہوا:

{قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ اِنَّمَا یَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ}

"تم فرماؤ کیا برابر ہیں جاننے والے اور انجان، نصیحت تو وہی مانتے ہیں جو عقل والے ہیں"۔(پ23، زمر:9)

مزید فرمایا، {یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ} "اللہ تمہارے ایمان والوں کے اور اُن کے جن کو علم دیا گیا، درجے بلند فرمائے گا"۔(پ28، مجادلہ:11)

علم کی اہمیت ہی کی بناء پر سرکارِ دوعالم، رحمتِ عالم ﷺ نے فرمایا: "علمِ دین سیکھنا ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے"۔ (116)

معلوم ہوا کہ دینی علم کا سیکھنا سکھانا، نوافل پڑھنے اور دیگر نفل عبادات سے افضل ہے کیونکہ نوافل اور تسبیحات تو نفل ہیں مگر علمِ دین سیکھنا فرض ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ایک لمحہ رات میں علمِ دین پڑھنا پڑھانا ساری رات عبادت سے افضل ہے۔ (117)

ایک دن رسول کریم ﷺ مسجد میں تشریف لائے تو دیکھا کہ وہاں صحابہ کرام دو گروہوں کی صورت میں بیٹھے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

116...ابن ماجہ، باب فضل العلماء۔۔، حدیث:224

117...مشکاۃ المصابیح، کتاب العلم، حدیث:2364

دونوں مجلسیں اچھی ہیں اور ایک دوسری سے افضل ہے۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں اور اس کی طرف رغبت کرتے ہیں، وہ چاہے تو ان کو دے اور چاہے تو منع فرما دے۔ اور یہ دوسری مجلس والے علم سیکھتے ہیں اور دوسروں کو سکھاتے ہیں، یہ افضل ہیں۔ اور میں بھی معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

یہ فرما کر حضور ﷺ اس مجلس میں تشریف فرما ہو گئے۔ (118)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ کا بڑا اکرم ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو ان چیزوں کا علم دیا جن کو وہ نہ جانتے تھے۔ اور ان کو جہالت کے اندھیروں سے علم کی روشنی کی طرف نکالا اور علمِ کتابت کی ترغیب دی۔

اس میں بیشمار فائدے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا۔ تمام علوم واحکام کی تدوین، اولین وآخرین کی تاریخ اور اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتابیں سب قلم ہی کے ذریعے لکھی گئیں۔ اگر قلم نہ ہو تو دنیا کے تمام کام معطل ہو جائیں"۔

قلم اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے۔ باری تعالیٰ نے {وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ} فرما کر قلم اور اس کی تحریروں کی قسم ارشاد فرمائی تاکہ مسلمان علم کے حصول سے اور قلم کی طاقت سے غافل نہ رہیں اور اپنے سینوں کو علم وحکمت سے لبریز کرنے کی مبارک سعی سے تھک نہ جائیں۔

مبارک ہیں وہ ہستیاں جنھوں نے اپنے اقلام سے قرآن کریم اور اس کی تفاسیر لکھیں، احادیثِ رسول ﷺ اور آثارِ صحابہ محفوظ کیے، فقہاء کے اقوال اور فتاویٰ تحریر کیے اور اپنی تحریروں کے ذریعے محبت وعظمتِ مصطفی ﷺ کا نور تقسیم کیا۔ یہی وہ نفوسِ قدسیہ ہیں جنھوں نے اپنے قلم کی سیاہی سے دینِ حق کو روشن کر دیا۔

سورۃ العلق کی دوسری آیت میں انسان کی ادنیٰ حالت بیان ہوئی اور پھر شانِ کریمی کے ذکر کے بعد آخری حالت علم والی بیان فرمائی۔ گویا رب تعالیٰ نے فرمایا:

میں نے انسان کو ادنیٰ سے اعلیٰ مرتبہ تک پہنچایا۔ تخلیق کرنا، زندگی دینا، قدرت ورزق دینا کرم

118...مشکاۃ المصابیح، کتاب العلم، حدیث: 2365

اور ربوبیت ہے لیکن "اکرم" وہ ذات ہے جس نے تمہیں علم عطا کیا کیونکہ علم انتہائی افضل واشرف صفت ہے۔(119)

اس آیت سے علم اور قلم دونوں کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔لوگوں کو قلم جیسی بے جان چیز سے علم کی دولت سے مالا مال کر دینا بلاشبہ رب تعالیٰ کی شانِ کرم ہی کا جلوہ ہے۔ہاں! جس قادرِ مطلق نے انسانوں کو قلم اور معلمین کے ذریعے علم عطا کیا ہے، اُس کے لیے کیا مشکل ہے کہ اپنے حبیب ﷺ کو قلم اور معلم کے بغیر علوم ومعارف کا سرچشمہ اور منبع بنا دے۔پس اس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ:

"اللہ تعالیٰ نے ہر پڑھنے والے کو قلم کے ذریعے علم سکھایا، مگر اے حبیب ﷺ! آپ کا رب آپ کو قلم کی تحریر کے بغیر ہی علم کا سمندر بنا دے گا۔اور اس کی یہ عطا اُس کا بہت بڑا اکرم ہے"۔(120)

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ:

قلم کے ذریعے علم سکھانے کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا، "آدمی کو سکھایا جو نہ جانتا تھا"۔یعنی انسان کو قلم کے ذریعے بھی اور قلم کے بغیر بھی جو کچھ سکھایا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی نے سکھایا ہے۔

تعلیم کا ایک طریقہ یہ ہے کہ کسی درسگاہ میں معلم و کتاب کے ذریعے سیکھا جائے۔اس طریقۂ تعلیم میں قلم کی بڑی اہمیت ہے جو مذکور ہوئی۔

تعلیم کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انسان ظاہری وباطنی حواس اور عقل وخرد کے ذریعے کسی قلم یا معلم کے بغیر فکر و نظر سے علم حاصل کرے۔یہ صلاحیتیں رب تعالیٰ کی طرف سے سب کو عطا ہوتی ہیں۔ارشاد ہوا:"پھر اس(انسان) کی بدکاری اور اس کی پرہیزگاری اس کے دل میں ڈالی"۔(پ30، شمس:8)

تعلیم کا تیسرا طریقہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کرام اور اولیائے کاملین کے لیے مخصوص ہے۔اس طریقۂ تعلیم میں کوئی انسان معلم نہیں ہوتا بلکہ رب تعالیٰ خود علمِ لدُنی تعلیم فرماتا ہے۔اس میں وحی انبیاء کرام کے لیے مخصوص ہے جبکہ الہام، سچے خواب اور فراست وغیرہ سے خاص اولیاء کرام کو رحمتِ عالم ﷺ کے وسیلے سے فیض ملتا ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہوا:{وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا}

119... تفسیر کبیر، علق، تحت الآیۃ:2

120... تفسیر روح المعانی

"اور اُسے اپنا علمِ لدُنی عطا کیا"۔(پ15، کہف:65)

آیتِ مذکورہ {عَلَّمَ الْاِنْسَانَ} میں انسان سے مراد، ایک قول کے مطابق ہر انسان ہو سکتا ہے، کیونکہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے،

{وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ}(پ14، نحل:78)

"اور اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے پیدا کیا کہ کچھ نہ جانتے تھے، اور تمہیں کان اور آنکھ اور دل دیے کہ (علم سیکھو اور) تم احسان مانو"۔

دوسرا قول یہ ہے کہ انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں علمُ الاسماء (ناموں کا علم) سکھایا۔(پ1، بقرہ:31)

تیسرا قول یہ ہے کہ انسان سے مراد ہمارے آقا و مولیٰ سیدنا محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کیونکہ آپ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے،

{وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۚ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا}(پ5، نساء:113)

"اور اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت اُتاری، اور تمہیں (وہ سب کچھ) سکھا دیا جو کچھ تم نہ جانتے تھے، اور اللہ کا تم پر بڑا فضل ہے"۔(تفسیر قرطبی)

یہ بات قابلِ غور ہے کہ سورۃ العلق کی آیت ۵ میں عَلَّمَ کو قلم کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا حالانکہ اس سے قبل آیت ۴ میں قلم کے ذریعے علم سکھانا مذکور ہے۔ اور قلم سے دیا ہوا تمام علم لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ اب آیت ۵ کا مفہوم یہ ہوا کہ انسان کو وہ علم بھی عطا ہوا جو قلم کے ذریعے ملتا ہے اور وہ بھی جو قلم کے علاوہ ہے۔

قرآن مجید میں ہے کہ کوئی چھوٹی بڑی، خشک و تر چیز ایسی نہیں جو لوحِ محفوظ میں تحریر نہ ہو۔{وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ}(پ7، انعام:59)

جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا:{وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا}

اللہ نے آدم علیہ السلام کو تمام نام سکھائے اور پھر فرشتوں سے وہ نام پوچھے تو وہ بتا نہ سکے۔ اگر آدم

علیہ السلام کا علم وہی تھا جو لوحِ محفوظ میں لکھا ہے تو پھر فرشتے جواب کیوں نہ دے سکے۔ معلوم ہوا کہ آدم علیہ السلام کو دیا ہوا علم لوحِ محفوظ میں تحریر علم سے زیادہ ہے۔

بقول امام شرف الدین بوصیری رحمہ اللہ،

فَاِنَّ مِنۡ جُوۡدِکَ الدُّنۡیَا وَضَرَّتَھَا وَمِنۡ عُلُوۡمِکَ عِلۡمَ اللَّوۡحِ وَالۡقَلَمِ

”یارسول اللہ ﷺ! دنیا اور آخرت آپ کی سخاوت کا ایک حصہ ہیں، اور لوح و قلم کا علم آپ کے علوم کا ایک حصہ ہے“۔(قصیدہ بُردہ شریف)

دنیا اور آخرت کی کوئی چیز ایسی نہیں جس کا ذکر قرآن میں نہ ہو۔ ارشاد ہوا:

{وَنَزَّلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ تِبۡیَانًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ}(پ14، نحل:89)

”اور ہم نے تم پر یہ قرآن اتارا کہ ہر چیز کا روشن بیان ہے“۔

یعنی تمام علوم اور مَا کَانَ وَمَا یَکُوۡن یعنی جو کچھ ہو چکا اور جو کچھ آئندہ ہو گا، سب کا اِس میں بیان ہے اور جمیع اشیاء کا اس میں علم ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے، اگر میرے اونٹ کی رسی گم ہو جائے تو میں قرآن کریم کے ذریعے اسے تلاش کرلوں گا۔

علوم و معارف کی ایسی جامع کتاب رب تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو سکھائی۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے،{اَلرَّحۡمٰنُ o عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ}

”رحمان نے اپنے محبوب کو قرآن سکھایا“۔(پ27، رحمٰن:1-2)

اور اِس شان سے سکھایا کہ {سَنُقۡرِئُکَ فَلَا تَنۡسٰۤی}

”اب ہم تمہیں پڑھائیں گے کہ تم نہ بھولو گے“۔(پ30، الاعلیٰ:6)

جب استاد کامل و اکمل ہے، شاگرد کامل و اکمل ہے اور پڑھائی جانے والی کتاب بھی کامل و اکمل ہے تو پھر یقیناً مصطفیٰ کریم ﷺ کا مقدس سینہ تمام علوم و معارف کا گنجینہ ہے۔ بالفاظِ دیگر جب تمام الہامی علوم اور ساری گذشتہ و آئندہ باتوں کا علم قرآن کریم میں ہے اور قرآنِ کریم سینۂ مصطفیٰ ﷺ میں ہے، تو پھر تمام علوم سینۂ مصطفیٰ ﷺ میں کیوں نہیں؟

ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

{عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًاo اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ}

”غیب کا جاننے والا (اللہ ہے)،تو اپنے غیب پر کسی کو مسلط نہیں کرتا سوائے اپنے پسندیدہ رسولوں کے“۔(پ27،جن:26-27)

”سیدُ الرسل خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ مرتضیٰ رسولوں میں سب سے اعلیٰ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام اشیاء کے علوم عطا فرمائے جیسا کہ صحاح کی معتبر احادیث سے ثابت ہے اور یہ آیت حضور ﷺ کے اور تمام مرتضیٰ رسولوں کے لیے غیب کا علم ثابت کرتی ہے“۔[121]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ ہمارے درمیان تشریف لائے اور آپ نے ابتدائے تخلیق سے خبریں بیان کرنا شروع کیں یہاں تک کہ جنتیوں کے جنت میں جانے اور جہنمیوں کے جہنم میں جانے تک کے تمام حالات وواقعات بیان فرما دیے۔ جس نے یاد رکھا، یاد رکھا اور جس نے بھلا دیا، بھلا دیا۔[122]

اوّلُ الذکر حدیث کے اس حصے پر غور کیجیے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے حضور ﷺ کو تین بار اپنے سینے سے لگا کر اس قدر دبایا کہ حضورِ اکرم ﷺ کو مشقت محسوس ہوئی۔ یہ دبانا یقیناً رب تعالیٰ کے حکم سے تھا۔ اس کی ایک حکمت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اس طرح نبی کریم ﷺ کو ملکوتی صفات کے ساتھ ایک خاص مناسبت حاصل ہو جائے اور آپ ﷺ کے لیے وحی کا برداشت کرنا آسان ہو جائے۔

آیت ٦ تا آیت ٨:

ارشاد ہوا:”ہاں ہاں! بیشک آدمی سرکشی کرتا ہے، اس پر کہ اپنے آپ کو غنی سمجھ لیا، بیشک تمہارے رب ہی کی طرف پھرنا ہے“۔(پ30،علق:6-8)

سورۃ العلق کی آیت ٦ سے آخر تک تمام آیات ابو جہل کے رَد میں نازل ہوئیں مگر ان سے وہ تمام انسان مراد ہو سکتے ہیں جن میں مذکورہ علامات پائی جائیں۔

سابقہ آیات میں بتایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ان باتوں کا علم دیا جنہیں وہ نہیں جانتا تھا۔ اس علم کا تقاضا تو یہ تھا کہ انسان عقل و فہم سے کام لے اور ہدایت کے راستے پر چلے، لیکن انسان مال

121...خزائن العرفان، جن، تحت الآیۃ:27

122...بخاری، کتاب بدء الخلق، حدیث:3192

ودولت اور آسائشوں کی وجہ سے سرکش ہوجاتا ہے اور وہ خود کو اپنے رب سے بے نیاز اور مستغنی سمجھ لیتا ہے۔ دراصل وہ یہ حقیقت بھول جاتا ہے کہ اسے مرنے کے بعد اپنے رب ہی کے پاس جانا ہے۔

یہاں انسان سے مراد وہ شخص ہے جو کفر اور تکبر میں حد سے گزر گیا۔(123)

قرآن حکیم میں کئی جگہ اس بات کا ذکر ہے کہ جب انسان خوشحال ہو جاتا ہے اور اسے مال ودولت اور دیگر نعمتیں حاصل ہوتی ہیں تو وہ اُس خوشحالی کو اپنی تدبیر وذہانت اور علوم وفنون میں مہارت کا نتیجہ سمجھ لیتا ہے۔ اور کہتا ہے،

{اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِیْ}(پ20، قصص:78)

"یہ تو مجھے ایک علم سے ملا ہے جو میرے پاس ہے"۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس انسان میں تکبر اور غرور پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ مال و دولت کی کثرت دیکھ کر دوسروں کو حقیر اور خود کو فرعون و قارون سمجھنے لگتا ہے۔

غیب بتانے والے آقا و مولیٰ ﷺ نے فرمایا: جس کے دل میں رائی کے برابر بھی تکبر ہو گا وہ جنت میں نہیں جائے گا۔ صحابہ نے عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! ہم میں سے ہر کوئی پسند کرتا ہے کہ اس کا لباس اچھا ہو، اس کا جوتا اچھا ہو۔ حضور ﷺ نے فرمایا: یہ تکبر نہیں، بلکہ حق کو ٹھکرا دینا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا تکبر ہے۔(124)

اس صورتحال میں اسے حق بات سمجھائی جائے تو وہ ٹھکرا دیتا ہے اور خالق ومالک کی بندگی چھوڑ کر نفسانی خواہشات کی بندگی میں لگا رہتا ہے۔ اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں حد سے تجاوز کر جاتا ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: "ہاں ہاں! بیشک آدمی سرکشی کرتا ہے، اس پر کہ اپنے آپ کو غنی سمجھ لیا، بیشک تمہارے رب ہی کی طرف پھرنا ہے"۔

اے کم عقل! تُو خود کو مجھ سے بے نیاز اور غنی سمجھتا ہے حالانکہ اگر تو غور کرے تو صرف مال ودولت اور آسائشوں کے حصول ہی میں نہیں بلکہ اپنی ہر ہر حرکت اور ہر ہر چیز میں تُو میرا محتاج ہے۔ (سورۃ الواقعہ کی آیات ۵۸ تا ۷۲ ملاحظہ فرمائیں)

123... تفسیر مظہری، علق، تحت الآیۃ:6

124... صحیح مسلم، کتاب الایمان، حدیث:91۔

اے ناسمجھ! یہ سرکشی کب تک؟ اگر تو ہزار سال بھی زندہ رہے تو بہرحال تیرا انجام تو موت ہی ہے۔ موت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا دنیا میں کوئی بھی منکر نہیں۔ تو جب تم مر وگے تو تمہیں دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور پھر تمہیں اپنے رب کے پاس اپنی سرکشی و نافرمانی اور اپنے ظلم و تکبر کا حساب دینا پڑے گا۔ ارشادِ ربانی ہے،

{وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ}

(پ13، ابراھیم:42)

”اور ہر گز اللہ کو بے خبر نہ جاننا ظالموں کے کام سے، (وہ) انہیں ڈھیل نہیں دے رہا ہے مگر ایسے دن کے لیے جس میں آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی“۔

رب تعالیٰ تمہارے کرتوتوں سے بے خبر نہیں، بے نیاز ہے۔ وہ کسی نافرمان کو نہ پکڑے تو اس کی شانِ بے نیازی، مگر جب پکڑلے تو کوئی چھڑا نہیں سکتا۔

{مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا}(پ12، ھود:56)

”کوئی چلنے والا نہیں جس کی پیشانی اس کے قبضۂ قدرت میں نہ ہو“۔

{اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ}(پ30، بروج:12)

”بیشک تیرے رب کی گرفت بہت سخت ہے“۔

{اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى} کا ایک مفہوم تو یہی ہے کہ مرنے کے بعد بارگاہِ الٰہی میں پیش ہو کر اپنے تمام اعمال کا حساب دینا ہے۔

اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اگر تم کسی مصیبت و مشکل میں پھنس جاؤ جس سے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہو، یا تم کسی آفت کی وجہ سے مفلس و محتاج ہو جاؤ تو پھر تمہیں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف آنا ہوگا اور اسی سے فریاد کرنی ہوگی۔ چونکہ ایسا شخص ناشکرا ہوتا ہے اس لیے جب مصیبت ٹل جائے تو پھر وہ اپنے رب سے غافل ہو جاتا ہے۔ ارشاد ہوا:

{وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ}

"اور جب آدمی کو تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں پکارتا ہے لیٹے اور بیٹھے اور کھڑے، پھر جب ہم اس کی تکلیف دور کر دیتے ہیں تو چل دیتا ہے گویا کبھی کسی تکلیف کے پہنچنے پر ہمیں پکارا ہی نہ تھا"۔(پ11،یونس:12،)

غرور و تکبر اور نافرمانی و سرکشی کا بہترین علاج یہی ہے کہ بندہ اس آیت کو بار بار تلاوت کرے اور اس پر غور کرے کہ بہر حال ایک دن اسے ضرور اپنے رب کے پاس حاضر ہونا ہے اور اپنے ہر عمل کا حساب دینا ہے۔ یہ تصور اسے راہِ ہدایت سے بھٹکنے اور تکبر و سرکشی سے محفوظ رکھے گا۔

آیت ۹ تا آیت ۱۴:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے، "بھلا دیکھو تو جو منع کرتا ہے بندے کو جب وہ نماز پڑھے۔ بھلا دیکھو تو اگر وہ ہدایت پر ہوتا یا پرہیز گاری بتاتا تو کیا خوب تھا۔ بھلا دیکھو تو اگر جھٹلایا اور منہ پھیرا تو کیا حال ہو گا۔ کیا نہ جانا کہ اللہ دیکھ رہا ہے"۔(پ30،علق:9-12،)

ان آیات کے شانِ نزول میں مفسرین فرماتے ہیں کہ ابو جہل نے اپنے ساتھیوں سے کہا، کیا محمد (ﷺ) تمہارے سامنے سجدہ کرتا ہے؟ انہوں نے کہا، ہاں۔ اس نے کہا، لات و عزیٰ کی قسم! اگر میں نے انہیں ایسا کرتے دیکھا تو میں (معاذ اللہ) ان کی گردن پاؤں سے کچل ڈالوں گا اور ان کا چہرہ خاک آلود کر دوں گا۔

پھر وہ اسی فاسد ارادے سے حضور ﷺ کے نماز پڑھتے وقت آیا اور گستاخی کی نیت سے قریب پہنچا۔ پھر اچانک اُلٹے پاؤں واپس بھاگا، دونوں ہاتھ آگے بڑھائے ہوئے جیسے کوئی کسی مصیبت کو روکنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھاتا ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا، اعضاء کانپنے لگے۔ لوگوں نے کہا، کیا ہوا؟ کہنے لگا، میں نے دیکھا کہ میرے اور محمد (ﷺ) کے درمیان ایک خندق ہے۔ جس میں آگ بھری ہوئی ہے اور دہشت ناک پرندے بازو پھیلائے ہوئے ہیں۔

سیدِ عالم ﷺ نے فرمایا، اگر وہ میرے قریب آتا تو فرشتے اس کا ایک ایک عضو جدا کر ڈالتے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔[125]

125... تفسیر جریر، علق، تحت الایۃ:9

ان آیات کی ایک تفسیر یہ ہے کہ، "بڑے تعجب کی بات ہے کہ منع کرنے والا بندے کو نماز سے روکتا ہے جبکہ جسے منع کیا جارہا ہے وہ ہدایت پر ہے اور تقویٰ کا حکم دیتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ہے کہ منع کرنے والا جھٹلانے والا اور ایمان سے منہ پھیرنے والا ہے"۔ (126)

دوسری تفسیر یہ ہے کہ "اے حبیب ﷺ! جب تم نماز پڑھتے ہو تو جو منع کرتا ہے کیا وہ سرکش نہیں؟ اگر ابو جہل اپنی سرکشی سے باز آکر ہدایت قبول کرلیتا اور دوسروں کو تقویٰ کی دعوت دیتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ اے حبیب ﷺ! اگر ابو جہل تمہیں جھٹلائے اور حق سے منہ پھیر لے تو وہ کیسے نجات پا سکتا ہے۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہا ہے"۔ (127)

ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کو عبادت سے روکنا ظلم و سرکشی ہے۔ سورۃ القلم میں ایک کافر کے دس عیب بیان کیے گئے ان میں ایک یہ ہے، {مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ} یعنی "بھلائی سے بڑا روکنے والا ہے"۔ اس میں اُن لوگوں کے لیے نصیحت ہے جو مسلمانوں کو دینی مجالس اور ذکرِ رسول ﷺ کی محافل سے روکتے ہیں۔ ایک اور جگہ ارشاد ہوا: {وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ}

"اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جو اللہ کی مسجدوں کو روکے اُن میں نامِ خدا لیے جانے سے"۔ (پ1، بقرہ:114)

جو بھی ایسا جرم کرے گا وہ ظالم و سرکش اور ابو جہل کی طرح مجرم قرار پائے گا۔ اگر یہ یقین پختہ ہو جائے کہ "اللہ دیکھ رہا ہے" تو پھر ظلم و سرکشی سے بندہ بچ سکتا ہے۔

آیت ۱۵ تا آیت ۱۹:

ارشاد ہوا: "ہاں ہاں! اگر باز نہ آیا تو ضرور ہم پیشانی کے بال پکڑ کر کھینچیں گے۔ کیسی پیشانی؟ جھوٹی، خطاکار۔ اب پکارے اپنی مجلس کو، ابھی ہم سپاہیوں کو بلاتے ہیں۔ ہاں ہاں! اس کی نہ سنو، اور سجدہ کرو اور ہم سے قریب ہو جاؤ"۔ (پ30، علق:15-19،)

نبی کریم ﷺ ایک دن مقامِ ابراہیم پر نماز ادا فرمارہے تھے کہ ابو جہل آگیا اور گستاخانہ لہجے میں

126... تفسیر جلالین، علق، تحت الآیۃ:9

127... تفسیر مظہری، علق، تحت الآیۃ:9

بولا، کیا میں نے تمہیں اس کام سے منع نہیں کیا تھا؟ حضور ﷺ نے اسے سختی سے جھڑک دیا۔ وہ بولا، تم مجھے جھڑکتے ہو۔ خدا کی قسم! میں تمہارے مقابل سوار اور پیدل جوانوں سے اس وادی کو بھر دوں گا کیونکہ مکہ میں مجھ سے زیادہ بڑے جتھے اور مجلس والا کوئی نہیں۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ (128)

ارشاد ہوا: کَلَّا۔ ''ہرگز نہیں''۔ اس ایک لفظ پر غور کیجیے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے گستاخِ رسول ﷺ، ابوجہل کی سرکشی اور گستاخی کی مذمت بھی فرمادی اور اپنے محبوب ﷺ کی مدد ونصرت کا اعلان بھی فرما دیا۔ ''ہاں ہاں! اگر وہ سرکشی اور گستاخی سے باز نہ آیا تو ضرور ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر کھینچیں گے''۔

رب تعالیٰ کا یہ فرمان غزوۂ بدر میں پورا ہوا جب ابوجہل کا جتھا اس کے کچھ کام نہ آیا اور اسے دو کمسن بچوں نے تلوار کے وار کر کے شدید زخمی کر دیا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس ملعون کو پڑا ہوا دیکھا تو اس کے سینے پر چڑھ گئے۔ وہ تکبر سے بولا، اپنے صاحب کو کہنا کہ مجھے زندگی میں بھی وہ سخت ناپسند تھے اور اب بھی ایسا ہی ہے۔ حضور ﷺ نے یہ سنا تو فرمایا، میری امت کا فرعون موسیٰ علیہ السلام کے فرعون سے سخت ہے کیونکہ اُس فرعون نے مرتے وقت کہا تھا، میں ایمان لاتا ہوں جبکہ ابوجہل کے تکبر میں اضافہ ہوا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس ملعون کی گردن کاٹی پھر اسے اُٹھا نہ سکے کیونکہ آپ بہت ضعیف ونحیف تھے۔ آپ نے ابوجہل کے کان میں سوراخ کیا اور اس میں رسی ڈال کر اسے گھسیٹتے ہوئے آقا و مولیٰ ﷺ کے پاس لے گئے۔

''الزَّبَانِيَةَ'' سے جہنم کے داروغہ اُنیس فرشتے مراد ہیں جن کا ذکر سورہ مدثر میں آیا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جن کی پکڑ بہت سخت ہے۔

دوبارہ ''کَلَّا'' ارشاد ہوا۔ اس کے معنی ہیں، یہ بات یقینی ہے۔ یعنی جو ارشاد ہوا ہے کہ اگر وہ اپنے لوگوں کو بلائے گا تو ہم عذاب کے فرشتوں کو بلا لیں گے۔ یہ بات ہو کے رہے گی۔ اے حبیب ﷺ! آپ اس جھوٹے خطاکار کی بات مت سنیں۔ آپ نماز و سجدہ میں مشغول رہیں اور رب

128... ترمذی، کتاب التفسیر، حدیث: 3359

تعالیٰ کا قرب حاصل کرتے رہیں۔

اگرچہ نماز و سجدہ کے ذریعے قربِ الٰہی پانا حضور ﷺ کے لیے ارشاد ہوا لیکن حضور کی محبوبیت بارگاہِ الٰہی میں ایسی ہے کہ جو حضور ﷺ کے اطاعت گزار ہیں، انہیں بھی آپ کے صدقے میں اس فیضان سے سجدہ میں قربِ الٰہی نصیب ہوتا ہے۔

سرکارِ دوعالم ﷺ نے فرمایا: بندہ جب سجدے کی حالت میں ہوتا ہے تو اپنے رب کے زیادہ قریب ہوتا ہے، اس حالت میں زیادہ دعا کیا کرو۔(129)

یہ بھی ارشاد ہوا: اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کی یہ حالت سب سے زیادہ محبوب ہے کہ وہ سجدہ کرے اور اس کی پیشانی خاک آلود ہو جائے۔(130)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے بارگاہِ نبوی میں عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ کو کون سا عمل زیادہ محبوب ہے؟ آقا و مولیٰ ﷺ نے فرمایا: کثرت سے سجدہ کیا کرو۔ اللہ تعالیٰ ہر سجدے کی وجہ سے تیرا ایک درجہ بلند کرے گا اور ایک گناہ معاف فرمادے گا۔

حضرت ربیعہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے خادمِ خاص ہیں۔ آپ حضور ﷺ کے وضو کے لیے پانی رکھا کرتے تھے۔ ایک بار سرکارِ دوعالم ﷺ نے خوش ہو کر ان سے فرمایا: مانگ لو جو تم چاہو۔ انہوں نے عرض کی، جنت میں آپ کی رفاقت چاہتا ہوں۔

آپ نے فرمایا: اور بھی کچھ مانگ لو۔ عرض کی، بس یہی کافی ہے۔ آپ نے فرمایا: اے ربیعہ! اپنے حق میں سجدوں کی کثرت سے مجھ سے تعاون کرنا۔(131)

امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس سورت کی آخری آیت پر سجدۂ تلاوت واجب ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ معظم ﷺ جب یہ آیت پڑھتے تو سجدۂ تلاوت ادا فرماتے۔(132)

---

129 ... مسلم، کتاب الصلوۃ، باب مایقول فی الرکوع والسجود، حدیث:482

130 ... معجم الاوسط، حدیث:3218

131 ... مسلم، کتاب الصلاۃ، باب فضل السجود والحث علیہ، حدیث:489

132 ... مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ، باب سجود

تفسیر سورۃ القدر

سورۃ القدر مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں پانچ آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ ۚ‌ۖ (۱) وَمَاۤ اَدۡرٰٮكَ مَا لَيۡلَةُ الۡقَدۡرِؕ (۲) لَيۡلَةُ الۡقَدۡرِ ۙ خَيۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَهۡرٍؕ‏ (۳) تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓٮِٕكَةُ وَالرُّوۡحُ فِيۡهَا بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ‌ۚ مِّنۡ كُلِّ اَمۡرٍ ۛۙ (۴) سَلٰمٌ ۛ هِىَ حَتّٰى مَطۡلَعِ الۡفَجۡرِ (۵)

”اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا (ہے)“

”بیشک ہم نے اسے شبِ قدر میں اتارا۔ اور تم نے کیا جانا کیا ہے شبِ قدر۔ شبِ قدر ہزار مہینوں سے بہتر (ہے)۔ اس میں فرشتے اور جبریل اترتے ہیں اپنے رب کے حکم سے ہر کام کے لیے۔ وہ سلامتی ہے صبح چمکنے تک“۔

لفظی ترجمہ:

اِنَّا	اَنۡزَلۡنَا	ہُ	فِیۡ	لَیۡلَةِ	الۡقَدۡرِ
بیشک	ہم نے اتارا	اسے	میں	رات	قدر (کی)

وَ	مَا	اَدۡرٰی	کَ	مَا	لَیۡلَةُ	الۡقَدۡرِ
اور	کیا	جانا	تم نے	کیا ہے	رات	قدر (کی)

لَیۡلَةُ	الۡقَدۡرِ	خَیۡرٌ	مِّنۡ	اَلۡفِ	شَهۡرٍ
رات	قدر (کی)	بہتر	سے	ہزار	مہینوں

التلاوۃ، حدیث: 575

تَنَزَّلُ	الْمَلٰٓئِكَةُ	وَ	الرُّوْحُ
اترتے ہیں	فرشتے	اور	جبریل

فِيْ	هَا	بِ	اِذْنِ	رَبِّ	هِمْ	مِّنْ	كُلِّ	اَمْرٍ
میں	اس	ساتھ	حکم	رب(کے)	اپنے	سے	ہر	کام

سَلٰمٌ	هِيَ	حَتّٰى	مَطْلَعِ	الْفَجْرِ
سلامتی(ہے)	وہ	تک	طلوع ہونے	فجر

ربط ومناسبت:

اس سے پچھلی سورت، سورۃ العلق قرآن مجید نازل ہونے کا آغاز ہے اور اس سورت میں بیان ہوا کہ نزولِ قرآن شبِ قدر میں ہوا ہے۔

سابقہ سورت میں عالمِ دنیا کی طرف نزولِ قرآن کا ذکر ہے تو اس سورت میں لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا کی طرف نزولِ قرآن کا بیان ہے۔

سورۃ العلق میں قرآن پڑھنے کا حکم دیا گیا پھر انسان پر مزید عنایات بیان ہوئیں جبکہ اس سورت میں ارشاد ہوا کہ قدر وشان والے قرآن کو پڑھو جسے ہم نے قدر والی رات میں اتارا، جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

سورۃ العلق میں پہلی وحی کا ذکر ہے اور وحی کے منکرین کے لیے عذاب کی وعید ہے جبکہ اس سورت میں پورے قرآن کے نزول کا بیان ہے اور اسے ماننے والوں کے لیے انعامات وثواب کی خوشخبری ہے۔

شانِ نزول:

حضور ﷺ نے جب پہلی امتوں کے لوگوں کی عمروں پر توجہ فرمائی تو آپ کو اپنی امت کے لوگوں کی عمریں کم معلوم ہوئیں۔ آپ کو خیال ہوا کہ جب گزشتہ لوگوں کے مقابلے میں ان کی عمریں کم ہیں تو

انکی نیکیاں بھی کم رہیں گی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو شبِ قدر عطا فرمائی جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔[(133)]

حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے بنی اسرائیل کے ایک نیک شخص کا ذکر فرمایا جس نے ایک ہزار ماہ تک راہِ خدا میں جہاد کے لیے ہتھیار اٹھائے رکھے۔ صحابہ کرام کو اس پر تعجب ہوا تو اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل فرمائی اور ایک رات یعنی شبِ قدر کی عبادت کو اس مجاہد کی ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر قرار دیا۔[(134)]

اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِيۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ:

ارشاد ہوا: ”بیشک ہم نے اسے شبِ قدر میں اتارا، اور تم نے کیا جانا! کیا ہے شبِ قدر۔ شبِ قدر ہزار مہینوں سے بہتر (ہے)“۔

اس مبارک رات کا نام ”لیلۃُ القدر“ رکھے جانے کی چند حکمتیں ہیں۔

”قدر“ کے ایک معنی عظمت و مرتبے کے ہیں۔ اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس رات کی عظمت و بزرگی اور اعلیٰ مرتبے کی وجہ سے اس کا نام لیلۃُ القدر یعنی اعلیٰ مرتبے والی رات رکھا گیا ہے۔ اس رات میں عبادت کا مرتبہ بھی بہت اعلیٰ ہے جو کوئی اس رات میں عبادت کرتا ہے وہ بارگاہ الٰہی میں قدر و منزلت والا ہو جاتا ہے اور اس رات کی عبارت کا مرتبہ یہ ہے کہ وہ ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

ایک اور حکمت لیلۃُ القدر کی یہ ہے کہ اس رات میں عظمت و بلند مرتبہ والی کتاب قرآنِ حکیم نازل ہوئی۔ وہ کتاب اور وحی لے کر آنے والا فرشتہ یعنی جبریل علیہ السلام بھی بلند مرتبے والا ہے اور وہ عظیم الشان کتاب جس محبوب رسول ﷺ پر نازل ہوئی وہ بھی بڑی عظمت اور بلند مرتبے والے ہیں۔ سورۃ القدر میں اس لفظ ”قدر“ کے تین مرتبہ آنے میں شاید یہی حکمت ہے۔

”قدر“ کے ایک معنی تقدیر کے بھی ہیں اور چونکہ اس رات میں بندوں کی تقدیر کا وہ حصہ جو اس رمضان سے اگلے رمضان تک پیش آنے والا ہوتا ہے، وہ متعلقہ فرشتوں کو سونپا جاتا ہے۔ اس لیے بھی اس رات کو شبِ قدر کہتے ہیں۔

133... تفسیر بغوی، القدر، تحت الآیۃ:4، 4/479

134... سنن الکبریٰ للبیہقی، تفسیر ابن جریر

"قدر" کے ایک معنی قدرت کے بھی ہیں۔ اس بناء پر شبِ قدر وہ رات ہے جس میں اللہ تعالیٰ اپنی قدرت اور اختیار سے سال بھر کے فیصلے اور احکامات فرشتوں کے سپرد فرماتا ہے۔

نزولِ قرآن:

اللہ تعالیٰ نے شبِ قدر کی بڑی فضیلت یہ بیان فرمائی کہ یہ نزولِ قرآن کی رات ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے، {اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ}

"بیشک ہم نے اسے برکت والی رات میں اتارا"۔ (پ25، دخان:3)

اس مبارک رات سے بعض مفسرین نے شبِ برأت مراد لی ہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ قرآن حکیم تیئس برس کی مدت میں بتدریج نازل ہوا نیز اس کا نزول ربیع الاول میں شروع ہوا۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ نے ان اقوال میں یوں تطبیق کی،

"شبِ قدر میں قرآن کریم لوحِ محفوظ سے یکبارگی آسمانِ دنیا پر بیتُ العزت میں نازل ہوا جبکہ اس کے نزول کا اندازہ اور لوحِ محفوظ کے نگہبانوں کو اس کا نسخہ نقل کر کے آسمانِ دنیا پر پہنچانے کا حکم اسی سال کی شب برأت میں ہوا۔

گویا قرآن حکیم کا نزولِ حقیقی ماہِ رمضان میں شبِ قدر کو ہوا اور نزولِ تقدیری اس سے پہلے شبِ برأت میں ہوا۔ اور سینۂ مصطفیٰ ﷺ پر نزولِ قرآن کا آغاز ربیع الاول میں پیر کے دن ہوا اور تیئس سال میں مکمل ہوا۔ [135]

لَیْلَةُ الْقَدْرِ خَیْرٌ۔۔۔:

شبِ قدر کی فضیلت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس رات کی عبادت کا ثواب ایک ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر ہے۔

یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ شبِ قدر کو ہزار مہینوں سے بہتر فرمایا گیا مگر یہ نہیں بتایا کہ ہزار ماہ سے کتنے زیادہ درجہ بہتر ہے۔ دس درجہ، سو درجہ یا ہزار درجہ یا اس سے بھی زیادہ۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ "الف شھر" سے مراد ہزار کا معین عدد نہیں ہے بلکہ مفہوم یہ ہے کہ شبِ قدر تمام زمانوں سے

135... تفسیر عزیزی، قدر، تحت الایۃ:1

افضل ہے۔یعنی زیادہ سے زیادہ تم جتنی مدت کا تصور کر سکتے ہو،شبِ قدر اس سے بھی افضل اور بہتر ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ایک ہزار مہینوں کے تراسی (۸۳) سال اور چار ماہ بنتے ہیں۔پس اگر کوئی شخص ۸۳ سال اور چار ماہ تک دن رات مسلسل اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے تو بھی ایک شبِ قدر کی عبادت اتنی طویل مدت کی عبادت سے افضل و بہتر ہے جب کہ اس طویل مدت میں کوئی شبِ قدر نہ ہو۔

اس طرح یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی شخص شبِ قدر میں عبادت کرے تو گویا اس نے ۸۳ سال اور چار ماہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزار دیے بلکہ اسے اس سے بہتر اجر ملے گا پھر اس پر بس نہیں اگر طلب سچی ہے تو ہر سال شبِ قدر نصیب ہو سکتی ہے گویا ذرا سی محنت اور لگن سے کئی ہزار مہینوں سے زیادہ کا اجر و ثواب حاصل کیا جاسکتا ہے۔

شبِ قدر اتنی زیادہ خیر و برکت والی رات ہے کہ غیب بتانے والے آقا و مولیٰ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ماہِ رمضان میں ایک رات ایسی ہے جو ہزار مہینوں سے افضل ہے جو اس رات سے محروم رہا وہ ساری خیر سے محروم رہا۔[136]

نورِ مجسم ﷺ کا ارشاد ہے،ماہِ رمضان میں ایک ایسی رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔جو اس رات سے محروم رہا وہ ساری بھلائی سے محروم رہا اور جو اس کی بھلائی سے محروم رہا وہ بالکل ہی محروم اور کم نصیب ہے۔[137]

جانِ کائنات ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے،جو شبِ قدر میں ایمان و اخلاص کے ساتھ عبادت کرتا ہے اس کے تمام پچھلے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔[138]

136...نسائی،ذکر الاختلاف علی معمر،حدیث:2079

137...ابن ماجہ،کتاب الصیام،باب ما جاء فی فضل شہر رمضان،حدیث:1644۔

138...بخاری،کتاب الایمان،باب قیام لیلۃ القدر من الایمان،حدیث:35

شبِ قدر کی تعین:

شبِ قدر کی تعیین میں آئمہ دین کے مختلف اقوال پائے جاتے ہیں۔

جلیل القدر تابعی امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کا ایک قول یہ ہے کہ شبِ قدر تمام سال میں کسی بھی رات کو ہو سکتی ہے۔ صحابہ کرام میں سے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہی قول ہے۔ امام اعظم کا دوسرا قول یہ ہے کہ یہ رمضان کی ستائیسویں شب ہے۔

امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہا اللہ کا قول یہ ہے کہ شبِ قدر رمضان کی کسی متعین رات میں ہوتی ہے۔ علماء شافعیہ کا قول ہے اس کا اکیسویں شب میں ہونا اقرب ہے۔

امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمہا اللہ کے نزدیک یہ رمضان کے آخری عشرے کے طاق راتوں میں ہوتی ہے کسی سال کسی رات میں اور کسی سال کسی دوسری رات میں۔

شیخ محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میرے نزدیک ان کا قول زیادہ صحیح ہے جو کہتے ہیں کہ یہ تمام سال میں کسی بھی رات کو ہو سکتی ہے کیونکہ میں نے شبِ قدر کو دو مرتبہ شعبان میں پایا ہے۔ ایک بار ۱۵ شعبان کو اور دوسری بار ۱۹ شعبان کو اور دو مرتبہ رمضان کے درمیانے عشرے میں ۱۳ اور ۱۸ رمضان کو اور رمضان کے آخری عشرے کی ہر طاق رات میں اسے پایا ہے۔ اس لیے یہ پورے سال میں کسی بھی رات کو ہو سکتی ہے البتہ ماہِ رمضان میں یہ بکثرت آتی ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ ان اقوال میں تطبیق دیتے ہوئے کہتے ہیں،

شبِ قدر سال میں دو مرتبہ ہوتی ہے ایک وہ جس میں احکامِ الٰہی نازل ہوتے ہیں اور اسی رات میں قرآن کریم لوحِ محفوظ سے اتارا گیا۔ یہ رات سال بھر میں کسی بھی شب ہو سکتی ہے۔ البتہ جس سال قرآنِ کریم نازل ہوا، اس سال یہ رات رمضان المبارک میں تھی اور یہ اکثر رمضان المبارک میں ہی ہوتی ہے۔

دوسری شبِ قدر وہ ہے جس میں بکثرت ملائکہ زمین پر اترتے ہیں، روحانیت عروج پر ہوتی ہے، عبادات اور دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ یہ ہر رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں ہوتی ہے اور بدلتی رہتی ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں کہ امام ابنِ عیینہ رحمہ اللہ نے فرمایا: قرآن مجید کی جس آیت میں کسی چیز کے متعلق ارشاد ہوا: ''وَمَآ اَدۡرٰکَ''۔ اس کا علم اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو عطا فرمادیا۔ اور جس کے متعلق ارشاد ہوا، ''وَمَا یُدۡرِیۡکَ'' اس کا علم آپ کو نہیں دیا۔ (صحیح بخاری)

حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آقا و مولیٰ ﷺ ہمیں لیلۃُ القدر کے متعلق بتانے کیلیے تشریف لائے، اسی وقت دو آدمی آپس میں لڑ پڑے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: میں تمہیں شبِ قدر کی خبر دینے آیا تھا مگر فلاں اور فلاں لڑ پڑے تو لیلۃُ القدر کی تعیین اٹھالی گئی۔ ہو سکتا ہے یہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ پس تم اسے رمضان کی اُنتیسویں، ستائیسویں اور پچیسویں شب میں تلاش کرو۔[139]

امام ابن حجر اور امام عینی رحمہما اللہ نے اس کی شرح میں لکھا ہے کہ صرف اس سال یہ تعیین اٹھالی گئی اور اگلے سال پھر اس کا علم عطا فرمادیا گیا۔[140]

اُس وقت شبِ قدر کی تعیین کا علم اٹھالینے کی یہی حکمت سمجھ میں آتی ہے کہ حضور ﷺ کی طرف سے شبِ قدر کی تعیین کا علم پوشیدہ رکھنے کا عذر ہو جائے۔ صحابہ جاننا چاہتے تھے لہٰذا اگر آپ باوجود علم کے نہ بتاتے تو آپ کی شانِ رؤف و رحمت کے خلاف ہوتا اور اگر آپ بتادیتے تو رب کریم کی حکمت کے منافی ہوتا۔ کیونکہ رب کریم کی رضا اس میں تھی کہ بندے آخری عشرے کی تمام طاق راتیں شب بیدار رہ کر عبادت کریں اور شبِ قدر تلاش کریں۔ چند مزید حکمتیں سپردِ قلم و قرطاس ہیں۔

شبِ قدر مخفی کیوں؟

لوگ اکثر سوال کرتے ہیں کہ شبِ قدر کو مخفی رکھنے میں کیا حکمتیں ہیں؟

جواب یہ ہے کہ اصل حکمتیں تو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔ یہ وہ جواب ہے جو صحابہ کرام علیہم الرضوان بارگاہ نبوی میں اُس وقت دیا کرتے جب انہیں کسی سوال کے جواب کا قطعی علم نہ ہوتا۔ وہ فرماتے، اَللّٰہُ وَرَسُوۡلُہٗ اَعۡلَمُ۔ ''اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں''۔

غیب بتانے والے آقا و مولیٰ ﷺ کے روحانی فیوض و برکات سے اکتسابِ فیض کرتے ہوئے علماء

139 ... بخاری، کتاب فضل لیلۃ القدر، باب رفع معرفۃ لیلۃ القدر، حدیث: 2023

140 ... عمدۃ القاری، کتاب فضل لیلۃ القدر، باب رفع معرفۃ لیلۃ القدر، تحت الحدیث: 2023

کرام نے شبِ قدر کے مخفی ہونے کی بعض حکمتیں بیان فرمائی ہیں جو درج ذیل ہیں۔

اگر شبِ قدر کو ظاہر کر دیا جاتا تو کوتاہ ہمت لوگ اسی رات کی عبادت پر اکتفا کر لیتے، اور دیگر راتوں میں عبادت کا اہتمام نہ کرتے۔ اب لوگ آخری عشرے کی پانچ راتوں میں عبادت کی سعادت حاصل کر لیتے ہیں۔

شبِ قدر ظاہر کر دینے کی صورت میں اگر کسی سے یہ شب چھوٹ جاتی تو اسے بہت زیادہ حزن و ملال ہوتا اور دیگر راتوں میں وہ دلجمعی سے عبادت نہ کر پاتا۔ اب پانچ طاق راتوں میں سے دو تین راتیں اکثر لوگوں کو نصیب ہو ہی جاتی ہیں۔

اگر شبِ قدر کو ظاہر کر دیا جاتا تو جس طرح اس رات میں عبادت کا ثواب ہزار ماہ کی عبادت سے زیادہ ہے اسی طرح اس رات میں گناہ بھی ہزار درجہ زیادہ ہوتا۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے اس رات کو مخفی رکھا تاکہ جو اس شب میں عبادت کریں وہ ہزار ماہ کی عبادت سے زیادہ اجر و ثواب پائیں اور جو اپنی جہالت و کم نصیبی سے اس شب میں بھی گناہ سے باز نہ آئیں تو انہیں شبِ قدر کی توہین کرنے کا گناہ نہ ہو۔

اس شب میں اللہ تعالیٰ فرشتوں کو مومن کی عظمت بتانے کیلئے زمین پر نازل فرماتا ہے اور اپنے عبادت گزار بندوں پر فخر کرتا ہے۔ شبِ قدر ظاہر نہ کرنے کی صورت میں فخر کرنے کا زیادہ موقع ہے کہ اے ملائکہ دیکھو! میرے بندے معلوم نہ ہونے کے باوجود محض احتمال کی بنا پر عبادت و اطاعت میں اتنی محنت و سعی کر رہے ہیں اگر انہیں بتا دیا جاتا کہ یہی شبِ قدر ہے تو پھر انکی عبادت و نیاز مندی کا کیا حال ہوتا۔

شبِ قدر کا مخفی رکھنا اسی طرح سمجھ لیجیے جیسے موت کا وقت نہ بتانا۔ کیونکہ اگر موت کا وقت بتا دیا جاتا تو لوگ ساری عمر نفسانی خواہشات کی پیروی میں گناہ کرتے رہتے اور موت سے عین پہلے توبہ کر لیتے۔ اس لیے موت کا وقت مخفی رکھا گیا تاکہ انسان ہر لمحہ موت کا خوف کرے اور ہر وقت گناہوں سے دور اور نیکی میں مصروف رہے۔

اسی طرح آخری عشرے کی ہر طاق رات میں بندوں کو یہی سوچ کر عبادت کرنی چاہیے کہ شاید یہی شبِ قدر ہو۔ اس طرح شبِ قدر کی جستجو میں برکت والی پانچ راتیں عبادتِ الٰہی میں گزارنے کی سعادت نصیب ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بے شمار حکمتوں اور مصلحتوں کے باعث بہت سی اہم چیزوں کو مخفی رکھا ہے۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ تفسیرِ کبیر میں فرماتے ہیں کہ:

☆ اللہ تعالیٰ نے اپنی رضامندی کو عبادت و اطاعت میں مخفی رکھا ہے تاکہ لوگ تمام امور میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں۔

☆ اس نے اپنی ناراضگی کو گناہوں میں مخفی رکھا ہے تاکہ لوگ تمام گناہوں سے بچیں۔

☆ اپنے اولیاء کو مومنوں میں مخفی رکھا ہے تاکہ لوگ سب مومنوں کی تعظیم کریں۔

☆ دعا کی قبولیت کو مخفی رکھا تاکہ لوگ کثرت کے ساتھ دعائیں مانگا کریں۔

☆ اسمِ اعظم کو مخفی رکھا تاکہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ہر نامِ مبارک کی تعظیم کریں۔

☆ صلوٰۃُ الوسطیٰ کو مخفی رکھا تاکہ لوگ سب نمازوں کی حفاظت کریں۔

☆ موت کے وقت کو مخفی رکھا تاکہ لوگ ہر وقت خدا سے ڈرتے رہیں۔

☆ توبہ کی قبولیت کو مخفی رکھا تاکہ لوگ جس طرح ممکن ہو، توبہ کرتے رہیں۔

☆ ایسے ہی شبِ قدر کو مخفی رکھا تاکہ لوگ رمضان کی تمام راتوں کی تعظیم کریں۔

☆ جمعہ کی جو ساعت قبولیتِ دعا کی ہے، مخفی رکھی تاکہ لوگ ہر ساعت میں دعا کریں۔

27ویں شب، لیلۃُ القدر:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آقا و مولیٰ ﷺ کا فرمانِ عالیشان ہے، شبِ قدر کو رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔[141]

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آقائے دو جہاں ﷺ نے فرمایا: شبِ قدر کو آخری عشرے میں ۲۵ویں اور ۲۷ویں راتوں میں تلاش کرو۔[142]

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا: شب قدر رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں یعنی ۲۷، ۲۵، ۲۳، ۲۱ اور ۲۹ویں رات میں ہے۔ جو مسلمان ثواب کی

---

141 ... بخاری، کتاب فضل لیلۃ القدر، باب تحری لیلۃ القدر فی الوتر، حدیث: 2017

142 ... بخاری، کتاب فضل لیلۃ القدر، باب تحری لیلۃ القدر فی الوتر، حدیث: 2021

نیت سے اس رات میں عبادت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے سابقہ تمام گناہ بخش دیتا ہے۔

اس رات کی علامتوں میں سے یہ ہے کہ یہ رات پُر سکون، خاموش اور چمکدار ہوتی ہے۔ صاف شفاف گویا انوار کی کثرت کے باعث چاندنی پھیلی ہو۔ نہ زیادہ گرم نہ زیادہ ٹھنڈی بلکہ معتدل۔ اس رات میں صبح تک آسمان کے ستارے شیاطین کو نہیں مارے جاتے۔ اسکی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس کے بعد کی صبح کو سورج بغیر شعاعوں کے طلوع ہو تا ہے۔ بالکل ہموار ٹکیہ کی طرح جیسا کہ چودھویں کا چاند کیونکہ شیطان کے لیے یہ روا نہیں کہ وہ اس دن سورج کے ساتھ نکلے۔ (143)

کثیر علماء کے نزدیک ۲۷ ویں شب، شبِ قدر ہوتی ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ سے یہی مروی ہے۔ (144)

۲۷ ویں شب کے لیلۃ القدر ہونے کی تائید میں مزید احادیث ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آقا مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شبِ قدر رمضان کی ستائیسویں شب ہے۔ (145)

امام بیہقی رحمہ اللہ نے فرمایا: اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

حضرت زر بن حبیش رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت اُبی ابن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا، عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ جو سال بھر شبِ بیداری کرے وہ شبِ قدر پالے گا۔ آپ کیا کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا، اللہ اُن پر رحم فرمائے، انہوں نے یہ اس لیے کہا کہ لوگ ایک ہی رات پر قناعت نہ کرلیں حالانکہ وہ جانتے تھے کہ شبِ قدر رمضان کے آخری عشرے میں ہے اور وہ ۲۷ ویں شب ہے۔ پھر آپ نے قسم کھا کر فرمایا، شبِ قدر ستائیسویں رات ہے۔ (146)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام سے شبِ قدر کے متعلق پوچھا تو سب نے مختلف جواب دیا۔ میں نے عرض کی، یہ آخری عشرے کی ساتویں

143... مسند امام احمد بن حنبل، حدیث: 30214

144... خزائن العرفان، قدر، تحت الایۃ 3، ص 1113

145... ابو داود، کتاب فی لیلۃ القدر، باب من قال سبع وعشرون، حدیث: 1386

146... ابو داود، کتاب فی لیلۃ القدر، باب من قال سبع وعشرون، حدیث: 1386

رات یعنی ۲۷ ویں شب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ عدد سات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سات آسمان پیدا فرمائے، سات زمینیں بنائیں، انسان کی تخلیق سات درجات میں فرمائی، اور سات چیزیں بطور اس کی غذا کے پیدا فرمائیں ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرا بھی یہی خیال ہے کہ ۲۷ ویں شب لیلۃ القدر ہے۔[147]

دوسری روایت میں آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سات آسمان، سات زمینیں، سات دن تخلیق فرمائے،، طوافِ کعبہ کے چکر سات ہیں، صفا مروہ کے چکر سات ہیں، رمی جمار بھی سات کنکریوں سے ہوتا ہے۔[148]

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی روایت ہے کہ لیلۃُ القدر میں کل نو حروف ہیں اور یہ سورۃالقدر میں تین مرتبہ آیا ہے۔ 9 کو 3 سے ضرب دیں تو 27 آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لیلۃالقدر ۲۷ ویں شب ہی ہے۔[149]

حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کا ایک غلام بحری جہازوں کا ملاح رہا تھا۔ وہ ان سے کہنے لگا، ایک چیز میرے تجربہ میں بہت عجیب ہے، وہ یہ کہ سال میں ایک رات سمندر کا کھارا پانی میٹھا ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا: جب وہ رات آئے تو مجھے ضرور بتانا۔ رمضان کی ۲۷ ویں شب کو اس نے کہا، یہ وہی رات ہے۔[150]

جلیل القدر تابعی عبدہ بن ابی لبابہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے رمضان المبارک کی ستائیسویں شب میں سمندر کا پانی چکھا تو وہ نہایت میٹھا تھا۔ حضرت یحییٰ بن ابی میسرہ رحمہ اللہ کہتے ہیں، میں نے ۲۷ شب میں خانہ کعبہ کا طواف کیا تو میں نے دیکھا کہ فرشتے فضا میں بیتُ اللہ کا طواف کر رہے ہیں۔[151]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بعض علماء وفقہاء کے نزدیک رمضان کی ستائیسویں شب میں قرآن کریم ختم کرنا مستحسن ہے تاکہ شبِ قدر کی برکتیں بھی حاصل ہو جائیں۔ کیونکہ اکثر

147...شعب الایمان، حدیث:3651

148...درمنثور، قدر، تحت الآیۃ:3

149...تفسیر کبیر، قدر، تحت الآیۃ:4

150...تفسیر کبیر، قدر، تحت الآیۃ:4

151...شعب الایمان، حدیث:3653

محدثین نے احادیث بیان کی ہیں کہ ۲۷ ویں شب میں شب ِقدر ہوتی ہے۔[152]

غوث اعظم سیدنا عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ بھی اسی خیال کے قائل تھے کہ ۲۷ ویں شب کو شبِ قدر ہوتی ہے۔ رمضان میں مغرب اور عشاء کی نمازیں جماعت کے ساتھ ادا کرنے سے شبِ قدر کی کچھ برکتیں ضرور نصیب ہوتی ہیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا: جس نے رمضان کے پورے مہینے مغرب اور عشاء کی نمازیں جماعت کے ساتھ ادا کیں اس نے شبِ قدر کا کسی قدر حصہ پالیا۔[153]

خلاصہ یہ ہے کہ اول تو ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہم ماہ رمضان کی تمام راتوں کے آخری حصے میں ذوق و شوق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اور خوب دعائیں مانگیں۔ کم از کم نمازِ تہجد پورا ماہ ضرور ادا کریں۔ پھر کوشش کر کے آخری عشرے کی تمام راتوں کو عبادتِ الٰہی میں گزاریں اور شبِ قدر تلاش کریں ورنہ کم از کم ۲۷ ویں شب کو تو ضرور تمام رات رضائے الٰہی کے لیے عبادت و دعا میں مصروف رہیں۔ رب تعالیٰ ہم سب کو شبِ قدر کی برکتیں نصیب فرمائے۔ آمین

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ...:

نورِ مجسم رحمت عالم ﷺ نے فرمایا: جب شبِ قدر آتی ہے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام فرشتوں کے جھرمٹ میں زمین پر اترتے ہیں اور اس شخص کے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں جو کھڑا یا بیٹھا اللہ تعالیٰ کی عبادت کر رہا ہو۔[154]

دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اور فرشتے اس شب میں عبادت کرنے والوں سے مصافحہ کرتے ہیں اور ان کی دعاؤں پر آمین کہتے ہیں یہاں تک کہ صبح ہو جاتی ہے۔[155]

علماء فرماتے ہیں کہ شبِ قدر میں عبادت کرنے والوں سے جب جبرئیل علیہ السلام اور فرشتے سلام و مصافحہ کرتے ہیں تو اس کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ ان کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، دل خشیتِ الٰہی سے لرزنے لگتا ہے اور ان پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے

152...ماثبت من السنۃ، ص215

153...شعب الایمان، حدیث:3655

154...مشکاۃ المصابیح، کتاب الصیام، حدیث:2096

155...فضائل الاوقات للبیھقی، حدیث:201

ہیں۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیرِ کبیر میں فرشتوں کے زمین پر اترنے کی متعدد وجوہ تحریر فرمائی ہیں جن سے چند سطور ملاحظہ ہوں۔

جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں تو فرشتوں نے کہا تھا، یہ مخلوق زمین میں فساد پھیلائے گی اور خونریزی کرے گی۔ اللہ تعالیٰ انسان کی عزت و عظمت واضح کرنے کے لیے فرشتوں کو نازل فرماتا ہے کہ جاؤ اور دیکھو جن کے متعلق تم نے یہ کہا تھا، وہ کیا کر رہے ہیں۔

دیکھ لو! میرے بندے اس رات میں بستر و آرام کو چھوڑ کر میری خاطر عبادات میں مشغول ہیں اور مجھے راضی کرنے کے لیے آنسو بہا بہا کر دعائیں مانگ رہے ہیں، حالانکہ شبِ بیداری ان کے لیے فرض یا واجب نہیں بلکہ سنتِ مؤکدہ بھی نہیں صرف میرے محبوب رسول ﷺ کے ترغیب دینے پر یہ اپنی نیند و آرام قربان کر کے ساری رات کے قیام پر مستعد ہیں۔ پھر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور مومن کی عظمت کو سلام کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے وعدہ فرمایا ہے کہ جنت میں ان کے پاس فرشتے آئیں گے اور انہیں سلام کریں گے۔ شبِ قدر میں فرشتوں کو نازل فرمانے کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ ربِ تعالیٰ گویا یہ بتانا چاہتا ہے اے میرے بندو! اگر تم دنیا میں میری عبادت میں مشغول رہے تو تمہارے پاس رحمت کے فرشتے آئیں گے اور تمہاری زیارت کر کے وہ تمہیں سلام کریں گے۔

اللہ تعالیٰ نے شبِ قدر کی فضیلت و برکت اہلِ زمین کے لیے رکھی جو یہاں ربِ تعالیٰ کی عبادت کریں۔ چنانچہ فرشتے اسی لیے زمین پر آتے ہیں تاکہ وہ بھی یہاں آکر اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اور شبِ قدر کے کثیر اجر و ثواب کے مستحق ہو جائیں۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص مکہ مکرمہ اس نیت سے جائے کہ وہاں عبادت کا اجر و ثواب زیادہ ملتا ہے اسی طرح فرشتے شبِ قدر میں زمین پر اترتے ہیں۔

انسان کی فطرت ہے کہ جب اکابر علماء اور عابد و زاہد لوگ موجود ہوں تو وہ خلوت کے مقابلے میں بہتر طریقے سے عبادت اور اطاعتِ الٰہی میں مشغول ہو جاتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ اس رات فرشتوں کو بھیجتا ہے کہ اے مسلمانو! تم عابدوں اور زاہدوں کی مجلس میں زیادہ ذوق سے عبادت کرتے ہو۔ اب تمہاری مجلس میں ملائکہ آئے ہیں لہٰذا ذوق و شوق سے میری عبادت کرو۔

’’بِاِذْنِ رَبِّهِم‘‘ فرمانے میں انسانوں کو تنبیہ ہے کہ فرشتے ہمارے بندے ہیں اور ہمارے حکم کے پابند ہیں۔ تم بھی ہمارے بندے ہو، اس لیے تمھیں بھی ہمارے حکم کا پابند ہونا چاہیے۔

سَلٰمٌ هِیَ حَتّٰی:

وہ رات مکمل طور پر سلامتی ہے اور ملائکہ کا سلام کرنا سلامتی کا ضامن ہے۔ مقامِ غور ہے کہ سات فرشتوں نے آکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سلام کیا تھا تو ان پر نمرود کی آگ گلزار ہو گئی تھی، شبِ قدر میں عبادت کرنے والوں پر جب بے شمار فرشتے آکر سلام کرتے ہیں تو پھر جہنم کی آگ ان پر امن و سلامتی کا گلزار کیوں نہ بنے گی۔

مولا علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے، ملائکہ اترتے ہیں تاکہ ہمیں سلام کریں اور ہمارے لیے شفاعت کریں۔ جسے ان کا سلام نصیب ہو جائے اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

تفسیر سورۃ البیّنۃ

سورۃ البینہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں آٹھ آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لَمۡ یَکُنِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ مُنۡفَکِّیۡنَ حَتّٰی تَاۡتِیَہُمُ الۡبَیِّنَۃُ ﴿۱﴾ رَسُوۡلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتۡلُوۡا صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً ﴿۲﴾ فِیۡہَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ ﴿۳﴾ وَ مَا تَفَرَّقَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡہُمُ الۡبَیِّنَۃُ ﴿۴﴾ وَ مَاۤ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِیَعۡبُدُوا اللّٰہَ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ ۬ۙ حُنَفَآءَ وَ یُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ یُؤۡتُوا الزَّکٰوۃَ وَ ذٰلِکَ دِیۡنُ الۡقَیِّمَۃِ ﴿۵﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ فِیۡ نَارِ جَہَنَّمَ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمۡ شَرُّ الۡبَرِیَّۃِ ﴿۶﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِکَ ہُمۡ خَیۡرُ الۡبَرِیَّۃِ ﴿۷﴾ جَزَآؤُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ ؕ ذٰلِکَ لِمَنۡ خَشِیَ رَبَّہٗ ﴿۸﴾

”اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا (ہے)“

”کتابی کافر اور مشرک اپنا دین چھوڑنے کو نہ تھے جب تک اُن کے پاس روشن دلیل نہ آئے۔ وہ کون؟ وہ اللہ کا رسول کہ پاک صحیفے پڑھتا ہے، ان میں سیدھی باتیں لکھی ہیں۔ اور پھوٹ نہ پڑی کتاب والوں میں مگر بعد اس کے کہ وہ روشن دلیل اُن کے پاس تشریف لائے۔

اور اُن لوگوں کو تو یہی حکم ہوا کہ اللہ کی بندگی کریں نرے اسی پر عقیدہ لاتے، ایک طرف کے ہو کر، اور نماز قائم کریں، اور زکوۃ دیں، اور یہ سیدھا دین ہے۔ بے شک جتنے کافر ہیں کتابی اور مشرک، سب جہنم کی آگ میں ہیں، ہمیشہ اس میں رہیں گے، وہی تمام مخلوق میں بدتر ہیں۔

بیشک جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے، وہی تمام مخلوق میں بہتر ہیں۔ اُن کا صلہ اُن کے رب کے پاس بسنے کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہیں، ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں، اللہ اُن سے راضی اور وہ اُس

سے راضی، یہ اُس کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈرے"۔

لفظی ترجمہ:

لَمْ	يَكُنِ	الَّذِيْنَ	كَفَرُوْا	مِنْ	اَهْلِ	الْكِتٰبِ	وَ	الْمُشْرِكِيْنَ
نہ	تھے	وہ لوگ	کفر کیا جنہوں نے	سے	اہل	کتاب	اور	مشرکوں

مُنْفَكِّيْنَ	حَتّٰى	تَاْتِيَ	هُمُ	الْبَيِّنَةُ
چھوڑنے والے	یہاں تک کہ	آئے	اُن (کے پاس)	روشن دلیل

رَسُوْلٌ	مِّنَ	اللّٰهِ	يَتْلُوْا	صُحُفًا	مُّطَهَّرَةً
رسول	(طرف) سے	اللہ (کی)	پڑھتا ہے وہ	صحیفے	پاک

فِيْ	هَا	كُتُبٌ	قَيِّمَةٌ
میں	ان	لکھی ہیں	سیدھی (باتیں)

وَ	مَا	تَفَرَّقَ	الَّذِيْنَ	اُوْتُوا	الْكِتٰبَ	اِلَّا
اور	نہ	جُدا جُدا ہوئے	وہ لوگ جو	دیے گئے	کتاب	مگر

مِنْ	بَعْدِ	مَا	جَآءَتْ	هُمُ	الْبَيِّنَةُ
سے	پیچھے	(اسکے) کہ	آئی	اُن (کے اس)	روشن دلیل

وَ	مَآ	اُمِرُوْٓا	اِلَّا	لِ	يَعْبُدُوا	اللّٰهَ
اور	نہیں	حکم دیے گئے وہ	مگر	یہ کہ	عبادت کریں وہ	اللہ (کی)

مُخْلِصِيْنَ	لَ	هُ	الدِّيْنَ
خالص کرتے ہوئے	واسطے	اُس (کے)	دین

حُنَفَآءَ	وَ	يُقِيۡمُوا	الصَّلٰوةَ	وَ	يُؤۡتُوا
یکسو ہو کر	اور	قائم کریں وہ	نماز	اور	دیں وہ

الزَّكٰوةَ	وَ	ذٰلِكَ	دِيۡنُ	الۡقَيِّمَةِ
زکوٰۃ	اور	یہ	دین (ہے)	سیدھا

اِنَّ	الَّذِيۡنَ	كَفَرُوۡا	مِنۡ	اَهۡلِ	الۡكِتٰبِ	وَ	الۡمُشۡرِكِيۡنَ	فِيۡ
بیشک	وہ لوگ	کفر کیا جنہوں نے	سے	اہلِ	کتاب	اور	مشرکوں	میں

نَارِ	جَهَنَّمَ	خٰلِدِيۡنَ	فِيۡ	هَا
آگ	جہنم (کی)	ہمیشہ رہیں گے	میں	اس

اُولٰٓئِكَ	هُمۡ	شَرُّ	الۡبَرِيَّةِ
یہ لوگ	وہ (ہیں)	بدتر	مخلوق میں

اِنَّ	الَّذِيۡنَ	اٰمَنُوۡا	وَ	عَمِلُوا	الصّٰلِحٰتِ
بیشک	وہ لوگ	جو ایمان لائے	اور	کام کیے جنہوں نے	اچھے

اُولٰٓئِكَ	هُمۡ	خَيۡرُ	الۡبَرِيَّةِ
یہ لوگ	وہ (ہیں)	بہتر	مخلوق (میں)

جَزَآؤُ	هُمۡ	عِنۡدَ	رَبِّ	هِمۡ	جَنّٰتُ	عَدۡنٍ	تَجۡرِيۡ
ثواب	اُن (کا)	پاس	رب	اُن (کے)	باغات (ہیں)	بسنے (کے)	بہتی (ہیں)

مِنۡ	تَحۡتِ	هَا	الۡاَنۡهٰرُ	خٰلِدِيۡنَ	فِيۡ	هَا	اَبَدًا
سے	نیچے	اُن (کے)	نہریں	ہمیشہ رہیں	میں	اُن	ابد تک

رَضِيَ	اللّٰهُ	عَنۡ	هُمۡ	وَ	رَضُوۡا	عَنۡ	هُ
راضی ہوا	اللہ	سے	اُن	اور	راضی ہوئے وہ	سے	اُس

ذٰلِکَ	لِ	مَنۡ	خَشِيَ	رَبَّ	هٗ
یہ	واسطے	اُس کے (ہے) جو	ڈرے	رب	اپنے (سے)

ربط و مناسبت:

سورۃ العلق میں پہلی وحی موجود ہے، سورۃ القدر میں مذکور ہے کہ کتاب کب نازل ہوئی، جبکہ اِس سورت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس کتاب کے ساتھ ایک رسول بھیجنے کی ضرورت کیوں تھی۔

سورۃ القدر میں نزولِ قرآن کا ذکر ہے، اس سورت میں نزولِ قرآن کا مقصد اور رسولِ معظم ﷺ کے پاک کتاب تلاوت کرنے کا ذکر ہے۔

سابقہ سورت میں نزولِ قرآن کی رات کی قدر و منزلت بیان ہوئی اور اس سورت میں صاحبِ قرآن ﷺ کی شان اور انکی رسالت پر ایمان لانے کی اہمیت مذکور ہے۔

سورۃ القدر میں نزولِ قرآن کی برکات و ثمرات کا بیان تھا، اس سورت میں دعوتِ قرآن پر عمل پیرا ہونے والوں کے لیے جنت اور رضائے الٰہی کی خوشخبری دی گئی۔

حضرت اَنس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آقا و مولیٰ ﷺ نے حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ تمہیں {لَمۡ یَکُنِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا} والی سورت پڑھ کر سناؤں۔ حضرت اُبی رضی اللہ عنہ نے عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! کیا اللہ تعالیٰ نے میرا نام لے کر یہ فرمایا؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ہاں۔

حضرت اُبی رضی اللہ عنہ نے پھر عرض کی، کیا میرا ذکر ربُ العالمین کے پاس ہوا؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ یہ سن کر حضرت اُبی رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے (خوشی کے) آنسو جاری ہو گئے۔[156]

156...بخاری، کتاب المناقب، حدیث:3809۔

شانِ نزول:

رحمتِ عالم ﷺ کی دنیا میں تشریف آوری سے قبل اہلِ عرب دو گروہوں میں منقسم تھے۔ ایک گروہ اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کا تھا اور دوسرا گروہ بت پرست مشرکوں کا۔ خاتمُ الانبیاء ﷺ کی بعثت سے قبل اہلِ کتاب اپنی مخالف مشرک قوموں سے کہا کرتے کہ رسولِ موعود کی آمد قریب ہے۔ ہم ان کا ساتھ دیکر تم پر غالب آئیں گے اور تمہیں نیست و نابود کر دیں گے۔

پھر جب نبی کریم ﷺ کی بعثت ہوئی تو یہود و نصاریٰ کے بعض انصاف پسند علماء نے سچائی اور دیانت کے ساتھ حضور ﷺ کی نبوت کو مان لیا جبکہ ان کی بڑی تعداد توریت وانجیل میں موجود رسولِ موعود کی نشانیاں حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس میں دیکھ کر بھی آپ پر ایمان نہیں لائی۔ بلکہ ان کے علماء نے توریت وانجیل میں موجود حضور ﷺ کے اوصاف و کمالات چھپا لیے اور اُن کتب میں مزید تحریفات کا ارتکاب کیا۔ ایسے سنگین حالات میں یہ سورۃ مبارکہ نازل ہوئی۔

لَمۡ یَکُنِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا....:

اگرچہ یہود حضرت عُزیز علیہ السلام کو اور عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہنے کی وجہ سے شرک کے مرتکب تھے لیکن رب تعالیٰ نے انہیں مشرکین سے علیحدہ ذکر فرمایا کیونکہ وہ اپنے زعم میں خود کو دینِ توحید کا پیروکار سمجھتے تھے۔

"اَلۡبَیِّنَۃُ" یعنی روشن دلیل سے مراد رسولِ انور ﷺ کی ذاتِ اقدس ہے کیونکہ حضور ﷺ کی تشریف آوری سے قبل اہلِ کتاب یہی کہتے تھے کہ ہم اپنا دین چھوڑنے والے نہیں جب تک کہ وہ نبی کریم ﷺ جلوہ گر نہ ہو جائیں جن کا ذکر توریت اور انجیل میں ہے۔ توریت وانجیل میں نہ صرف حضور ﷺ کی تشریف آوری کا ذکر موجود تھا بلکہ آپ کی متعدد صفات بھی مذکور تھیں جن کی بناء پر اہلِ کتاب آپ کو جانتے اور آپ کی آمد کے منتظر تھے۔ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے،

{اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یَعۡرِفُوۡنَہٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَ ہُمۡ}

"جنہیں ہم نے کتاب عطا فرمائی وہ اس نبی کو ایسا پہچانتے ہیں جیسے آدمی اپنے بیٹوں کو پہچانتا ہے"۔(پ2،بقرہ:146)

مطلب یہ ہے کہ سابقہ کتب میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف ایسے واضح بیان کیے گئے ہیں جن سے اہلِ کتاب کے علماء کو حضور ﷺ کے خاتمُ الانبیاء ہونے میں کچھ شک وشبہ باقی نہیں رہ سکتا۔ اس لیے وہ حضور ﷺ کے اس منصبِ عالی کو پورے یقین کے ساتھ جانتے ہیں۔

جب یہود کے عالم حضرت عبد اللہ بن سلام مشرف باسلام ہوئے تو حضرت عمر نے دریافت کیا کہ آیہ مذکورہ میں نبی کی جو معرفت بیان کی گئی ہے اس کی کیا شان ہے؟

انہوں نے فرمایا: ”اے عمر! میں نے حضور ﷺ کو دیکھا تو بغیر کسی شبہ کے پہچان لیا اور میرا حضور کو پہچاننا اپنے بیٹوں کے پہچاننے سے بدرجہا کامل واکمل ہے“۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ کیسے؟ انہوں نے کہا، میں گواہی دیتا ہوں کہ حضور ﷺ اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے رسول ہیں کیونکہ ان کے اوصاف اللہ تعالیٰ نے ہماری کتاب توریت میں بیان فرمائے ہیں جبکہ بیٹے کی طرف سے ایسا یقین کس طرح اور عورتوں کا حال ایسا قطعی کس طرح معلوم ہو سکتا ہے؟ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا سر چوم لیا۔[157]

یہود ونصاریٰ سے سن سن کر مشرکینِ عرب میں بھی اس بات کا چرچا تھا کہ ایک ایسی ہستی جلوہ گر ہونے والی ہے جو عرب کی ابدی شان وشوکت اور عزت وشہرت کا باعث ہو گی اور عرب کے گلہ بان بھی حکومت کریں گے۔ یہ بات ایسی مشہور تھی کہ مشرکین بھی حضور ﷺ کی تشریف آوری کے منتظر تھے۔

اب اس آیت کے مفہوم کا خلاصہ یہ ہے کہ اہلِ کتاب اور مشرکوں کے کفر وگمراہی سے نکلنے کی سوائے اس کے کوئی اور صورت نہ تھی کہ ایک روشن دلیل آکر انہیں حق اور باطل میں فرق سمجھا دے اور انہیں گمراہی کی تاریکیوں سے نکال کر ہدایت کی روشنی عطا کر دے۔ گویا اہلِ کتاب اور مشرکین کفر وشرک کی گہری دلدل سے نکلنے کے لیے محتاج تھے کہ رب تعالیٰ رسولِ معظم ﷺ کی صورت میں ایک روشن دلیل مبعوث فرمادے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس رسول ﷺ کی تشریف آوری کے بعد سب کفر وگمراہی سے باز

157... خزائن العرفان، بقرہ، تحت الایۃ: 146،

آجائیں گے۔ بلکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس روشن دلیل کے بغیر تو ہدایت کو پانا ہرگز ممکن ہی نہیں تھا، اب اس روشن دلیل کے آجانے کے باوجود اگر کوئی کفر و شرک پر قائم رہے تو پھر وہ اپنی گمراہی کا خود ذمہ دار ہے۔ سورج کو دیکھ کر سورج کا انکار کرنا عقل کا اندھا ہونے کی دلیل ہے۔ اب کوئی رب تعالیٰ سے یہ شکوہ نہیں کر سکتا کہ ہماری ہدایت کے لیے روشن دلیل کیوں نہ بھیجی۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے:

{اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى} ”بیشک ہدایت فرمانا ہمارے ذمہ ہے“۔(پ30، اللیل:12)

{رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ}

”رسول خوشخبری دیتے اور ڈر سناتے ہیں تاکہ رسولوں کے (آنے کے) بعد اللہ کے یہاں لوگوں کو کوئی عذر نہ رہے“۔(پ6، النساء:165)

”اور یہ کہنے کا موقع نہ ہو کہ اگر ہمارے پاس رسول آتے تو ہم ضرور اُن کا حکم مانتے اور اللہ کے مطیع و فرمانبردار ہوتے“۔ (158)

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ...:

ارشاد ہوا: ”وہ اللہ کا رسول کہ پاک صحیفے پڑھتا ہے، ان میں سیدھی باتیں لکھی ہیں“۔(پ30، بینہ:2-3)

دوسری آیت میں فرمایا گیا، وہ روشن دلیل اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ ہیں۔ اس سے مراد ہے نبوت کی روشن دلیل، اسی لیے معجزہ کو بھی ”الْبَيِّنَة“ کہتے ہیں۔ ”رسولٌ“ پر تنوین، اظہارِ عظمت کے لیے ہے یعنی یہ رسول بہت عظمت والا ہے۔

یہاں رسولِ کریم ﷺ کو بذاتِ خود روشن دلیل کہنے کی کئی وجوہات ہیں۔

وحی کے نزول سے قبل بھی نورِ مجسم ﷺ کی زندگی کفارِ مکہ کے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح تھی اور آپ پہلے ہی توحید، سچائی، نیکی اور بھلائی کے راستے پر قائم تھے۔ یہی سبب ہے کہ کفار آپ کو ”صادق“ اور ”امین“ کے لقب سے پکارتے تھے۔ آپ ﷺ کی پاکیزہ عادات، عظیم اخلاق اور بے عیب سیرت خود آپ ﷺ کے رسولِ برحق ہونے پر واضح دلیل ہیں۔ آپ کی سیرت اور کمالات دیکھ

158... خزائن العرفان، نساء، تحت الایۃ:165

کر ہر زندہ دل گواہی دے گا کہ آپ ہی "الْبَیِّنَة" یعنی روشن دلیل اور پیکرِ اعجاز ہیں۔

وحی کے نزول کے بعد قرآن مجید کی روشن آیات تلاوت کرکے آپ نے حق و باطل کی راہوں کو واضح فرمایا، اپنی نبوت ورسالت پر بیشمار معجزات پیش کیے اور اپنی صحبت کے فیض سے ایمان لانے والوں کی زندگیوں میں غیر معمولی انقلاب برپا کر دیا۔ غرض یہ کہ آقا و مولیٰ ﷺ کا اخلاق، پیغام اور تعلیمات بلکہ پوری زندگی ہی اس بات کی روشن دلیل ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔

اس آیت میں حضور ﷺ کا ایک خاص وصف یہ بیان ہوا ہے کہ آپ پاک صحیفے تلاوت کرتے ہیں۔ اُمّی ہونے کے باوجود صحیفوں کی تلاوت بھی آپ کا ایک معجزہ ہے۔ پاک صحیفوں سے مراد قرآن کریم ہے۔ قرآن کریم تو خود ایک صحیفہ ہے مگر اسے تعظیم کے طور پر جمع کے صیغہ سے ذکر فرمایا۔ جمع کے صیغے سے ذکر فرمانے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا ذکر سابقہ صحائف میں بھی تھا۔ ارشاد ہوا:

{وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ}

"اور بیشک اس کا چرچا اگلی کتابوں میں ہے"۔(پ19، شعراء:196)

مزید یہ کہ سابقہ صحیفوں میں مذکور عقائد اور اچھی باتیں قرآن کریم میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً سورۃ الاعلیٰ میں ارشاد ہوا:

{اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی ۝ صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی}

(پ30، اعلیٰ:18-19) "بیشک یہ (نصیحت) اگلے صحیفوں میں ہے، ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں"۔

گویا قرآن کریم میں سابقہ صحائف ہیں اور سابقہ صحیفوں میں قرآن کریم کے اوصاف، پس رسول کریم ﷺ کا قرآن عظیم تلاوت کرنا گویا سابقہ صحیفوں کی تلاوت کرنا ہے اس لیے اسے جمع کے صیغہ سے ذکر فرمایا گیا۔

"مُّطَهَّرَةً" کے معنی پاک چیز کے ہیں۔ اس کا ایک معنی یہ ہے کہ یہ کتاب باطل کی آمیزش اور تحریف و تبدل سے محفوظ اور ہر عیب سے پاک ہے۔ ارشاد ہوا:

{لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ}(پ24، حم السجدۃ:42)

”باطل کو اس کی طرف راہ نہیں، نہ اس کے آگے سے نہ اس کے پیچھے سے“۔

دوسرا معنی یہ ہے کہ اسے پاکیزہ فرشتے لے کر نازل ہوئے ہیں۔ تیسرا معنی یہ ہے کہ اسے پاک لوگ ہی چھوئیں۔ ارشاد ہوا: ”اسے نہ چھوئیں مگر باوضو“۔(پ27، واقعہ:79)

صحیفہ لکھے ہوئے اوراق کو کہتے ہیں اور کتاب کو بھی، لیکن یہاں کُتُبٌ سے مراد احکام ہیں (قرطبی)۔ جیسے سورۃ الانفال کی آیت ۶۸ میں بھی ”کتاب“ سے مراد حکم ہے۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید عہدِ رسالت میں اوراق پر لکھا جاچکا تھا۔ قرآن کریم کی کتابت کے لیے مقرر صحابہ کو ”کاتبینِ وحی“ کہتے ہیں۔

”قَيِّمَةٌ“ کا معنی ہے، سیدھی، درست اور مستحکم۔ اب مفہوم یہ ہوگا کہ قرآن کریم میں ایسے احکام مذکور ہیں جو سیدھے، درست، منصفانہ اور مستحکم ہیں اور یہ احکام کبھی نہ منسوخ ہونے والے ہیں۔ لہٰذا یہ احکام قیامت تک ساری انسانیت کی راہنمائی کرتے رہیں گے۔

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ...:

ارشاد ہوا: ”اور پھوٹ نہ پڑی کتاب والوں میں مگر بعد اس کے کہ وہ روشن دلیل اُن کے پاس تشریف لائے“۔(پ30، بینہ:4)

اس آیت میں بھی ”الْبَيِّنَةُ“ سے مراد رسولِ اکرم ﷺ ہیں۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت سے قبل سب اہلِ کتاب اس پر متفق تھے کہ آخری نبی جب ظاہر ہونگے تو ہم ایمان لائیں گے۔ اس اتفاق کا ذکر قرآن کریم میں یوں ہے،

{وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا}(پ1، بقرہ:89)

”اور اس سے پہلے وہ اسی نبی کے وسیلہ سے کافروں پر فتح مانگتے تھے“۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرکارِ دوعالم ﷺ کی بعثت سے قبل یہود اس طرح دعا مانگتے، ”اے اللہ! اپنے اس نبی کے وسیلہ سے ہماری مدد فرما جو تُو آخری زمانے میں بھیجے گا اور اُس کتاب کے وسیلہ سے جو تُو اُن پر نازل فرمائے گا۔(تفسیر دُرِّ منثور)

اہلِ کتاب کا خیال تھا کہ آخری نبی بنو اسرائیل میں سے آئیں گے لیکن جب وہ بنو اسماعیل سے

مبعوث ہوئے تو بعض کے سوا، حسد اور تعصب کے باعث اکثر نے انکار کر دیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے،{فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ}(پ1،بقرہ:89)

"تو جب تشریف لایا اُن کے پاس وہ جانا پہچانا (نبی)، اُس سے منکر ہو بیٹھے"۔

نہ یہ کہ منکرینِ حق، سچے نبی کے منکر ہو گئے بلکہ وہ اُن حق پسند اہلِ کتاب سے لڑنے جھگڑنے لگے جو حضور ﷺ پر ایمان لے آئے تھے۔ مذکورہ آیت میں یہی بات سمجھائی جارہی ہے کہ "تم پہلے تو متفق تھے کہ "روشن دلیل" پر ایمان لائیں گے لیکن اب جبکہ وہ "روشن دلیل" یعنی رسولِ معظم ﷺ تشریف لا چکے تو انکار کیوں کرتے ہو اور انہیں ماننے والوں سے لڑ جھگڑ کر تفرقہ کیوں ڈالتے ہو؟ عقل کرو۔ کیا تمہارا دین یہ سکھاتا ہے؟" پھر تمام انبیاء کرام کی تعلیمات کے بنیادی اجزاء بیان فرمائے گئے۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْا...:

فرمایا گیا، "اور اُن لوگوں کو تو یہی حکم ہوا کہ اللہ کی بندگی کریں نرے اسی پر عقیدہ لاتے، ایک طرف کے ہو کر، اور نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ دیں، اور یہ سیدھا دین ہے"۔(پ30،بینہ:5)

"دِيْنُ الْقَيِّمَةِ" سے مراد ایسا دین ہے جس میں کوئی خامی اور کمی نہ ہو۔ وہی دین کامل و مکمل ضابطۂ حیات ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے انبیاء لے کر آئے ہوں اور وہ فکر و عمل کی اصلاح کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو۔ ایسا دین اسلام ہی ہے جو سیدھا اور سچا دین ہے۔{اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ}

لوگوں کی ہدایت کے لیے "روشن دلیل"، رسولِ معظم ﷺ کو مبعوث فرمانے کے بعد رب تعالیٰ نے "دینِ قیّم" کے پانچ بنیادی احکام بیان فرمادیے جو دراصل اصلاحِ فکر و عمل کے پانچ اہم ستونوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ پانچوں احکام سابقہ آسمانی کتب میں بھی موجود تھے۔

پہلا حکم یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ دوسرا حکم یہ ہے کہ شرک و نفاق اور ہر گمراہی سے بچ کر دین کو خالص کرتے ہوئے اللہ پر عقیدہ رکھو۔ ان احکام کی تاکید و تلقین پر مزید آیات ملاحظہ فرمائیں۔ ارشاد ہوا:

{فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ}(پ23،زمر:2.3)

"تو اللہ کو پوجو نرے اس کے بندے ہو کر، ہاں خالص اللہ ہی کی بندگی ہے"۔

{قُلْ اِنِّیْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ}(پ23،زمر:11)

''تم فرماؤ! مجھے حکم ہے کہ اللہ کو پوجوں نرا اُس کا بندہ ہو کر''۔

تیسرا حکم یہ ہے کہ صرف حق کی طرف کے ہو جاؤ اور ہر باطل سے کنارہ کش رہو۔ ''حُنَفَاء'' جمع ہے حنیف کی اور حنیف کا معنی ہے، ہر باطل کو چھوڑ کر صرف حق کی طرف متوجہ ہو جانا۔ سورۃ المزمل میں یہی مفہوم یوں بیان ہوا،

{وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا} ''اور سب سے ٹوٹ کر اسی کے ہو رہو''۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسے کرو کہ دل اُس کے سوا کسی اور کی طرف متوجہ نہ ہو، یہ اخلاص کا اعلیٰ درجہ ہے۔

چوتھا حکم یہ ہے کہ خشوع و خضوع کے ساتھ پابندی سے نماز ادا کرو۔ نماز محض چند جسمانی حرکات ادا کرنے کا نام نہیں بلکہ بندہ جب اپنے رب کی بارگاہ میں نماز کے لیے کھڑا ہو تو یہ تصور کرے کہ وہ رب تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے ورنہ یہ ضرور تصور رکھے کہ رب کریم اسے دیکھ رہا ہے۔

اس کا اثر یہ ہو گا کہ بندہ اپنی زبان سے جو کچھ پڑھے گا اس کا روحانی کیف اس کے دل و دماغ پر اثر انداز ہو گا، اور جب بندہ رب کی بارگاہ میں جھکے گا تو جسم کے ساتھ ساتھ اس کے دل و دماغ بھی بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہو جائیں گے۔ درحقیقت ایسی نماز بندے کو پوری زندگی رب تعالیٰ کی بندگی اور آقا و مولیٰ ﷺ کی اطاعت و غلامی میں بسر کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ ایسی ہی نماز کو مومنوں کی معراج، دین کا ستون اور آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا گیا ہے، اور ایسی ہی نماز کے متعلق ارشاد ہوا:

{اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ}(پ20، عنکبوت:45)

''بیشک نماز منع کرتی ہے بے حیائی اور بری بات سے''۔

پانچواں حکم یہ ہے کہ اپنے مال سے زکوٰۃ دیتے رہو۔ یعنی رب تعالیٰ کی رضا کے لیے اس کے دیے ہوئے مال میں سے ان لوگوں کو مقررہ حصہ دیا جائے جنہیں وہ مال دینے کا اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب ﷺ نے حکم دیا ہے۔

زکوٰۃ دینے میں ایک حکمت تو یہ ہے کہ مال دینے سے دل سے مال کی محبت کم ہوتی ہے۔ دوسری حکمت یہ ہے کہ معاشرے کے مستحق اور غریب لوگوں کی مدد کرنے سے ان کے ساتھ ہمدردی کا

جذبہ پیدا ہوتا ہے اور انسان تکبر سے محفوظ رہتا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں پر مسلمانوں کی فضیلت ظاہر فرمائی ہے۔ کیونکہ فرشتے مخلص ہیں، تسبیحات پڑھتے اور رکوع وسجود کرتے ہیں لیکن وہ محنت سے مال کما کر زکوٰۃ نہیں دیتے، جبکہ مسلمانوں کو رب تعالیٰ نے یہ وصف عطا فرمایا ہے اس لیے وہ فرشتوں سے افضل ہوئے۔

مسلمانوں کے ایسے ہی اوصاف کی وجہ سے رب کریم فرشتوں کو حکم دے گا کہ تم مسلمانوں کی عظمتوں کو سلام پیش کرو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

{وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ o جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ o سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ} (پ13، رعد:22-24)

”اور وہ جنہوں نے صبر کیا اپنے رب کی رضا چاہنے کو، اور نماز قائم رکھی، اور ہمارے دیے سے ہماری راہ میں چھپے اور ظاہر کچھ خرچ کیا، اور برائی کے بدلے بھلائی کر کے ٹالتے ہیں، اُنہیں کے لیے پچھلے گھر کا نفع ہے۔ بسنے کے باغ جن میں وہ داخل ہونگے اور جو لائق (یعنی مومن) ہوں ان کے باپ دادا اور بیبیوں اور اولاد میں (سے بھی)، اور فرشتے (جنت کے) ہر دروازے سے ان پر یہ کہتے آئیں گے، سلامتی ہو تم پر! تمہارے صبر کا بدلہ، تو پچھلا گھر کیا ہی خوب ملا“۔

مخلوق میں بدترین:

ارشاد ہوا: ”بے شک جتنے کافر ہیں کتابی اور مشرک، سب جہنم کی آگ میں ہیں، ہمیشہ اس میں رہیں گے، وہی تمام مخلوق میں بدتر ہیں“۔ (آیت ۶)

اس سورت کی ابتدا میں کافروں کا ذکر کیا گیا تو پہلے اہلِ کتاب کا ذکر ہوا اور پھر مشرکوں کا۔ اب سورت کے آخر میں جہنم کی وعید سناتے ہوئے پھر پہلے اہلِ کتاب کا ذکر ہوا اور بعد میں مشرکوں کا۔

اس کی وجہ امام رازی رحمہ اللہ نے یہ بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے حق کو اپنے حق

سے مقدم رکھا ہے۔ مشرکین اللہ تعالیٰ کے منکر تھے اور فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیکر رب تعالیٰ کی گویا توہین کرتے تھے جبکہ اہلِ کتاب اللہ تعالیٰ کو مانتے اور اس کی عبادت کرتے تھے مگر وہ رسولِ معظم ﷺ کا انکار کرتے تھے۔ رب تعالیٰ کو یہ چیز زیادہ ناپسند ہے کہ اسکے حبیب ﷺ کی شانِ رسالت کا انکار کیا جائے اس لیے اہلِ کتاب کافروں کے عذاب کا پہلے ذکر فرمایا اور مشرکوں کے عذاب کا بعد میں۔

کافروں کے لیے دو باتیں بیان ہوئیں۔ ایک یہ کہ انہیں ہمیشہ جہنم میں رہنا ہے اور دوسری یہ کہ وہ ساری مخلوق میں بدترین مخلوق ہیں۔ اس سے قبل سورۃ التین میں بیان ہوا تھا کہ انسان کو بہترین صلاحیتیں دی گئی ہیں، مگر جب وہ پستی میں گرتا ہے تو تمام مخلوق سے بدتر ہو جاتا ہے۔ سورۃ الاعراف میں بھی مذکور ہے کہ:

”ایسے لوگ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بڑھ کر گمراہ، یہ وہ ہیں جو غفلت میں پڑے ہیں“۔ کیونکہ جانور عقل اور اختیار نہیں رکھتے اور یہ عقل واختیار رکھنے کے باوجود حق سے منہ موڑتے ہیں۔

مخلوق میں بہترین:

پھر ارشاد ہوا: ”بیشک جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے، وہی تمام مخلوق میں بہتر ہیں“۔ (آیت ۷)

اس آیت میں ان مومنوں کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ اور حبیبِ کبریا ﷺ پر سچے دل سے ایمان لاتے ہیں اور ان کی اطاعت و پیروی میں زندگی گزارتے ہیں، ایسے لوگوں کو بہترین مخلوق فرمایا گیا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آقا و مولیٰ ﷺ نے فرمایا: کیا تم فرشتوں کے بلند مقام پر تعجب کرتے ہو، قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! قیامت کے دن مومنوں کا مقام و مرتبہ فرشتوں سے بھی زیادہ بلند ہو گا۔ تم چاہو تو یہ آیت پڑھ لو۔ پھر آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔[159]

اس آیت و حدیث سے معلوم ہوا کہ صالح مومن عام فرشتوں سے افضل ہیں کیونکہ مومن

159... تفسیر کبیر، بینہ، تحت الآیۃ:7

اپنے ارادہ واختیار سے اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی اطاعت کرتا ہے جبکہ فرشتے نافرمانی کا اختیار ہی نہیں رکھتے۔

جَزَآؤُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ...:

آخر میں ارشاد ہوا: ''اُن کا صلہ اُن کے رب کے پاس بسنے کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہیں، ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں، اللہ اُن سے راضی اور وہ اُس سے راضی، یہ اُس کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈرے''۔(آیت ۸)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مومنوں کو ایک سے زیادہ جنتیں ملیں گی۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: {وَلِمَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ} ''اور جو اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے سے ڈرے، اس کے لیے دو جنتیں ہیں''۔(پ27، رحمٰن:46)

ایک جنتِ عدن اور ایک جنتِ نعیم۔ ایک جنت رب سے ڈرنے کا صلہ اور دوسری شہوات ترک کرنے کا صلہ۔(خزائن العرفان) پھر فرمایا گیا،

{وَمِنۡ دُوۡنِهِمَا جَنَّتٰنِ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ}(پ27، رحمٰن:62-63)

''اور ان کے سوا دو جنتیں اور ہیں۔ تو اپنے رب کی کون سی نعمت جھٹلاؤ گے''۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ مومن کے لیے چار جنتیں ہیں۔ سورۃ الرحمٰن کی مذکورہ آیات اور سورۃ البینہ کی آخری آیت سے یہ بات بھی واضح ہے کہ یہ چار جنتیں ان مومنوں کے لیے ہیں جو ساری زندگی اپنے رب سے ڈرتے رہتے ہیں اور یہ خوف انہیں صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رکھتا ہے۔

قرآن کریم بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے برائی کا وسوسہ آتے ہی اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ارشاد ہوا:

{اِنَّ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا اِذَا مَسَّهُمۡ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیۡطٰنِ تَذَكَّرُوۡا فَاِذَا هُمۡ مُّبۡصِرُوۡنَ}

''بیشک وہ جو ڈر والے ہیں جب انہیں کسی شیطانی خیال کی ٹھیس لگتی ہے، ہوشیار ہو جاتے ہیں، اُسی وقت ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں''۔(پ9، اعراف:201)

سوال یہ ہے کہ کیا جنتیں اُن کے لیے ہیں جن متقی مسلمانوں سے کبھی کوئی گناہ سرزد نہیں

ہوتا؟جواب میں یہ آیاتِ کریمہ ملاحظہ فرمایئے۔ارشاد ہوا:

{وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ٥ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ}(پ4،ال عمران:135)

”اور وہ کہ جب کوئی بے حیائی یا اپنی جانوں پر ظلم کریں، اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی چاہیں، اور گناہ کون بخشے سوا اللہ کے، اور اپنے کیے پر جان بوجھ کر اَڑ نہ جائیں، ایسوں کو بدلہ ان کے رب کی بخشش اور جنتیں ہیں“۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ جو گناہ سرزد ہونے کے فوراًبعد خوفِ خدا سے توبہ کرلیں،رب کریم انہیں بھی کئی جنتیں عطا فرمائے گا اور ان جنتوں میں نہریں رواں ہوں گی۔ جنت کی نہروں کے متعلق ارشادِ ربانی ہے،

{مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَ هُمْ}
(پ26، محمد:15)

”احوال اس جنت کا جس کا وعدہ پرہیز گاروں سے ہے،اس میں ایسی پانی کی نہریں ہیں جو کبھی نہ بگڑے (جن کا ذائقہ کبھی خراب نہ ہو)، اور ایسے دودھ کی نہریں ہیں جس کا مزہ نہ بدلے، اور ایسی شراب کی نہریں جس کے پینے میں لذت ہے (نشہ نہیں)، اور ایسی شہد کی نہریں ہیں جو صاف کیا گیا، اور ان کے لیے اس میں ہر قسم کے پھل ہیں اور اپنے رب کی مغفرت۔ کیا ایسے چین والے اُن کے برابر ہوجائیں گے جنہیں ہمیشہ آگ میں رہنا، اور انہیں کھولتا پانی پلایا جائے گا کہ آنتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کردے“۔

جنت میں عظیم نعمت:

جنت میں سب سے عظیم نعمت اللہ تعالیٰ کی رضامندی ہے۔

غیب بتانے والے آقا و مولیٰ ﷺ نے فرمایا: رب تعالیٰ اہلِ جنت سے فرمائے گا، اے اہلِ جنت! وہ عرض کریں گے، اے ہمارے رب! ہم حاضر ہیں، تیری اطاعت کے لیے تیار ہیں اور ہر بھلائی تیرے قبضے میں ہے۔

رب تعالیٰ فرمائے گا، کیا تم راضی ہو؟ وہ عرض کریں گے، اے رب! ہم کیوں نہ راضی ہوں، تو نے ہمیں وہ نعمتیں عطا فرمائیں جو کسی اور کو نہ ملیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، کیا میں تمہیں اس سے افضل نعمت عطا نہ کروں؟ وہ عرض کریں گے، اس سے افضل نعمت کیا ہو سکتی ہے؟ رب کریم فرمائے گا، میں تمہیں اپنی رضامندی عطا کرتا ہوں، اس کے بعد میں تم سے کبھی ناراض نہ ہوں گا۔[160]

رب تعالیٰ سے محبت کرنے والوں کی سب سے بڑی تمنا یہی ہے کہ وہ راضی ہو جائے، اور یہ عظیم نعمت اہلِ جنت کو نصیب ہو گی۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے:

{وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ} "اور اللہ کی رضا سب سے بڑی (ہے)"۔(پ10، توبہ:72)

اس جملے پر غور کیجیے، "اللہ ان سے راضی اور وہ اس سے راضی"۔ بظاہر اتنا کہنا ہی کافی تھا کہ اللہ اُن سے راضی۔ کیونکہ بندوں کے عمل اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بتانا مقصود تھا کہ میرے بندے راہِ حق کی مشکلات و مصائب پر پریشان نہیں ہوتے بلکہ تسلیم و رضا کا پیکر بن کر میری رضا میں راضی رہتے ہیں۔ لہٰذا فرمایا، میرے بندے بھی مجھ سے ہر حال میں راضی ہیں۔

راضی ہونے کی تین قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ بندہ قضائے الٰہی پر اعتراض نہ کرے اور یہ یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کیا بہتر کیا، گو ہمیں اس کی حکمتیں معلوم نہیں۔ رضا کی یہ قسم تمام بندوں پر لازم ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فیصلہ اور مشیت بندے کو محبوب ہو جائے خواہ بندے کی خواہش کے خلاف ہو کیونکہ محب کے نزدیک محبوب کا ہر فعل محبوب ہوتا ہے۔

رضا کی تیسری قسم یہ ہے کہ بندے کی ہر تمنا اور خواہش پوری ہو جائے۔ یہ رضا اور جزا ان کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔[161]

---

160 ...بخاری، کتاب الرقاق، حدیث:6549

161 ...تفسیر مظہری، توبہ، تحت الایۃ:72

رب کی خَشیَّتُ:

اس سورت کے آخر میں فرمایا گیا، جنت، اس کی نعمتیں اور رب کی رضا، یہ سب انعامات اُس کے لیے ہیں جو اپنے رب سے ڈرے۔

"خَشیَّتُ" اُس ڈر اور خوف کو نہیں کہا جاتا جو عذاب، سزا اور انتقام کے اندیشے سے ہو یا کسی دشمن یا موذی چیز سے ہو، بلکہ خَشیَّتُ اُس خوف کو کہتے ہیں جو کسی سے شدید محبت اور اس کی انتہائی عظمت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں وہ مجھ سے ناراض نہ ہو جائے۔ چنانچہ اگر کبھی بندے سے کوئی لغزش وخطا سرزد ہو جائے تو اسی خَشیَّتُ کی وجہ سے بندے کی آنکھوں سے ندامت وپشیمانی کے احساس سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ رب تعالیٰ نے قرآن کریم میں جہاں خَشیَّتُ کا ذکر کیا ہے وہاں اپنی صفتِ رحمان بھی بیان فرمائی ہے۔ ارشاد ہوا:

{مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبِ ۝ ادْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ}

"جو رحمن سے بے دیکھے ڈرتا ہے اور رجوع کرتا ہوا دل لایا، ان سے فرمایا جائے گا، جنت میں جاؤ سلامتی کے ساتھ"۔ (پ26، ق:33-34)

ارشاد ہوا: {اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ} (پ18، مومنون:57)

"بیشک وہ جو اپنے رب کے ڈر سے سہمے ہوئے ہیں"۔

اُمُّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سیدِ عالم ﷺ سے دریافت کیا، کیا اس آیت میں ان لوگوں کا بیان ہے جو شرابیں پیتے ہیں اور چوری کرتے ہیں؟

فرمایا، اے بنتِ صدیق! ایسا نہیں ہے۔ یہ اُن لوگوں کا ذکر ہے جو روزے رکھتے ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں، صدقات دیتے ہیں اور ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں یہ اعمال نامقبول نہ ہو جائیں۔[162]

عبادات کرنا اور رب تعالیٰ سے ڈرتے رہنا بندے کو خدا کا محبوب بنا دیتا ہے۔

162... ترمذی، کتاب تفسیر القران، حدیث:3175

تفسیر سورۃ الزلزال

سورۃُ الزلزلہ یا زلزال مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں آٹھ آیات ہیں۔ احادیث کے مطابق سورۃ الزلزال پڑھنے کا ثواب نصف قرآن کریم کے برابر ہے اور ایک روایت کے مطابق اس کا ثواب چوتھائی قرآن مجید کے برابر ہے۔ (ترمذی)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَهَا ۙ﴿۱﴾ وَ اَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ اَثۡقَالَهَا ۙ﴿۲﴾ وَ قَالَ الۡاِنۡسَانُ مَا لَهَا ۚ﴿۳﴾
يَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخۡبَارَهَا ۙ﴿۴﴾ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوۡحٰى لَهَا ؕ﴿۵﴾ يَوۡمَئِذٍ يَّصۡدُرُ النَّاسُ اَشۡتَاتًا ۙ لِّيُرَوۡا
اَعۡمَالَهُمۡ ؕ﴿۶﴾ فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ ؕ﴿۷﴾ وَ مَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۚ﴿۸﴾

"اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا (ہے)"

"جب زمین تھرتھرا دی جائے جیسا اس کا تھرتھرانا ٹھہرا ہے، اور زمین اپنے بوجھ باہر پھینک دے، اور آدمی کہے، اسے کیا ہوا۔ اُس دن وہ اپنی خبریں بتائے گی، اس لیے کہ تمہارے رب نے اسے حکم بھیجا۔ اُس دن لوگ اپنے رب کی طرف پھریں گے کئی راہ ہو کر، تاکہ اپنا کیا دکھائے جائیں، تو جو ایک ذرہ بھر بھلائی کرے، اُسے دیکھے گا اور جو ایک ذرہ بھر برائی کرے، اُسے دیکھے گا"۔

(کنز الایمان از اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ)

لفظی ترجمہ:

اِذَا	زُلۡزِلَتِ	الۡاَرۡضُ	زِلۡزَالَ	هَا
جب	ہلا دی جائے	زمین	زلزلہ	اپنے (سے)

وَ	اَخۡرَجَتِ	الۡاَرۡضُ	اَثۡقَالَ	هَا
اور	نکال دے	زمین	بوجھ	اپنے

وَ	قَالَ	الْاِنْسَانُ	مَا	لَ	هَا
اور	کہے	آدمی	کیا(ہوا)	لیے(کو)	اس

یَوْمَئِذٍ	تُحَدِّثُ	اَخْبَارَ	هَا
اُس دن	بتائے گی وہ	خبریں	اپنی

بِ	اَنَّ	رَبَّ	كَ	اَوْحٰی	لَ	هَا
اس لیے کہ	بیشک	رب(نے)	تمہارے	حکم بھیجا	واسطے(کو)	اس

یَوْمَئِذٍ	یَّصْدُرُ	النَّاسُ	اَشْتَاتًا	لِّ	یُرَوْا	اَعْمَالَ	هُم
اُس دن	گے پلٹ آئیں	لوگ	گروہ در گروہ	تاکہ	دکھائے جائیں وہ	اعمال	اپنے

فَ	مَنْ	یَّعْمَلْ	مِثْقَالَ	ذَرَّةٍ	خَیْرًا	یَّرَ	هٗ
پس	(وہ)جو	کرے	برابر	ذرہ	بھلائی	دیکھے گا وہ	اُسے

وَ	مَنْ	یَّعْمَلْ	مِثْقَالَ	ذَرَّةٍ	شَرًّا	یَّرَ	هٗ
اور	(وہ)جو	کرے	برابر	ذرہ	برائی	دیکھے گا وہ	اُسے

ربط و مناسبت:

اس سے قبل سورۃ البینۃ میں مومنوں اور کافروں کی جزاوسزا کا بیان تھا۔ جس سے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس جزاوسزا کا وقت کب آئے گا اور کن اعمال پر جزاوسزا ملے گی؟ یہ سورت اس سوال کے جواب پر مشتمل ہے۔

اس میں فرمایا گیا، قیامت کے دن سب لوگوں کے اعمال کا حساب ہو گا۔ جس نے بھی ذرہ بھر نیکی یا بدی کی ہو گی وہ اُس دن اُسے اپنے نامۂ اعمال میں موجود پائے گا اور اس پر جزاوسزا کا حقدار ہو گا۔ سابقہ سورت میں اُن لوگوں کا بھی ذکر ہوا جو گناہوں بھری زندگی گزارتے رہے اور انہوں نے

رب تعالیٰ اور اس کے محبوب رسول ﷺ کے دینِ حق کی کچھ پرواہ نہ کی۔ اگر نیک لوگ دنیا میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری میں زندگی گزاریں اور برے لوگ شیطان اور نفسانی خواہشات کی بندگی میں گناہ آلود زندگی بسر کریں تو دونوں ہرگز برابر نہیں ہوسکتے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے عدل کا تقاضا ہے کہ وہ نیک لوگوں کو جزا اور بُرے لوگوں کو سزا دے۔ یہی جزا و سزا کا مضمون اس سورت میں بیان ہوا ہے۔

سورۃ البینۃ کا اختتام اس بات پر ہوا تھا کہ رب تعالیٰ کی رضا اور جنت اس کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے۔ ربِ ذوالجلال کی خشیت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بندے کو اپنے رب کے سامنے حاضر ہونے اور اپنے اعمال کے متعلق جوابدہ ہونے کا کامل یقین ہو۔ یہ یقین پیدا کرنے کے لیے آخرت کا عقیدہ اس سورت میں اور اگلی سورتوں میں بھی بیان کیا گیا تاکہ بندہ اپنے اعمال کا محاسبہ کرتا رہے اور اپنے رب کی ناراضگی سے بچنے کی بھرپور کوشش کرتا رہے۔

شانِ نزول:

عقیدۂ آخرت پر پختہ یقین ہی انسان کے افکار و اعمال کی اصلاح کا ضامن ہے۔ کفار رسولِ معظم ﷺ سے یہ بات سن کر حیران ہوتے کہ ایک دن قیامت آئے گی اور سب انسانوں کو پھر سے زندہ کر کے رب تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیا جائے گا۔

ان کے اذہان اس حقیقت کو ماننے پر تیار نہ تھے کہ اس فانی زندگی کے بعد ایک دائمی زندگی بھی ہے۔ سورۃ الزلزال اور اس کے بعد کی کئی سورتیں ایسے لوگوں کو ہدایت کی روشنی دینے کے لیے عمدہ دلائل اور علمی حقائق پر مبنی ہیں۔

مفسرین فرماتے ہیں، ابتدا میں بعض مسلمانوں کے ذہن میں خیال تھا کہ معمولی برائی پر گناہ نہیں ہوگا اور تھوڑی چیز صدقہ دینے پر ثواب نہیں ملے گا۔ اس سورت میں ان مسلمانوں کے مذکورہ خیال کی اصلاح بھی فرمادی گئی اور بتادیا گیا کہ نیکی یا بدی خواہ ذرہ بھر ہی کیوں نہ ہوں، جزا و سزا کا باعث ہوتے ہیں۔

سورۃ الزلزال کو نصف قرآن فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن عظیم کے احکام دو قسم کے

ہیں۔ دنیاوی احکام اور احکامِ آخرت۔ یہ سورت آخرت کے احکام کا خلاصہ ہے اس لیے اس کا ثواب نصف قرآن کریم کے برابر ہے۔

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا:

ارشاد ہوا: ”جب زمین تھر تھرا دی جائے جیسا اس کا تھر تھرانا ٹھہرا ہے“۔

ایسا زوردار جھٹکا جس سے زمین تھر تھرا اُٹھے اور لرزنے لگ جائے، اسے زلزلہ کہتے ہیں۔ ”زِلْزَالَهَا“ کے لفظ میں شدت اور تسلسل دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے یعنی زمین کا ہلایا جانا نہایت شدید ہوگا اور زمین مسلسل ہلتی رہے گی، یہاں تک کہ سب کچھ تہ و بالا ہو جائے گا۔

اس آیت میں اُس ہیبت ناک زلزلے کا ذکر ہے جو پہلا صور پھونکے جانے پر وقوع پذیر ہوگا اور قیامت واقع ہونے کا سبب بنے گا۔ ارشاد ہوا:

{وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ} (پ24، زمر:68)

”اور صور پھونکا جائے گا تو بے ہوش ہو جائیں گے جتنے آسمانوں میں ہیں اور جتنے زمین میں مگر جسے اللہ چاہے، پھر وہ دوبارہ پھونکا جائے گا جبھی وہ (حیرت سے) دیکھتے ہوئے کھڑے ہو جائیں گے“۔

اُس دن پوری زمین نہایت شدت سے ہلا دی جائے گی اور زمین پر کوئی درخت، کوئی عمارت، کوئی پہاڑ باقی نہ رہے گا، ہر چیز ٹوٹ پھوٹ جائے گی اور تمام جاندار مخلوق فنا ہو جائے گی۔

غیب بتانے والے آقا و مولیٰ ﷺ کا فرمان ہے، خریدار اور دوکاندار کے درمیان کپڑا پھیلا ہوگا، نہ سودا مکمل ہوگا نہ وہ کپڑا لپیٹ سکے گا کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔ یعنی لوگ اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہونگے اور وہ کام ویسے ہی نا تمام رہ جائیں گے، نہ انہیں خود پورا کر سکیں گے نہ کسی دوسرے سے پورا کرنے کو کہہ سکیں گے، اور جو گھر سے باہر گئے ہونگے وہ واپس نہ آسکیں گے۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

{فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ}

”تو نہ وصیت کر سکیں گے اور نہ اپنے گھر پلٹ کر جائیں گے“۔ (پ23، یس:50)

رب تعالیٰ نے اُس دن کی ہولناکی کو دوسرے مقام پر یوں بیان فرمایا ہے،

{يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ o يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ}

"اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو۔ بیشک قیامت کا زلزلہ بڑی سخت چیز ہے۔ جس دن تم اسے دیکھو گے ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے کو بھول جائے گی، اور ہر گابھنی اپنا گابھ (یعنی حمل) ڈال دے گی، اور تو لوگوں کو دیکھے گا جیسے نشہ میں ہیں، اور وہ نشہ میں نہ ہونگے مگر ہے یہ کہ اللہ کی مار کڑی ہے (یعنی اس کا عذاب بہت سخت ہے)"۔(پ17،حج:1-2)

مقامِ غور ہے کہ قیامت کے اثر اور ہیبت سے زمین جیسی بے جان اور جامد چیز کانپنے لگے گی تو اے انسان! کیا قیامت کے ذکر سے تیرا دل بھی کانپتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو تیرا دل مردہ ہو چکا، اسے خوفِ خدا اور محبتِ رسول ﷺ سے زندہ کر۔

بعض علماء کا قول ہے کہ دوسری بار صور پھونکنے کے وقت جو زلزلہ آئے گا، یہاں اس کا ذکر ہو رہا ہے، جیسا کہ بعد کی آیات سے اندازہ ہوتا ہے۔ اس زلزلے سے زمین کے نشیب و فراز ختم کر کے اسے ہموار میدان بنا دیا جائے گا۔ پھر اس ہموار زمین پر میدانِ محشر قائم ہو گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

{فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا o لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا}

"وہ زمین کو نہایت ہموار صاف میدان کر دے گا کہ تُو اس میں کچھ بھی اونچا نیچا نہیں دیکھے گا"۔(پ16،طہ:106-107)

وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا:

ارشاد ہوا: "اور زمین اپنے بوجھ باہر پھینک دے"۔ معنی یہ ہے کہ رب تعالیٰ کے حکم سے زمین، جو کچھ اس میں ہے یعنی خزانے اور مُردے سب باہر نکال دے گی۔

تمام مردے جو زمین میں دفن ہوتے رہے، ان کے اجزاء اور ذرات اگر مٹی بھی ہو چکے ہوں گے تو بھی ان کو یکجا کر کے زندہ کر دیا جائے گا۔ ارشادِ ربانی ہے،

{قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ o قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ}

”(کافر) بولا، ایسا کون ہے کہ ہڈیوں کو زندہ کرے جب وہ بالکل گل گئیں؟ (اے حبیب ﷺ) تم فرماؤ! انہیں وہ زندہ کرے گا جس نے پہلی بار انہیں بنایا، اور اسے ہر پیدائش کا علم ہے“۔ (پ23، یس:78-79)

زمین کی تہوں میں جتنے خزانے پوشیدہ ہیں، وہ بھی سب ظاہر کر دیے جائیں گے لیکن اس دن کی ہیبت اس قدر ہو گی کہ کوئی ان خزانوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔

سرکارِ دوعالم ﷺ کا ارشاد ہے، زمین اپنے جگر کے ٹکڑوں کو سونے چاندی کے ستونوں کی صورت میں باہر نکال دے گی۔ قاتل آئے گا اور کہے گا، ہائے افسوس! میں نے ان خزانوں کی وجہ سے قتل کیا تھا۔

قطع رحمی کرنے والا کہے گا، ہائے! میں نے ان کی خاطر خونی رشتہ داروں کو چھوڑا تھا۔ چور کہے گا، ہائے! ان چیزوں کی خاطر میرا ہاتھ کاٹا گیا تھا۔ پھر وہ سب ان چیزوں کو چھوڑ دیں گے اور ان میں سے کچھ بھی نہیں لیں گے۔ [163]

اس طرح انسان کو خوب افسوس اور پشیمانی ہو گی کہ جن خزانوں کی خاطر میں نے اتنے بڑے جرائم کیے، آج ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ آج کے دن ہر شخص کو صرف ایک فکر ہے اور وہ ہے اعمال نامے کی۔

آج اس دنیا میں مادّی چیزوں کو ترازو میں تولا جا سکتا ہے لیکن خلوص، سچائی، دیانت اور نیکیوں کو کسی ترازو میں نہیں تولا جا سکتا۔ قیامت میں دنیا فنا ہونے کے ساتھ اس کا یہ نظام بھی فنا کر دیا جائے گا اور ایک نیا نظام قائم کیا جائے گا۔ ارشادِ الٰہی ہے: {يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ} (پ13، ابراہیم:48)

”جس دن بدل دی جائے گی زمین اِس زمین کے سوا، اور آسمان، اور لوگ سب نکل کھڑے ہوں گے ایک اللہ کے سامنے جو سب پر غالب ہے“۔

اس نئے نظام میں سونے چاندی کی کوئی وقعت نہ ہو گی، صرف اعمال کی قدر ہو گی۔ اس لیے ایسی

163 ... مسلم، کتاب الزکاۃ، باب الترغیب فی الصدقۃ قبل ان لا یوجد من یقبلها، حدیث:1013

میزان قائم کر دی جائے گی جس میں نیکی بدی، سچ جھوٹ، اخلاص ریاکاری، دیانت خیانت یعنی سب اچھے بُرے اعمال تولے جاسکیں گے۔

{وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ٥ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهُ فَأُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ} (پ8، اعراف:8-9) ”اور اُس دن تول ضرور ہونی ہے تو جن کے پلّے بھاری ہوئے وہی مراد کو پہنچے۔ اور جن کے پلّے ہلکے ہوئے، تو وہی ہیں جنہوں نے اپنی جان گھاٹے میں ڈالی، اُن (زیادتیوں) کا بدلہ جو ہماری آیتوں پر کرتے تھے“۔

وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَا:

ارشاد ہوا: ”اور آدمی کہے، اسے کیا ہوا“۔ مفسرین فرماتے ہیں: یہاں انسان سے مراد وہ لوگ ہیں جو قیامت کے وقت زمین پر موجود ہونگے، وہ تعجب اور حیرانی سے بول اُٹھیں گے، زمین کو کیا ہو گیا ہے؟

انسان کے اس قول پر غور کیجیے۔ اس میں خوف بھی ہے، اضطراب بھی۔ بے چینی بھی ہے، پریشانی بھی۔ کیونکہ زمین پوری شدت سے تھر تھرا رہی ہے، اس کے خزانے باہر پڑے ہوئے ہیں کوئی لینے والا نہیں ہے، پورا نظام درہم برہم ہو چکا ہے۔

اس دن کی منظر کشی ایک اور مقام پر یوں کی گئی ہے،

{اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ٥ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ٥ وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ٥ وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ٥ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ٥ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ٥ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ٥ وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ٥ بِاَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ}

”جب دھوپ لپیٹی جائے، اور جب تارے جھڑ پڑیں، اور جب پہاڑ چلائے جائیں، اور جب تھلکی (گابھن) اونٹنیاں چھوٹی پھریں، اور جب وحشی جانور جمع کیے جائیں، اور جب سمندر سلگائے جائیں، اور جب جانوں کے جوڑ بنیں، اور جب زندہ دبائی ہوئی (لڑکی) سے پوچھا جائے، کس خطا پر ماری گئی“۔ (پ30، تکویر:1-9)

پہلی مرتبہ صور پھونکے جانے اور دوسری مرتبہ صور پھونکنے کے درمیان چالیس سال کا وقفہ ہو گا۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ ان دونوں صور پھونکنے کی درمیانی مدت میں رب تعالیٰ کافروں پر سے عذاب اُٹھالے گا۔

پھر جب دوسری بار صور پھونکا جائے گا اور تمام مُردے زندہ کیے جائیں گے، اس وقت انسان کہے گا، زمین کو کیا ہو گیا؟ یہاں انسان سے مراد کافر ہیں جو قیامت کے ہولناک مناظر دیکھ کر چیخ اُٹھیں گے اور:-

{قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا}(پ23، یس:52)

"کہیں گے، ہائے ہماری خرابی! کس نے ہمیں سوتے سے جگا دیا"۔

جبکہ اہلِ ایمان جب مردوں کو قبروں سے نکلتا دیکھیں گے تو اُن کا علمُ الیقین ترقی پا کر عینُ الیقین کی منزل پر پہنچ جائے گا، اور وہ کہیں گے،

{هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ}(پ23، یس:52)

"یہ ہے وہ جس کا رحمٰن نے وعدہ دیا تھا اور رسولوں نے حق فرمایا تھا"۔

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا:

پھر ارشاد ہوا: "اُس دن وہ اپنی خبریں بتائے گی"۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آقا و مولیٰ ﷺ نے یہ آیت تلاوت کی اور فرمایا، کیا تم جانتے ہو کہ زمین کیا خبریں دے گی؟ صحابہ نے عرض کی، اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی خوب جانتے ہیں۔ فرمایا، اس کی خبریں یہ ہیں کہ یہ ہر مرد و عورت کے بارے میں گواہی دے گی کہ اس نے میری پشت پر فلاں فلاں دن یہ یہ کام کیے، یہی اس کی خبریں ہیں۔ [164]

ایک اور حدیث شریف میں ارشاد ہوا: زمین پر محتاط رہو۔ یہ تمہاری ماں ہے، اس پر جس نے بھی اچھا یا بُرا عمل کیا، یہ اس کے بارے میں ضرور خبر دے گی۔ (دُرِ منثور)

رب تعالیٰ اگر چاہے تو محض اپنے علم ہی کی بنیاد پر نیکوں کو جزا اور بُروں کو سزا دے دے لیکن وہ

164 ... ترمذی، کتاب تفسیر القران، باب و من سورۃ اذا زلزلت الارض، حدیث: 3353

انسانی سوچ کے لحاظ سے عدل وانصاف کے ظاہری تقاضے پورے فرمائے گا۔ فردِ جرم کے طور پر ہر شخص کا اعمال نامہ اس کے ہاتھ میں پکڑادیا جائے گا۔ پھر اس پر گواہیاں پیش کی جائیں گی اور یہ گواہ ہر قسم کے ہونگے۔ انسان کے ہاتھ اور پاؤں، اللہ تعالیٰ کے حکم سے بولنا شروع کر دیں گے۔

{اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤی اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَاۤ اَیْدِیْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ} (پ23،یس:65)

”آج ہم اُن کے مونہوں پر مہر کر دیں گے (کہ وہ بول نہ سکیں) اور اُن کے ہاتھ ہم سے بات کریں گے اور اُن کے پاؤں اُن کے کئے کی گواہی دیں گے“۔

انسان کے کان، آنکھ اور اس کی کھال بھی اسکے خلاف گواہی دے گی۔ ارشاد ہوا:

{شَهِدَ عَلَیْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۝وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَیْنَا قَالُوْۤا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْۤ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ}

”اُن کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کے چمڑے سب ان پر اُن کے کئے کی گواہی دیں گے۔ اور وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے، تم نے ہم پر کیوں گواہی دی؟ وہ کہیں گے ہمیں اللہ نے بلوایا جس نے ہر چیز کو گویائی بخشی“۔(پ24، حم السجدہ:19-21)

ذرا سوچیے تو سہی! وہ کیسا منظر ہوگا جب انسان کے ہاتھ پاؤں اس کے کئے کی گواہی دے رہے ہونگے، اس کے کان اور آنکھیں اور اس کی کھال اس کے خلاف بول رہی ہو گی۔ پھر زمین بھی بولنا شروع کر دے گی، اس شخص نے میرے فلاں حصے پر فلاں وقت یہ یہ گناہ کیے۔ غرض یہ کہ کوئی بات ایسی نہ رہے گی جس پر وہ اپنی گواہی پیش نہ کرے۔

سابقہ زمانے کے لوگ تو شاید زمین کے اس طرح خبریں بیان کرنے پر تعجب کرتے ہونگے مگر اس جدید دور کے انسان کو اس پر قطعاً حیران نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہ اپنی آنکھوں سے ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیپ ریکارڈ، ویڈیو اور الیکٹرانکس کے نت نئے آلات دیکھ رہا ہے۔ اور تو اور کمپیوٹر کی ایک چھوٹی سی چِپ (Chip) میں اور موبائیل فون کی حقیر سی سِم (Sim) میں ہزاروں لاکھوں صفحات محفوظ کیے جاسکتے ہیں۔

تو پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اعضاء اور کھال میں اور زمین کے ذرات میں ایسی صلاحیت رکھ دی ہو کہ انسان کے تمام اعمال اس میں محفوظ کیے جارہے ہوں، اس کی آوازیں فضامیں محفوظ ہو رہی ہوں اور اس کے اعمال زمین پر ثبت ہو رہے ہوں۔ پھر قیامت کے دن یہ سب کچھ ایک متحرک منظر کی طرح انسان کے سامنے آجائے اور زمین ساری خبریں بیان کر دے۔

بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا:

اسی لیے فرمایا گیا کہ زمین اُس دن اپنی ساری خبریں اس لیے بتائے گی کیونکہ تمہارے رب نے اسے یہ حکم دیا ہو گا۔

سابقہ آیت کریمہ کے تحت مذکور آیاتِ مبارکہ اور اس آیت مقدسہ سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے انسان کے اعضاء بولنے لگیں گے اور اسی کے حکم سے زمین بھی کلام کرے گی۔ یہ حقیقت ہے کہ جو چیز بھی کلام کرتی ہے وہ رب تعالیٰ کی دی ہوئی طاقت سے ہی کلام کرتی ہے۔

اگر غور کیا جائے تو زبان بھی تو گوشت کا ایک ٹکڑا ہی ہے لیکن گوشت کے دیگر ٹکڑے تو ساکت رہتے ہیں مگر زبان بولتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ تمام تر کوشش کے باوجود اس کا یہی جواب ملے گا کہ ایک قادرِ مطلق ہستی نے اسے ناطق بنا دیا ہے۔

حق یہی ہے کہ وہ چاہے تو گوشت کے ایک ٹکڑے کو بولنے کی طاقت بخش دے، وہ چاہے تو ایک نرم ہڈی یعنی کان میں سننے کی صلاحیت رکھ دے، وہ چاہے تو چکنائی کے ایک ٹکڑے یعنی آنکھ میں دیکھنے کی قوت پیدا فرما دے تو اس کے لیے کیا مشکل ہے کہ وہ زمین کو بھی بولنے کی صلاحیت عطا فرما دے۔ آج رب تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ زمین خاموش رہے لیکن قیامت کے دن اُس کی مرضی یہ ہو گی کہ زمین ناطق ہو جائے، تو زمین اس کے حکم سے بولنا شروع کر دے گی۔

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ۔۔۔:

ارشاد ہوا: ”اُس دن لوگ اپنے رب کی طرف پھریں گے کئی راہ ہو کر، تاکہ اپنا کیا دکھائے جائیں“۔

ایک مفہوم یہ ہے کہ اُس دن لوگ جب قبروں سے اُٹھیں گے تو بارگاہِ الٰہی میں الگ الگ آئیں

گے، کوئی کسی کا ساتھی نہ ہو گا، اور ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ حساب ہو گا۔

اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ مختلف اعمال کی بناء پر لوگوں کے الگ الگ گروہ بن جائیں گے۔ جیسے نمازیوں کا گروہ، شہیدوں کا گروہ، چوروں کا گروہ، بدکاروں کا گروہ وغیرہ۔ مختصر یہ کہ ہر شخص اپنے جیسے لوگوں کے ساتھ مل کر اپنے انجام کو پہنچے گا۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "لِّیُرَوۡا اَعۡمَالَهُمۡ" کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے اعمال کی جزا دیکھیں گے یعنی وہ حساب کی جگہ سے پلٹیں گے تاکہ جنت یا جہنم میں اپنے ٹھکانے پر پہنچیں۔ (165)

فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ....:

ابتدا میں لوگوں کا خیال تھا کہ بہت تھوڑی چیز صدقہ دی تو اُنہیں کوئی اجر نہیں ملے گا اور بعض کی رائے یہ تھی کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر کوئی گناہ نہیں ہو گا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ ارشاد ہوا: "تو جو ایک ذرہ بھر بھلائی کرے، اُسے دیکھے گا اور جو ایک ذرہ بھر برائی کرے، اُسے دیکھے گا"۔

ان آیات کو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فیصلہ کُن آیات قرار دیتے تھے۔ ان آیات میں چھوٹی نیکیوں کی طرف رغبت دلائی گئی ہے اور چھوٹے گناہوں کو ہلکا سمجھنے سے تنبیہ فرمائی گئی ہے۔ نیز یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ انسان کا کوئی عمل معمولی سمجھ کر ضائع نہیں کیا جاتا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

{یَوۡمَ یَبۡعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِیۡعًا فَیُنَبِّئُهُمۡ بِمَا عَمِلُوۡا اَحۡصٰهُ اللّٰهُ وَنَسُوۡهُ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ شَهِیۡدٌ}

(پ28، مجادلہ:6)

"جس دن اللہ سب کو اُٹھائے گا پھر اُنہیں اُن کے اعمال جتا دے گا۔ اللہ نے اُنہیں گن رکھا ہے اور وہ بھول گئے، اور ہر چیز اللہ کے سامنے ہے"۔

آقا و مولیٰ ﷺ کا ارشاد ہے، "کسی نیکی کو حقیر مت سمجھو اگرچہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے خندہ پیشانی سے ملنا ہو"۔ (166)

سرکارِ دو عالم ﷺ نے یہ بھی فرمایا، "جس نے پاکیزہ رزق سے کھجور کے برابر بھی صدقہ کیا، کیونکہ

165... تفسیر مظہری، زلزال، تحت الآیۃ:6

166... ابو داود، کتاب اللباس، حدیث:4084۔

اللہ تعالیٰ پاکیزہ رزق کو قبول فرماتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس رزق کو اپنے دستِ قدرت میں لے لیتا ہے اور اس کی پرورش کرتا ہے جیسے تم بچھڑے کی پرورش کرتے ہو یہاں تک کہ وہ صدقہ ایک پہاڑ کی مانند ہو جاتا ہے"۔ (167)

کسی صغیرہ گناہ کو یہ سمجھ کر نہ کیا جائے کہ یہ چھوٹا گناہ ہے۔ کیونکہ جب بندہ صغیرہ گناہوں کا عادی ہو جائے تو اس کا کبیرہ گناہوں کے وبال میں گرفتار ہو جانا آسان ہو جاتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: تم ایسے اعمال کرتے ہو جو تمہاری نظروں میں بال سے بھی زیادہ باریک (یعنی بہت معمولی) ہیں، ہم حضور ﷺ کے زمانے میں انہیں ہلاک کر دینے والے اعمال خیال کرتے تھے۔ (168)

حقیقت بھی یہی ہے کہ آگ کی ایک معمولی سی چنگاری ساری دنیا کو جلانے کے لیے کافی ہے۔ اسی لیے چھوٹے گناہ کو بھی معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔

غیب جاننے والے آقا ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے، چھوٹے گناہوں سے بھی بچو کیونکہ ان کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے پوچھ ہوگی۔ (ابن ماجہ)

یعنی عمل چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، اس کے متعلق حساب ضرور دینا پڑے گا۔ رب تعالیٰ کا میزان ایسا ہے کہ اس پر رائی کے برابر عمل بھی تولا جائے گا۔ ارشاد ہوا:

{وَنَضَعُ الْمَوَازِیْنَ الْقِسْطَ لِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْئًا وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَیْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِیْنَ} "اور ہم عدل کی ترازوئیں رکھیں گے قیامت کے دن، تو کسی جان پر کچھ ظلم نہ ہوگا۔ اور اگر کوئی چیز رائی کے دانہ کے برابر ہو تو ہم اسے لے آئیں گے اور ہم کافی ہیں حساب کو"۔ (پ17، انبیاء 47)

کافر کی نیکی برباد:

آخر میں ایک شبہ کا جواب دینا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ کافر اگر دنیا میں نیک کام کریں تو کیا وہ بھی اجر پائیں گے؟ چند آیات مبارکہ ملاحظہ فرمائیں۔

{وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْیَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْیُهُمْ مَّشْكُوْرًا} (پ15، بنی

167... بخاری، کتاب الزکوٰۃ، حدیث: 1410۔ 168... بخاری، کتاب الرقاق، حدیث: 6492۔

اسرائیل:19)

”اور جو آخرت چاہے اور اس کی سی کوشش کرے اور ہو ایمان والا، تو اُنہیں کی کوشش ٹھکانے لگی“۔

{وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا}(پ18، فرقان:23)

”اور جو کچھ انہوں نے کام کیے تھے ہم نے قصد فرما کر انہیں باریک باریک غبار کے بکھرے ہوئے ذرے کر دیا کہ روزن کی دھوپ میں نظر آتے ہیں“۔

{اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ لَیْسَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِیْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ}(پ11، ھود:16)

”یہ ہیں وہ جن کے لیے آخرت میں کچھ نہیں مگر آگ، اور اکارت گیا جو کچھ وہاں کرتے تھے، اور نابود ہوئے جو ان کے عمل تھے“۔

مفسرین کرام کی ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ ”کافر جو بھی نیک کام کرے گا اس کو اس بھلائی کا اجر دنیا ہی میں دے دیا جائے گا، آخرت میں اس کے لیے کوئی اجر نہیں۔ اور اگر کافر کوئی برا کام کرے گا تو آخرت میں اسے کفر کی سزا کے علاوہ اس برائی کی بھی سزا دی جائے گی“۔[169]

دوسرا قول یہ ہے کہ کافر کے کفر کے عذاب میں تو یقیناً کوئی کمی نہیں ہوگی البتہ یہ ممکن ہے کہ کافر کی بعض نیکیوں کی وجہ سے اس کے دیگر گناہوں کے عذاب میں تخفیف ہو جائے۔ علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”حدیثِ بخاری میں ہے کہ ابو لہب کے عذاب میں محض اس بناء پر تخفیف ہوتی ہے کہ اس نے حضورِ اکرم ﷺ کی ولادتِ باسعادت کی خوشی منائی تھی اور حضور ﷺ کی پیدائش کی خوشخبری سنانے کی وجہ سے اپنی لونڈی ثویبہ کو آزاد کر دیا تھا“۔

169... تفسیر قرطبی، ھود، تحت الآیۃ:16

تفسیر سورۃ العادیات

سورۃ العادیات مکہ میں نازل ہوئی۔ اس میں گیارہ آیات ہیں۔ حضور ﷺ نے اس سورت کی تلاوت کا ثواب بھی نصف قرآن کریم کے برابر قرار دیا ہے۔[170]

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۰

وَ الۡعٰدِیٰتِ ضَبۡحًا ۙ﴿۱﴾ فَالۡمُوۡرِیٰتِ قَدۡحًا ۙ﴿۲﴾ فَالۡمُغِیۡرٰتِ صُبۡحًا ۙ﴿۳﴾ فَاَثَرۡنَ بِہٖ نَقۡعًا ۙ﴿۴﴾
فَوَسَطۡنَ بِہٖ جَمۡعًا ۙ﴿۵﴾ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لِرَبِّہٖ لَکَنُوۡدٌ ۚ﴿۶﴾ وَ اِنَّہٗ عَلٰی ذٰلِکَ لَشَہِیۡدٌ ۚ﴿۷﴾ وَ اِنَّہٗ لِحُبِّ
الۡخَیۡرِ لَشَدِیۡدٌ ؕ﴿۸﴾ اَفَلَا یَعۡلَمُ اِذَا بُعۡثِرَ مَا فِی الۡقُبُوۡرِ ۙ﴿۹﴾ وَ حُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوۡرِ ﴿ۙ۱۰﴾ اِنَّ
رَبَّہُمۡ بِہِمۡ یَوۡمَئِذٍ لَّخَبِیۡرٌ ﴿۱۱﴾

”اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا (ہے)“

”قسم اُن کی جو دوڑتے ہیں سینے سے آواز نکلتی ہوئی، پھر پتھروں سے آگ نکالتے ہیں سُم مار کر، پھر صبح ہوتے تاراج کرتے ہیں، پھر اُس وقت غبار اُڑاتے ہیں، پھر دشمن کے بیچ لشکر میں جاتے ہیں، بے شک آدمی اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے اور بیشک وہ اس پر خود گواہ ہے۔ اور بیشک وہ مال کی چاہت میں ضرور کرّا (تیز) ہے۔

تو کیا نہیں جانتا جب اُٹھائے جائیں گے جو قبروں میں ہیں اور کھول دی جائے گی جو سینوں میں ہے۔ بیشک اُن کے رب کو اُس دن اُن کی سب خبر ہے“۔

(کنز الایمان از اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ)

لفظی ترجمہ:

وَ	الۡعٰدِیٰتِ	ضَبۡحًا
قسم	تیز دوڑنے والوں (کی)	ہانپتے ہوئے

170... در منثور، عادیات

فَ	الْمُوْرِيٰتِ	قَدْحًا
پھر	پتھروں سے آگ نکالنے والوں (کی)	سُم مار کر

فَ	الْمُغِيْرٰتِ	صُبْحًا
پھر	حملہ کرنے والوں (کی)	صبح کے وقت

فَ	اَثَرْنَ	بِ	هٖ	نَقْعًا
پھر	اُڑاتے ہیں وہ	ساتھ	اس (کے)	غبار

فَ	وَسَطْنَ	بِهٖ	جَمْعًا
پھر	گھس جاتے ہیں وہ	اُس وقت	لشکر (میں)

اِنَّ	الْاِنْسَانَ	لِ	رَبِّ	هٖ	لَ	كَنُوْدٌ
بیشک	آدمی	واسطے (کا)	رب	اپنے	البتہ	ناشکرا (ہے)

وَ	اِنَّ	هٗ	عَلٰى	ذٰلِكَ	لَ	شَهِيْدٌ
اور	بیشک	وہ	پر	اس	البتہ	گواہ (ہے)

وَ	اِنَّ	هٗ	لِ	حُبِّ	الْخَيْرِ	لَ	شَدِيْدٌ
اور	بیشک	وہ	واسطے میں)	محبت	مال (کی)	ضرور	سخت (ہے)

اَ	فَ	لَا	يَعْلَمُ	اِذَا	بُعْثِرَ	مَا	فِي	الْقُبُوْرِ
کیا	پس	نہیں	جانتا	جب	اُٹھائے جائیں گے	جو	میں (ہیں)	قبروں

الصُّدُوْرِ	فِي	مَا	حُصِّلَ	وَ
سینوں	میں (ہے)	جو	کھول دیا جائے گا	اور

خَبِيْرٌ	لَ	يَوْمَئِذٍ	هِمْ	بِ	هُمْ	رَبَّ	اِنَّ
باخبر	البتہ	اُس دن	اُن (کے)	ساتھ	اُن (کا)	رب	بیشک

ربط و مناسبت:

سورۃ الزلزال میں قیامت کی منظر کشی کر کے نیک اور برے لوگوں کا انجام بتایا گیا تاکہ سلیمُ الفطرت نیکی کی طرف راغب ہوں جبکہ سورۃ العادیات میں انسان کی ناشکری، لالچ اور احسان فراموشی کا ذکر کرکے اسے تنبیہ کی گئی ہے۔

سابقہ سورت میں کفار کو آخرت کے نقصان سے آگاہ کیا گیا تھا اس سورت میں دنیاوی عذاب اور نقصان سے ڈرایا گیا ہے۔ پچھلی سورت میں خیر و شر پر جزاو سزا بیان کی گئی تھی اس سورت میں اُس شخص کو سرزنش کی گئی ہے جو دنیا کے لالچ میں اپنی آخرت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

سورۃ الزلزال میں زمین کے اپنے بوجھ باہر نکال دینے کا ذکر تھا اس سورت میں قبروں سے مردوں کے اٹھائے جانے کا ذکر بھی ہے اور ان کے سینوں میں چھپی نیکی یا بدی ظاہر کرنے کا اعلان بھی۔

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا:

"العادِیَات" کا مطلب ہے تیز دوڑنے والیاں ،اور "الضبح" سے مراد وہ آواز ہے جو تیز دوڑتے وقت گھوڑے کے سینے سے نکلتی ہے۔

جمہور علماء کا قول ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے غازیوں کے گھوڑوں کی قسم ارشاد فرمائی گئی ہے جو بہت تیز دوڑتے ہیں۔[171]

---

171 ...روح المعانی، عادیات، تحت الآیۃ: 1

اس بناء پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی راہ میں جہاد کرنے والے اس قدر پسند ہیں کہ اُس نے اُن کی سواری کے جانوروں کی قسم ارشاد فرمائی۔

یہ بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ قسم کا بنیادی مقصد مخاطب کو اس بات کا یقین دلانا ہوتا ہے کہ جس بات پر قسم اُٹھائی جارہی ہے، وہ سچ اور یقینی ہے۔ قرآن مجید میں جہاں بھی قسمیں ارشاد فرمائی گئی ہیں وہاں عموماً دو صورتیں ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ محبوب اور اس سے متعلق چیزوں کی قسم یا دینی شعائر کی قسم ارشاد فرمائی گئی مثلاً: لَعَمْرُكَ (اے محبوب! تمہاری زندگی کی قسم)، وَقِيْلِهٖ (تمہارے قول کی قسم)، وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ (قرآن مجید کی قسم)، وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ (اس امان والے شہر کی قسم)، وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا (قسم ان فرشتوں کی کہ باقاعدہ صف باندھیں) وغیرہ۔

ان لوگوں یا چیزوں کی قسم ارشاد فرمانے میں ان کی محبوبیت اور تقدیس و عظمت ملحوظ ہوتی ہے۔ اگرچہ بعد میں جو مضمون بیان ہوتا ہے، اُس کا اُن بیان کردہ قسموں سے گہرا تعلق بھی ہوتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ قرآن کریم میں کائنات کی مختلف چیزوں کی قسمیں ارشاد فرمائی گئی ہیں مثلاً: وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا (سورج اور اس کی روشنی کی قسم)، وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا (اور چاند کی قسم جب اسکے پیچھے آئے)، وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى (رات کی قسم جب چھائے)، وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى (اور دن کی قسم جب چمکے)، وَ الصُّبْحِ (صبح کی قسم)، وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ (آسمان کی قسم اور رات کو آنے والے کی) وغیرہ۔

ان چیزوں کی قسم ارشاد فرمانے میں ان کی عظمت و محبوبیت کا اظہار مقصود نہیں ہوتا بلکہ ان مظاہرِ قدرت کو بطور دلیل و گواہ کے ذکر کیا جاتا ہے تاکہ انسان قدرتِ الٰہیہ کی ان نشانیوں کو محض سرسری طور پر نہ دیکھے بلکہ ان کی تخلیق میں غور و فکر کرے۔

دراصل قرآن کریم بیک وقت عالم کو بھی تعلیم دیتا ہے اور جاہل کو بھی۔ چھوٹے کو بھی اور بڑے کو بھی۔ اور یہ قرآن عظیم کا معجزہ ہے کہ وہ روزمرہ کے مشاہدے کی چیزوں کے ذریعے انسان کو اللہ تعالیٰ کی معرفت کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر بندہ ان مظاہرِ قدرت کی حکمت کو سمجھ لے تو پھر اُٹھتے بیٹھتے، صبح

وشام، سورج وچاند اور پہاڑ وسمندر دیکھ کر اسے رب کریم کی صفات کے جلوے نظر آنے لگتے ہیں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سورت کی ابتدائی پانچ آیات میں تیز دوڑنے والے گھوڑوں کی جو صفات بیان ہوئی ہیں، اُن کا آگے بیان کردہ مضمون سے کیا ربط و تعلق ہے؟ ان آیات میں ارشاد ہوا:

”قسم ہے اُن کی جو تیز دوڑتے ہیں تو ان کے سینوں سے آواز نکلتی ہے۔ جب وہ پتھریلی زمین سے سُم ٹکراتے ہیں تو ان کی ٹاپوں پر لگے لوہے کے نعلوں سے چنگاریاں نکلتی ہیں۔ پھر وہ گردوغبار اڑاتے ہوئے عین صبح کے وقت دشمن کے لشکر میں گھس جاتے ہیں اور انہیں تاراج کرتے ہیں“۔ قسم کے بعد گھوڑے کی ان صفات کو بیان فرما کر رب تعالیٰ نے فرمایا: ”بیشک آدمی اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے“۔

گویا گھوڑے کی مذکورہ صفات بیان فرما کر رب تعالیٰ نے انسان کو شکر گذار بننے کی تلقین فرمائی ہے۔ انسان اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ گھوڑے اپنے مالک کے بہت اطاعت گزار ہوتے ہیں کہ اس کے اشارے پر تیز دوڑتے ہیں، اس قدر تیز کہ ہانپنے کی وجہ سے ان کے سینوں سے آواز نکلنے لگتی ہے۔ ان کا دوڑنا اتنی مشقت سے ہوتا ہے کہ انکے سُموں سے چنگاریاں نکلتی ہیں اور صبح کے وقت جبکہ اوس کی وجہ سے مٹی جمی ہوتی ہے، ان کی ٹاپوں سے گردوغبار اڑتا ہے۔

اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لِرَبِّہٖ لَکَنُوۡدٌ:

گھوڑے کی وفاداری دیکھئے کہ وہ اپنے مالک کے اشارے پر میدانِ جنگ میں کتنی مشکل خدمات انجام دیتا ہے۔ دشمنوں کی تلواریں، خون آلود زخمی اور لاشیں دیکھ کر بھی وہ اپنے مالک کا ساتھ نہیں چھوڑتا اور وفاداری نبھاتا ہے۔ حالانکہ انسان گھوڑے کا خالق ومالک اور رازق نہیں ہے۔ اس کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ رب تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے رزق کو گھوڑے تک پہنچاتا ہے۔ لیکن گھوڑا اس کے اتنے سے احسان کو اس قدر مانتا اور پہچانتا ہے کہ وہ اس مالک کے ادنیٰ سے اشارے پر اپنی جان کو خطرے میں ڈال دیتا ہے اور مصائب ومشکلات سے منہ نہیں موڑتا۔

جبکہ اس کے مقابل انسان کو دیکھئے کہ جس کا خالق ومالک اللہ تعالیٰ ہے جس نے اسے ماں کے پیٹ میں غذا دی، پھر اس کی پیدائش سے لیکر ساری عمر اسے رزق دیا، اسے کثیر نعمتیں عطا کیں اور اس پر بیشمار احسانات فرمائے۔ ارشاد ہوا:

{وَاِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ لَا تُحۡصُوۡهَا}(پ14، نحل:18)

"اور اگر اللہ کی نعمتیں گنو تو انہیں شمار نہ کر سکو گے"۔

اس قدر کثیر نعمتیں پانے کے باوجود انسان اپنے رب کا نافرمان اور ناشکرا رہتا ہے۔ وہ مصائب و مشکلات کا شکوہ تو کرتا رہتا ہے مگر اس کی نعمتوں کا شکر گذار نہیں ہوتا۔ ایسے شخص کو "کَنُوْد" کہتے ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے رب کا احسان فراموش اور ناشکرا رہتا ہے بلکہ اپنے رب کے احکامات اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات سے منہ موڑ کر شیطان اور نفس کی غلامی و بندگی کا شکار ہو جاتا ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ "کَنُوْد" کے معنی ہیں "بہت ناشکرا"۔ اس کے ایک معنی نافرمان کے ہیں اور ایک معنی کنجوس کے بھی ہیں۔ ایک اور قول یہ ہے کہ "کَنُوْد" وہ شخص ہے جو خدا کی نعمتوں کو اس کی نافرمانی میں استعمال کرے۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ کینہ پرور اور حسد کرنے والا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ خود غرض اور کمینہ ہے۔

اگر غور کیا جائے تو یہ تمام معانی و مفاہیم ایک دوسرے کے خلاف نہیں کیونکہ ناشکری مختلف طریقوں سے ہوتی ہے۔ رب تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں اور صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں، ان کا حق ادا کیا جائے، ان نعمتوں اور صلاحیتوں کو رب کریم کی رضا کے لیے استعمال کیا جائے اور اس کے بندوں کو ان صلاحیتوں سے نفع پہنچایا جائے۔

وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ:

رب تعالیٰ نے جن تین باتوں پر قسم ارشاد فرمائی ان میں سے ایک یہ بیان ہوئی کہ بیشک آدمی اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔ اور دوسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ "بیشک وہ اس پر خود گواہ ہے"۔

ایک قول یہ ہے کہ "اِنَّهٗ" کی ضمیر رب تعالیٰ کی طرف لوٹتی ہے اس لیے مفہوم یہ ہو گا کہ رب تعالیٰ بندوں کے ناشکرے ہونے پر گواہ ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ انسان اپنے ناشکرے ہونے پر خود گواہ ہے۔ اگر اس سورت کی ابتدائی آیات کے ساتھ ربط دیکھا جائے تو مفہوم یہ ہو گا،

گھوڑے اپنے مالک کی اطاعت میں اس قدر مشقت اُٹھائیں اور انسان اپنے خالق و مالک کا نافرمان رہے؟ ایسے نافرمان انسان کا پورا وجود اس بات کا گواہ ہے کہ وہ اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔

انسان اس بے زبان جانور کی جاں نثاریاں دیکھتا ہے، اس کی قربانیوں سے فائدہ اٹھاتا ہے لیکن

اسے یہ سوچنے کی توفیق نہیں ہوتی کہ وہ عقل و شعور کا پیکر، اپنے رب کا بندہ اور رسول کریم ﷺ کا غلام و امتی ہے۔ اس پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے رب کی اطاعت اور آقا و مولیٰ ﷺ کی فرمانبرداری میں مستعد اور سرگرمِ عمل رہے۔

مقامِ غور ہے کہ گھوڑا جانور ہو کر اپنے مجازی مالک کا حق سمجھے اور اس کی اطاعت کرے، اور انسان اشرفُ المخلوقات ہو کر بھی اپنے حقیقی مالک کا حق نہ سمجھے اور اس کی اطاعت نہ کرے تو یہ جانور سے بھی نچلے درجے میں چلا گیا۔ ایسا انسان اپنے عمل سے گواہی دیتا ہے کہ وہ اپنے رب کا ناشکرا اور احسان فراموش ہے۔ اپنے مالکِ حقیقی کے حقِ بندگی سے غافل انسانوں کے متعلق ارشادِ باری ہے:

{لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ}

"وہ دل رکھتے ہیں جن میں سمجھ نہیں، اور وہ آنکھیں جن سے دیکھتے نہیں، اور وہ کان جن سے سنتے نہیں۔ وہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بڑھ کر گمراہ، وہی غفلت میں پڑے ہیں"۔

(پ10، اعراف:179)

کیونکہ چوپایہ بھی اپنے نفع کی طرف بڑھتا ہے اور ضرر سے بچتا اور اس سے پیچھے ہٹتا ہے جبکہ کافر جہنم کی راہ چل کر اپنا ضرر اختیار کرتا ہے تو اس سے بدتر ہوا۔

صدرُ الافاضل مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں، چوپائے بھی اپنے رب کی تسبیح کرتے ہیں اور جو انہیں کھانے کو دے، اس کے مطیع رہتے ہیں اور احسان کرنے والے کو پہچانتے ہیں اور تکلیف دینے والے سے گھبراتے ہیں۔ یہ کفار ان سے بھی بدتر ہیں کیونکہ نہ رب کی اطاعت کرتے ہیں، نہ اس کے احسان کو پہچانتے ہیں نہ شیطان جیسے دشمن کی ضرر رسانی کو سمجھتے ہیں، نہ ثواب جیسی عظیم نفع والی چیز کے طالب ہیں اور نہ عذاب جیسی سخت مضر مہلک چیز سے بچتے ہیں"۔ [172]

اگر کلمہ پڑھنے کے باوجود مسلمان بھی کافروں جیسی غفلت والی زندگی گزارے اور ان کے طور طریقے اپنا کر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کو فراموش کر دے تو یہ کس قدر احسان

172... خزائن العرفان، اعراف، تحت الآیۃ:179

فراموشی ہے۔ گویا انسان اپنے اعمال کی بناء پر اس زندگی میں خود اپنے خلاف ناشکرا ہونے کی گواہی دے رہا ہے اور قیامت میں بھی یہ اپنے خلاف گواہی دے گا۔

قرآن مجید میں ہے کہ اُس دن مجرم اپنے ناشکرے پن کا یوں اقرار کریں گے،

{لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ o وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ o وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ o وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ o حَتّٰٓى اَتٰنَا الْيَقِيْنُ}

''ہم نماز نہ پڑھتے تھے ،اور مسکین کو کھانا نہ دیتے تھے، اور بیہودہ فکر والوں کے ساتھ بیہودہ فکریں کرتے تھے، اور ہم انصاف کے دن کو جھٹلاتے رہے یہاں تک کہ ہمیں موت آئی''۔

(پ29، مدثر:43-47)

قرآن عظیم میں ایک اور مقام پر فرمایا گیا،

{يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ o بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ o وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ}(پ29، قیامہ:13-15)

''اس دن آدمی کو اس کا سب اگلا پچھلا جتا دیا جائے گا بلکہ آدمی خود ہی اپنے حال پر پوری نگاہ رکھتا ہے اور اگر اس کے پاس جتنے بہانے ہوں سب لا ڈالے''۔

یعنی قیامت کے دن بھی اگر انسان اپنی عادت و طبیعت کی وجہ سے گناہوں پر حیلے بہانے تراشے مگر وہ اپنے دل میں خوب جانتا ہو گا کہ وہ جھوٹا ہے کیونکہ وہ خود اپنے احوال پر گواہ ہو گا۔

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ:

تیسری بات جس پر قسم ارشاد فرمائی گئی وہ یہ ہے کہ ''بیشک وہ مال کی محبت میں شدید ہے''۔ یہاں مال کے لیے ''خیر'' کا لفظ آیا ہے۔ قرآن کریم میں بعض اور مقامات پر بھی ''خیر'' کے لفظ سے مال مراد لیا گیا ہے۔ مثلاً ارشاد ہوا:

{وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا}

''اور جب اس کو مال ملے تو روک رکھنے والا ہے''۔(پ29، معارج:21)

قرآن عظیم میں دوسری جگہ فرمایا گیا،

{كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَنِ ا الْوَصِيَّةُ}
”تم پر فرض ہوا کہ جب تم میں کسی کو موت آئے، اگر کچھ مال چھوڑے تو وصیت کر جائے“۔(پ2،بقرہ:180)

مال کے لیے خیر کا لفظ استعمال ہونے میں ایک حکمت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ انسان سب سے زیادہ اپنی ذات سے محبت کرتا ہے اور اپنی ذات کی بھلائی کو ہر چیز پر فوقیت دیتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی ساری خیر یعنی بھلائی مال و متاع میں ہے اس لیے مال کو خیر سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

انسان جب مال و متاع کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے اور مال و دولت کی بیجا محبت میں مبتلا ہو کر وہ حلال و حرام کی تمیز کھو بیٹھتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود غرضی، لالچ اور بخل کی آفتوں کا شکار ہو کر اپنے رب عزّوجل اور اپنے آقا و مولیٰ ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری سے غافل اور ناشکرا بن جاتا ہے۔

گھوڑوں کی مثال پر غور کیجئے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ گھوڑے تو جان کی بازی لگا کر تیروں اور نیزوں کے مقابل سینہ سپر ہو کر جو کچھ مالِ غنیمت حاصل کرتے ہیں، وہ سب اپنے مالک کے حوالے کر دیتے ہیں اور اپنے کسی حق کا مطالبہ نہیں کرتے۔ جو کچھ غذا مالک ان کے آگے ڈال دے اسی پر صابر و شاکر رہتے ہیں۔ لیکن انسان کا یہ حال ہے کہ جو کچھ اپنے رب کے فضل و کرم سے پاتا ہے اس کو رب تعالیٰ کے حکم سے اس کی راہ میں خرچ کرنے پر تیار نہیں ہوتا بلکہ اس مال پر اپنے مالکِ حقیقی کا کوئی حق تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اگر کوئی نصیحت کرے تو کہتا ہے، یہ تو میں نے اپنی محنت و قابلیت سے حاصل کیا ہے۔ قرآن مجید نے قارون کا یہ قول بیان کیا ہے،

{اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ}(پ20، قصص:78)
”یہ (مال) تو مجھے ایک علم سے ملا ہے جو میرے پاس ہے“۔

قرآن کریم نے سچے مومنوں کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ وہ سب سے زیادہ اپنے رب سے محبت کرتے ہیں اس لیے وہ ہر چیز کی محبت پر رب تعالیٰ کی محبت کو ترجیح دیتے ہیں۔ ارشاد ہوا:

{وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ}(پ2،بقرہ:165)
”اور ایمان والوں کو اللہ کے برابر کسی کی محبت نہیں“۔

جبکہ ناشکرے اور احسان فراموش لوگ، مال عطا فرمانے والے رب کریم سے زیادہ اپنے مال سے

محبت کرتے ہیں۔

انسان کو مال سے بہت زیادہ محبت ہے۔ اس کے متعلق آقا و مولیٰ ﷺ نے فرمایا: اگر آدمی کے پاس مال سے بھری ہوئی دو وادیاں ہوں تو بھی وہ تیسری وادی کی خواہش کرے گا۔ آدمی کے پیٹ کو صرف قبر کی مٹی ہی بھر سکتی ہے، اور جو کوئی توبہ کرے، اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول فرماتا ہے۔[173]

سرکارِ دو عالم ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے، حرص و طمع سے بچو کیونکہ پہلی قومیں حرص و لالچ ہی کے باعث تباہ ہوئیں۔ لالچ نے انہیں بخل کی ترغیب دی، انہوں نے بخل کیا۔ اسی حرص نے انہیں قطع رحمی پر مائل کیا اور انہوں نے قطع رحمی اختیار کی۔ اور اسی حرص نے انہیں بدکاری پر اُبھارا اور انہوں نے بدکاریاں کیں۔ (ابو داؤد)

خلاصہ یہ ہے کہ مال کی ناروا محبت اور حرص و لالچ کی وجہ سے انسان کو دوسروں کے حقوق غصب کرنے اور ناجائز طور پر مال حاصل کرنے میں کوئی عار نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے وہ بخل کرتا ہے اور راہِ خدا میں مال خرچ کرنے میں تنگی اور الجھن محسوس کرتا ہے۔ جب وہ مال کے لالچ کی وجہ سے فسق و فجور میں مبتلا ہو جائے تو پھر اسے کوئی اور گناہ کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی۔

بخل کی مذمت میں آقا و مولیٰ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے، بخیل اللہ تعالیٰ سے دور ہے، جنت سے دور ہے، لوگوں سے دور ہے اور دوزخ سے قریب ہے۔ جبکہ جاہل سخی رب تعالیٰ کے نزدیک عبادت گزار بخیل سے کہیں بہتر ہے۔[174]

ایک اور حدیث پاک میں فرمایا، ہر روز صبح کے وقت دو فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ ایک فرشتہ دعا کرتا ہے، اے اللہ! خرچ کرنے والے کو خرچ کیے ہوئے مال کی جزا عطا فرما۔ دوسرا فرشتہ دعا کرتا ہے، اے اللہ! بخیل کے مال کو ضائع فرما۔[175]

مال سے مراد صرف روپیہ یا سونا چاندی نہیں بلکہ اس سے دنیا کا سارا ساز و سامان مراد ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے،

---

173 ... بخاری، کتاب الرقاق، حدیث: 6436۔

174 ... ترمذی، کتاب البر والصلۃ، حدیث: 1968۔

175 ... بخاری، کتاب الزکاۃ، باب قول اللہ تعالیٰ: فامّا من اعطی واتقی ۔۔۔ الخ، حدیث: 1442۔

{زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا}

"لوگوں کے لیے آراستہ کی گئی ان خواہشوں کی محبت، عورتیں اور بیٹے، اور تلے اوپر سونے چاندی کے ڈھیر، اور نشان کیے ہوئے گھوڑے، اور چوپائے اور کھیتی، یہ جیتی دنیا کی پونجی (یعنی سامان) ہے"۔(پ3،ال عمران:14)

یہ بات قابلِ غور ہے کہ ان تمام چیزوں سے صرف دنیا کی زندگی میں فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے جبکہ راہِ خدا میں خرچ کی ہوئی چیز کا آخرت میں اجر ملتا ہے تو پھر عقل کا تقاضا یہ ہے کہ مال کو راہِ خدا میں خرچ کیا جائے تاکہ آخرت میں بھی اس کا نفع ملے۔

مال ومتاع کی محبت کو عموماً دنیا کی محبت سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ حضور کا ارشاد ہے، دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے۔[176]

یہ بات ذہن نشین رہے کہ دنیاوی مال ومتاع بذاتِ خود کوئی قابلِ نفرت و[ملامت چیز نہیں ہے۔ رزقِ حلال کمانا عین عبادت ہے کیونکہ اس عالمِ اسباب میں انسانی ضروریات کا پورا ہونا مال ہی پر موقوف ہے بلکہ تمام عبادات کے قبول ہونے کا دارومدار ہی حلال رزق پر ہے۔

مذکورہ حدیث شریف کے مطابق ہر برائی کا آغاز دنیا کی محبت سے ہوتا ہے اور دنیا نام ہے اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کرنے والی چیزوں کا۔ لہٰذا جائز طریقے سے دنیا کی نعمتیں استعمال کی جائیں اور رب کریم کا عطا کردہ مال اس کی رضا کے لیے اسی کی راہ میں خرچ کیا جائے لیکن دنیا اور اس کے مال ومتاع کی محبت کو ہرگز دل میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ صوفیا فرماتے ہیں:

"دنیا رحمت ہے جب تک اس کی محبت دل سے باہر ہو، جیسے سمندر میں کشتی چلے اور پانی کشتی سے باہر رہے تو رحمت ہے ورنہ تباہی وبربادی"۔

پس انسان کے لیے مال ومتاع کی ایسی محبت منع ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت سے غفلت کا سبب بنے۔ جب انسان مال ودولت کی ناجائز محبت میں مبتلا ہوتا ہے تو دوسروں کا حق چھیننے

---

176 ... جامع الاصول فی احادیث الرسول، الرکن الثانی، حدیث:2603۔

میں عار محسوس نہیں کرتا اور حلال و حرام کی تمیز کھو دیتا ہے۔اسی بناء پر دنیا میں اکثر جھگڑے اور فسادات ہورہے ہیں اور بھائی بھائی کا دشمن بن رہا ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں اِس امت کا فتنہ مال کو قرار دیا گیا ہے۔مال کی ناجائز محبت اور ناشکری کا علاج اگلی آیات میں بیان ہورہا ہے۔

آیت۹ تا آیت۱۱:

ان آیات میں ناشکرے اور دنیا پرست انسان کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا جارہا ہے کہ ''اے غافل انسان! تُو موت سے غافل ہے مگر موت تجھ سے غافل نہیں ہے۔ تُو اُس وقت کو یاد کر جب تجھے قبر سے نکال کر اپنے خالق و مالک کے حضور کھڑا کر دیا جائے گا اور تجھے اپنے ہر ہر عمل کا جواب دینا ہوگا۔

اُس دن صرف اعمال ہی نہیں بلکہ تیرے سینے میں چھپی باتیں بھی کھول دی جائیں گی۔ تیرے اعمال کے محرکات اور نیتیں بھی پوشیدہ نہ رہ سکیں گی۔ گمراہی والے عقائد ہوں یا گندے خیالات، بغض و حسد کے جذبات ہوں یا حرص و تکبر کے احساسات، سب کچھ ظاہر کر دیا جائے گا۔ ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا:

{يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ٥ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ}

''جس دن چھپی باتوں کی جانچ ہوگی تو آدمی کے پاس نہ کچھ زور ہوگا نہ کوئی مددگار''۔

(پ30، طارق:9-10)

یہاں دل کے افعال کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ جسم کے افعال دل کے افعال کے تابع ہیں کیونکہ پہلے دل میں کسی بات کا خیال وارادہ پیدا ہوتا ہے بعد میں ظاہری اعضاء اسے انجام دیتے ہیں۔

دنیا کی کسی عدالت میں کسی انسان کے دل میں پوشیدہ باتوں کو جانا اور جانچا نہیں جاسکتا۔ صرف رب ذوالجلال ہی کی شان ہے کہ وہ:

{عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ} یعنی سینوں میں چھپی باتیں جانتا ہے۔(پ29، ملک:13)

{عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ} یعنی ہر نہاں و عیاں کا جاننے والا ہے۔(پ18، مومنون:92)

{عَلَّامُ الْغُيُوْبِ} یعنی سب غیبوں کا جاننے والا ہے۔(پ7، مائدہ:109)

{يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ} یعنی جانتا ہے چوری چھپے کی نگاہ اور جو کچھ سینوں

میں چھپا ہے۔(پ24،مومن:19)

رب تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے، {وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ وَنَعۡلَمُ مَا تُوَسۡوِسُ بِهٖ نَفۡسُهٗ وَنَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَيۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِيۡدِ ٥}(پ26،ق:16)

"اور بیشک ہم نے آدمی کو پیدا کیا اور ہم جانتے ہیں جو وسوسہ اس کا نفس ڈالتا ہے اور ہم دل کی رگ سے بھی اس سے زیادہ نزدیک ہیں"۔

اگرچہ دو فرشتے آدمی کے اچھے بُرے اعمال لکھتے ہیں تاکہ قیامت میں ہر کسی کا اعمالنامہ اس کے ہاتھ میں دیا جائے مگر اللہ تعالیٰ فرشتوں کے لکھنے سے بے نیاز ہے۔

سورت کی آخری آیت میں ہے کہ اُس دن اللہ تعالیٰ کو اُن کی سب خبر ہے،اس کا کیا مطلب ہے؟ حالانکہ اُسے تو ہر لمحہ ہر وقت ہر مخلوق کے ہر حال کی خبر ہے۔

جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تو ہر وقت تمام مخلوق کے تمام احوال کی خبر ہے لیکن قیامت کے دن نامۂ اعمال اور سینوں میں چھپی باتیں ظاہر ہونے پر تمام لوگوں کو بھی اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ رب تعالیٰ دنیا کی زندگی میں بھی اُن کے تمام احوال سے باخبر تھا اور آج بھی پوری طرح باخبر ہے جو کہ جزا و سزا کا دن ہے لہٰذا کسی کو انکار کی گنجائش نہیں رہے گی۔

اس سورت میں اللہ تعالیٰ کی بندگی، رسول کریم ﷺ کی اطاعت اور موت و قبر سے غافل ناشکرے لوگوں کو دعوتِ فکر و عمل دی گئی ہے کہ آج وہ پختہ یقین کرلیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، ان سب کاموں سے اللہ تعالیٰ باخبر ہے۔ بلکہ جو کچھ ہمارے دلوں میں ہے وہ اسے بھی جانتا ہے۔جب ہم مر کر مٹی میں مل جائیں گے تو بھی وہ ہمارے ہر ہر ذرے کو جمع کر کے ہمیں زندہ فرمائے گا اور ہمارے اعمال کو ظاہر فرمادے گا۔اُس دن ہمیں اپنے ہر ہر عمل کے متعلق بارگاہِ الٰہی میں جوابدہ ہونا پڑے گا۔

یہ احساس اگر آج ہمارے دل و دماغ میں راسخ ہو جائے تو ہم ناشکری، غفلت اور حُبِ مال کے امراض سے شِفایاب ہو کر رب تعالیٰ کے اطاعت گزار بندے اور اس کے محبوب رسول ﷺ کے وفادار غلام بن سکتے ہیں۔

تفسیر سورۃ القارعۃ

سورۃ القارعۃ مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں دس آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡقَارِعَۃُ ﴿۱﴾ مَا الۡقَارِعَۃُ ﴿۲﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا الۡقَارِعَۃُ ﴿۳﴾ یَوۡمَ یَکُوۡنُ النَّاسُ کَالۡفَرَاشِ الۡمَبۡثُوۡثِ ﴿۴﴾ وَ تَکُوۡنُ الۡجِبَالُ کَالۡعِہۡنِ الۡمَنۡفُوۡشِ ﴿۵﴾ فَاَمَّا مَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِیۡنُہٗ ﴿۶﴾ فَہُوَ فِیۡ عِیۡشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ ﴿۷﴾ وَ اَمَّا مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِیۡنُہٗ ﴿۸﴾ فَاُمُّہٗ ہَاوِیَۃٌ ﴿۹﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا ہِیَہۡ ﴿۱۰﴾ نَارٌ حَامِیَۃٌ ﴿۱۱﴾

”اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا (ہے)“

”دل دہلانے والی! کیا (ہے) وہ دل دہلانے والی؟ اور تو نے کیا جانا کیا ہے دل دہلانے والی؟ جس دن آدمی ہوں گے جیسے پھیلے پتنگے، اور پہاڑ ہوں گے جیسے دھنکی اُون۔ تو جس کی تولیں بھاری ہوئیں وہ تو من مانتے عیش میں ہیں، اور جس کی تولیں ہلکی پڑیں، وہ نیچا دکھانے والی گود میں ہے۔ اور تو نے کیا جانا کیا ہے نیچا دکھانے والی، ایک آگ شعلے مارتی“۔

(کنز الایمان از اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ)

لفظی ترجمہ:

اَلۡقَارِعَۃُ	مَا	الۡقَارِعَۃُ
دل دہلانے والی	کیا (ہے)	دل دہلانے والی

وَ	مَا	اَدۡرٰی	کَ	مَا	الۡقَارِعَۃُ
اور	کیا	جانا	تجھے / تو نے	کیا (ہے)	کھڑکھڑانے والی

یَوۡمَ	یَکُوۡنُ	النَّاسُ	کَ	الۡفَرَاشِ	الۡمَبۡثُوۡثِ
جس دن	ہوں گے	لوگ	کی طرح	پروانوں	بکھرے ہوئے

وَ	تَکُوْنُ	الْجِبَالُ	کَ	الْعِھْنِ	الْمَنْفُوْشِ
اور	ہونگے	پہاڑ	کی طرح	اُون	دُھنکی ہوئی

فَ	اَمَّا	مَنْ	ثَقُلَتْ	مَوَازِیْنُ	ہٗ
پس	بہرحال	وہ	بھاری ہوئے	پَلّے	جس (کے)

فَ	ھُوَ	فِیْ	عِیْشَةٍ	رَّاضِیَةٍ
تو	وہ	میں	عیش	پسندیدہ

وَ	اَمَّا	مَنْ	خَفَّتْ	مَوَازِیْنُ	ہٗ
اور	بہرحال	وہ	ہلکے ہونگے	پَلّے	جس کے

فَ	اُمُّ	ہٗ	ھَاوِیَةٌ
پس	ٹھکانا	اُس (کا)	نیچا دکھانے والی

وَ	مَا	اَدْرٰی	كَ	مَا	ھِیَ	ہْ	نَارٌ	حَامِیَةٌ
اور	کیا	جانا	تونے	کیاہے	وہ	-	آگ (ہے)	شعلے مارتی

ربط و مناسبت:

سورۃ الزلزال میں اعمال یعنی ذرہ بھر نیکی اور ذرہ بھر بدی کا ذکر تھا، سورۃ العادیات میں اعمال کے ساتھ دلوں میں چھپی باتوں یعنی ناشکری اور مال کی اندھی محبت کا ذکر کر کے انسان کو قبر کی منزل یاد دلائی گئی، اب سورۃ القارعہ میں نیتوں اور اعمال کو جمع کر کے بتایا جارہاہے کہ اعمال کس طرح تولے جائیں گے اور اس تول کے نتیجے میں کس کا کیا ٹھکانہ ہوگا۔

سورۃ العادیات میں مُردوں کے قبروں سے اٹھائے جانے اور سینوں میں چھپی باتیں کھول دینے کا ذکر تھا جو کہ قیامت سے متعلقہ امور میں سے ہیں، اس سورت میں قیامت میں پیش آنے والے دیگر

ہولناک اُمور بیان فرمائے گئے ہیں۔ گویا دونوں سورتوں میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ دونوں آخرت کی فکر پیدا کرتی ہیں۔

اَلْقَارِعَةُ مَا الْقَارِعَةُ:

سورۃ العادیات کے اختتام پر فرمایا گیا، "بیشک اُن کے رب کو اُس دن اُن کی سب خبر ہے"۔ اب سوال پیدا ہوا کہ وہ دن کیسا ہو گا؟ اس سورت میں بتایا گیا ہے کہ وہ دن دھماکہ خیز ہو گا۔ "قارِعہ" سے مراد نہایت ہولناک حادثہ یا سخت صدمہ دینے والی مصیبت یا دل دہلانے والی چیز ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ}(پ29، حاقہ:4)

"ثمود اور عاد نے اس سخت صدمہ دینے والی کو جھٹلایا"۔

{وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ}(پ13، رعد:31)

"اور کافروں کو ہمیشہ ان ایذا کے کیے پر سخت دھمک (مصیبت) پہنچتی رہے گی"۔

چونکہ قیامت بھی ہولناک حادثہ، ناگہانی مصیبت اور دل دہلانے والی آفت ہے اس لیے قیامت کا ایک نام "اَلْقَارِعَة" ہے۔ قرآن مجید میں مذکور قیامت کے چند نام ملاحظہ فرمائیں جو قیامت کے کسی نہ کسی اہم پہلو کی نشاندہی کرتے ہیں۔

اَلْحَآقَّةُ: وہ حق ہونے والی یعنی ضرور واقع ہونے والی، ناقابلِ انکار حقیقت۔

اَلصَّآخَّةُ: کان پھاڑنے والی چنگھاڑ، سخت اور کڑی آواز جو کان کو بہرا کر دے۔

اَلطَّآمَّةُ: عظیم مصیبت جو سب پر حاوی ہو، سب سے بڑا عالم گیر حادثہ۔

اَلْغَاشِيَةُ: وہ شدید مصیبت جو سب پر چھا جائے، وہ عظیم حادثہ جو سب کو گھیر لے۔

کسی تمہید کے بغیر اس سورت کا آغاز اس لفظ یعنی "اَلْقَارِعَةُ" سے کیا گیا، اور پھر سوال کیا گیا، مَا الْقَارِعَةُ۔ دل دہلانے والا حادثہ یا دہشت ناک کڑک یا کھڑکھڑانے والی ہولناک چیز کیا ہے؟ پھر فرمایا گیا، یہ اتنا بڑا ہولناک حادثہ ہے کہ اس کی حقیقت کو سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی بتا ہی نہیں سکتا۔

یہ قرآن کریم کی جامعیت کی ایک مثال ہے کہ ایسا عظیم الشان مختصر لفظ فرمایا گیا، جس میں خوف

بھی ہے اور دہشت بھی، سخت دھمک بھی ہے اور دل دہلانے والی آواز بھی، المناک حادثے کی خبر بھی ہے اور ہیبت و عظمت بھی۔ قیامت کی ہولناک سختی کو اُبھارنے کے لیے تین بار یہ لفظ فرمایا گیا اور اس لفظ کے ذریعے گویا قیامت کی منظر کشی کر دی گئی ہے۔

یہ نام رکھنے کی متعدد وجوہ ہیں۔ کسی ہولناک حادثہ کے تین اہم اجزاء ہوتے ہیں۔ اول: تصادم، دوم: سخت کڑی آواز، اور سوم: دہشت و ہیبت۔ قیامت کو القارعۃ اس لیے کہا گیا کہ یہ تینوں اجزاء قیامت میں انتہائی درجہ پر ہونگے۔ تصادم ایسا کہ ستارے اور سیارے پاش پاش ہو جائیں اور پہاڑ ریزہ ریزہ۔ سخت کڑی آواز ایسی کہ جسے سن کر لوگ مر جائیں اور دہشت ایسی کہ سب کو اپنی اپنی فکر ہو۔ ارشاد ہوا،

{لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ}(پ30، عبس:37)

”ان میں سے ہر ایک کو اُس دن ایک فکر ہے کہ وہی اسے کافی ہے“۔

قیامت کے دن کے حالات اور صور پھونکنے کے اثرات جو قرآن عظیم میں بیان ہوئے ہیں ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہولناک زلزلہ اور ہیبت ناک حادثہ کس قدر دل دہلانے والا ہو گا جسے اللہ تعالیٰ نے ”اَلْقَارِعَة“ کے نام سے ذکر فرمایا ہے۔

یہ نام رکھنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ قیامت اچانک آئے گی۔ سب اپنے اپنے کاموں میں مگن ہونگے، وہ ہولناک مصیبت اچانک آجائے گی۔

{بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ}

”بلکہ وہ ان پر اچانک آپڑے گی تو انہیں بے حواس کر دے گی پھر نہ وہ اسے پھیر سکیں گے اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی“۔(پ17، انبیاء:40)

دوسری وجہ یہ ہے کہ جب قیامت کے دن صور پھونکا جائے گا تو ایک زبردست چنگھاڑ سنائی دے گی جو دل دہلا دے گی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

{فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ}(پ30، عبس:33)

”پھر جب آئے گی وہ کان پھاڑنے والی چنگھاڑ“۔

پہلی بار صُور پھونکا جائے گا تو سب بے ہوش ہو جائیں گے۔ پھر دوسری بار صور پھونکا جائے گا تو سب لوگ مر جائیں گے۔ پھر تیسری بار صور پھونکا جائے گا تو سب دوبارہ زندہ ہو جائیں گے۔(تفسیر کبیر)رب تعالیٰ کا ارشاد ہے،

{اِنۡ کَانَتۡ اِلَّا صَیۡحَۃً وَّاحِدَۃً فَاِذَا ھُمۡ جَمِیۡعٌ لَّدَیۡنَا مُحۡضَرُوۡنَ}

”وہ تو نہ ہوگی مگر ایک چنگھاڑ جبھی وہ سب کے سب ہمارے حضور حاضر ہو جائیں گے“۔

(پ23،یس:53)

تیسری وجہ یہ ہے کہ جب قیامت آئے گی تو سورج چاند ستارے آسمان وغیرہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور ایک ہولناک آواز پیدا ہوگی۔ ارشادِ ربانی ہے،

{اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ٥ وَاِذَا الۡکَوَاکِبُ انۡتَثَرَتۡ٥ وَاِذَا الۡبِحَارُ فُجِّرَتۡ ٥ وَاِذَا الۡقُبُوۡرُ بُعۡثِرَتۡ ٥ عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ وَاَخَّرَتۡ}

”جب آسمان پھٹ جائے اور جب تارے جھڑ پڑیں اور جب سمندر بہا دیے جائیں اور جب قبریں کُریدی جائیں، ہر جان، جان لے گی جو اس نے آگے بھیجا اور جو پیچھے“۔(پ30،انفطار:6-7)

{یَوۡمَ تَرۡجُفُ الرَّاجِفَۃُ٥ تَتۡبَعُھَا الرَّادِفَۃُ٥ قُلُوۡبٌ یَّوۡمَئِذٍ وَّاجِفَۃٌ٥ اَبۡصَارُھَا خَاشِعَۃٌ}

(پ30،نازعات:6-7)

”جس دن تھر تھرائے گی تھر تھرانے والی، اس کے پیچھے آئے گی پیچھے آنے والی، کتنے دل اُس دن دھڑکتے ہونگے، آنکھ اوپر نہ اٹھا سکیں گے“۔

قیامت سے متعلقہ تمام آیاتِ مبارکہ کا مطالعہ فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ اس سورت میں ان آیات کا گویا ایک طرح سے خلاصہ بیان فرما دیا گیا ہے اور انسان کو تنبیہ کی گئی ہے کہ اتنی ہولناک مصیبت اور دل دہلانے والی آفت سے بے پرواہ اور غافل نہ ہو جانا۔ جیسے اگر کسی کو یہ معلوم ہو جائے کہ آج رات کوئی بڑی مصیبت آنے والی ہے یا ہولناک زلزلہ آنے والا ہے تو دہشت اور خوف کی وجہ سے انسان کی نیند اُڑ جائے گی، دل لرزنے لگے گا اور ہر لمحہ کھٹکا رہے گا کہ بس اب زلزلہ آیا، اب موت آئی۔

پس انسان کو چاہیے کہ اس دن کے آنے سے قبل اس کے لیے ایسی تیاری کرلے جس کے باعث

وہ اُن خوش نصیبوں میں سے ہو جائے جنہیں یہ بشارت دی گئی ہے،

{مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ}

”جو نیکی لائے، اس کے لیے اس سے بہتر صلہ ہے، اور ان کو اُس دن کی گھبراہٹ سے امان ہے“۔(پ20، نمل:89)

كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ:

ارشاد ہوا: ”جس دن آدمی ہوں گے جیسے پھیلے پتنگے“۔

(1) اس آیت میں انسانوں کو پھیلے ہوئے پروانوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس طرح برسات میں کثیر تعداد میں پروانے اور پتنگے نکل آتے ہیں اسی طرح قیامت میں جب انسان قبروں سے اُٹھیں گے تو پوری زمین لاتعداد انسانوں سے بھر جائے گی۔

{يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا}(پ30، نبا:18)

”جس دن صور پھونکا جائے گا تو تم چلے آؤ گے فوجوں کی فوجیں“۔

(2) پروانے نہایت کمزور ہوتے ہیں اور ایک دوسرے پر گرتے پڑتے ہیں، ایسا ہی حال قیامت کے دن انسانوں کا بھی ہو گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

{وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى}(پ17، حج:2)

”اور تو لوگوں کو دیکھے گا جیسے نشہ میں ہیں اور (حالانکہ) وہ نشہ میں نہ ہوں گے“۔

(3) پروانے ایک سمت میں نہیں اُڑتے بلکہ حیران و مضطرب، منتشر انداز میں اُڑتے ہیں اسی طرح قیامت میں لوگ حیران و پریشان اٹھیں گے اور گھبراہٹ و بدحواسی میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہوں گے۔ ارشاد ہوا:

{يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ۝ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ}(پ29، معارج:43-44)

”جس دن قبروں سے نکلیں گے جھپٹتے ہوئے گویا وہ نشانوں کی طرف لپک رہے ہیں، آنکھیں نیچی کیے ہوئے، اُن پر ذلت سوار“۔

{يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ۝ كَلَّا لَا وَزَرَ} (پ29، قیامہ:10-11)

"اُس دن آدمی کہے گا، کدھر بھاگ کر جاؤں؟ ہر گز نہیں! کوئی پناہ نہیں"۔

(4) پروانے ایک دوسرے سے لا تعلق اور بے پرواہ ہوتے ہیں، قیامت میں انسانوں کا بھی یہی معاملہ ہو گا۔ نہ کوئی کسی کا حال پوچھے گا نہ ہی کوئی کسی کی پرواہ کرے گا۔

{وَلَا يَسْئَلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۝ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيْهِ ۝ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ۝ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُئْوِيْهِ ۝ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۝ كَلَّا}

"اور (اُس دن) کوئی دوست کسی دوست کی بات نہ پوچھے گا، ہوں گے انہیں دیکھتے ہوئے۔ مجرم آرزو کرے گا، کاش اُس دن کے عذاب سے چھٹنے کے بدلے میں دے دے اپنے بیٹے، اور اپنی جورو (بیوی) اور اپنا بھائی، اور اپنا کنبہ جس میں اس کی جگہ ہے، اور جتنے زمین میں ہیں سب، پھر یہ بدلہ دینا اسے بچالے؟ ہر گز نہیں"۔ (پ29، معارج:10-15)

قیامت میں ایمان اور تقویٰ کے سوا کوئی تعلق قائم نہ رہے گا۔ ارشاد ہوا:

{اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ}

"گہرے دوست اُس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر پرہیز گار"۔ (پ25، زخرف:67)

كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ:

ارشاد ہوا: "اور پہاڑ ہوں گے جیسے دھنکی اُون"۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں پہاڑوں کے مختلف احوال بیان فرمائے ہیں۔

{وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ}

"اور تو دیکھے گا پہاڑوں کو، خیال کرے گا کہ وہ جمے ہوئے ہیں اور (در حقیقت) وہ چلتے ہوں گے بادل کی چال"۔ (پ20، نمل:88)

پھر وہ پہاڑ ایک آن میں چورا چورا کر دیے جائیں گے۔ ارشاد ہوا:

{وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً} (پ29، حاقہ:14)

"اور زمین اور پہاڑ اٹھا کر دفعتہ چورا کر دیے جائیں"۔

جس طرح دُھنکی ہوئی اُون کا ریشہ ریشہ الگ ہو جاتا ہے اسی طرح پہاڑ بھی ذرہ ذرہ کر دیے جائیں

گے۔ پہاڑوں کے مختلف رنگ ہوتے ہیں جیسا کہ ارشاد ہوا،

{وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُوْدٌ}

"اور پہاڑوں میں راستے ہیں، سفید اور سرخ، رنگ رنگ کے اور کچھ کالے بھوجنگ (سیاہ کالے)"۔(پ22،فاطر:27)

جب قیامت آئے گی تو یہ مختلف رنگوں کے پہاڑ چورا چورا ہو کر ایسے ہو جائیں گے جیسے دھنکی ہوئی رنگ برنگی اون ہوتی ہے اور جب یہ اجزاء ہوا میں اُڑیں گے تو یوں معلوم ہو گا جیسے دھنکی ہوئی رنگین روئی کے گالے اُڑ رہے ہیں۔

غیب بتانے والے آقا و مولیٰ ﷺ نے جب قیامت کی خبریں دیں تو لوگوں نے پوچھا، کیا پہاڑوں جیسی مضبوط و بھاری چیز بھی تباہ ہو سکتی ہے؟ جواب میں ارشاد ہوا:

{وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا}

"اور (اے محبوب ﷺ!) تم سے پہاڑوں کو پوچھتے ہیں، تم فرماؤ! انہیں میرا رب ریزہ ریزہ کر کے اُڑا دے گا"۔(پ16،طٰہٰ:105،)

گویا قیامت ایسا عظیم حادثہ اور دل دہلانے والی آفت ہے کہ یہ عظیم الشان مضبوط پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں اڑ جائیں گے۔ تو پھر ذرا سوچیے کہ اُس دن انسان کس حال میں ہو گا۔اس سورت میں قیامت کے احوال بیان فرما کر انسان کو نصیحت کی گئی ہے کہ صرف اس زندگی کو ہی پوری زندگی نہ سمجھ لینا۔ تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا پھر تم بارگاہِ الٰہی میں پیش ہوگے اور جزا و سزا پاؤ گے۔

{اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ}(پ21،روم:11)

"اللہ پہلے بناتا ہے پھر دوبارہ بنائے گا پھر اس کی طرف پھرو گے"۔

آیت ۶ تا ۸ کی تفسیر:

ارشاد ہوا:"تو جس کی تولیں بھاری ہوئیں وہ تو من مانتے عیش میں ہیں، اور جس کی تولیں ہلکی پڑیں، وہ نیچا دکھانے والی گود میں ہے"۔

مَوَازِيْنُ جمع ہے میزان کی جس کے معنی ترازو یا ترازو کے پلّے کے ہیں۔ اب مفہوم یہ ہو گا کہ

جس کے ترازو کے پلّے بھاری ہونگے وہ پسندیدہ عیش میں ہو گا۔

اگر موازین کا واحد "موزون" ہو جس کے معنی وزن کی ہوئی چیز کے ہیں۔ تو اب مفہوم یہ ہو گا کہ جس کے نیک اعمال وزنی ہونگے اس کے لیے خوشخبری ہے۔

در حقیقت دونوں معانی کی اصل ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی جو اعمال لے کر بارگاہِ الٰہی میں آیا ہے وہ وزنی ہیں یا بے وزن؟ یا اس کی نیکیوں کا وزن اس کی برائیوں کے وزن سے زیادہ ہے یا کم؟

اعمال کے وزن کا تمام تر انحصار نیت کے اخلاص پر ہے۔ کئی لوگوں کے اعمال نامے میں ظاہری طور پر تو ایک جیسی نیکیاں لکھی ہوئی ہونگی لیکن رب تعالیٰ جو سینوں میں چھپی باتیں جانتا ہے، وہ ہر ایک کے اخلاص کے لحاظ سے اسے کم یا زیادہ یا بہت زیادہ اجر و ثواب عطا فرمائے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

{قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا o اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا o اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا}

"تم فرماؤ! کیا ہم تمہیں بتا دیں کہ سب سے بڑھ کر ناقص عمل کن کے ہیں؟ اُن کے جن کی ساری کوشش دنیا کی زندگی میں گم گئی، اور وہ اس خیال میں ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں۔ یہ لوگ جنہوں نے اپنے رب کی آیتیں اور اس کا ملنا نہ مانا (یعنی آخرت کے منکر رہے) تو ان کا کیا دھرا سب اکارت ہے۔ تو ہم ان کے لیے قیامت کے دن کوئی تول قائم نہ کریں گے"۔ (پ16، کہف:103-105)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ کافروں کے اچھے اعمال کا وزن نہیں کیا جائے گا کیونکہ نیک اعمال کی قبولیت کے لیے ایمان کا ہونا بنیادی شرط ہے۔ رب تعالیٰ نے قرآن کریم میں مشرکوں سے فرمایا:

{لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ} (پ23، زمر:65)

"اگر تو نے اللہ کا شریک کیا تو ضرور تیرا سب کیا دھرا اکارت جائے گا"۔

اور ایمان والوں سے فرمایا:

{يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ}

"اے ایمان والو! اپنی آوازیں اونچی نہ کرو اُس غیب بتانے والے (نبی) کی آواز سے، اور ان کے

حضور بات چِلاّ کر نہ کہو جیسے آپس میں ایک دوسرے کے سامنے چِلاتے ہو کہ کہیں تمہارے عمل اکارت نہ ہو جائیں اور تمہیں خبر نہ ہو"۔(پ26، حجرات:2)

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ شرک سے اعمال برباد ہوتے ہیں اور بارگاہِ رسالت کا ادب نہ کرنے سے بھی اعمال برباد ہو جاتے ہیں اور اس میں اضافی سزا یہ ہے کہ بے ادب کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ العیاذ باللہ۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: آخرت میں لوگوں کے تین گروہ ہونگے۔ ایک متقین کا گروہ ہوگا جس کے کبیرہ گناہ بالکل نہ ہونگے۔ ان کی نیکیاں ایک نورانی پلّے میں رکھی جائیں گی اور دوسرا تاریک پلّہ خالی ہوگا۔

دوسرا گروہ کافروں کا ہوگا جن کے کفر اور بُرے اعمال تاریک پلّے میں رکھے جائیں گے اور اگر کوئی نیکی ہوئی تو دوسرے پلے میں رکھ دی جائے گی مگر یہ پلہ خالی پلّے کی طرح ہلکا رہے گا۔ رسولِ معظم ﷺ کا ارشاد ہے، قیامت کے دن ایک بھاری بھرکم آدمی لایا جائے گا مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا وزن مچھر کے پر جتنا بھی نہ ہوگا۔ پھر حضور ﷺ نے سورۃ الکہف کی آیت ۱۰۵ تلاوت فرمائی۔[177]

تیسرا گروہ گناہگار مسلمانوں کا ہوگا۔ ان کی نیکیاں نورانی پلّے میں رکھی جائیں گی اور برائیاں تاریک پلے میں۔ اگر نیکیوں والا پلہ بھاری رہا تو وہ جنت میں جائے گا اور اگر برائیوں والا پلہ بھاری ہوا تو اس کا معاملہ رب تعالیٰ کی مرضی پر موقوف ہوگا۔ وہ چاہے گا تو بخش دے گا اور چاہے گا تو سزا دے گا۔

اگر دونوں پلے برابر ہوئے تو اسے جنت و جہنم کی درمیانی جگہ "اعراف" میں رکھا جائے گا بشرطیکہ اس کے گناہ حقوقُ اللہ میں سے ہوں۔ اگر اس کے گناہ حقوقُ العباد میں سے ہوئے تو اسی حساب سے اس کی نیکیاں حقدار کو دے دی جائیں گی، اور اگر اس کی نیکیوں سے ادائیگی پوری نہ ہوئی تو اُس حقدار کے گناہ اِس پر ڈال دیے جائیں گے اور اِسے ان کے بدلے میں عذاب ہوگا۔(مظہری)

احمد بن حارث رحمہ اللہ کا قول ہے، قیامت کے دن مسلمانوں کے تین گروہ ہونگے۔ ایک گروہ اعمالِ صالحہ میں غنی ہوگا۔ دوسرا گروہ اعمالِ صالحہ کم ہونے کی وجہ سے فقیر ہوگا اور تیسرا گروہ اعمالِ

177...ترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ، حدیث:2503

صالحہ میں پہلے غنی ہو گا پھر لوگوں کے حقوق کی ادائیگی کے بعد فقیر ہو جائے گا۔

سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کوئی شخص رب تعالیٰ کی بارگاہ میں ایسے سَتّر گناہ لے کر جائے جو حقوق اللہ میں سے ہوں، یہ آسان ہوگا بہ نسبت اس کے کہ وہ حقوقُ العباد میں سے ایک گناہ بھی لے کر بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہو۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے، قیامت کے دن لوگوں کا حساب ہوگا۔ جن کی ایک نیکی بھی گناہوں سے زائد ہوگی وہ جنت میں جائیں گے اور جن کے گناہ نیکیوں سے زیادہ ہونگے وہ دوزخ میں جائیں گے۔ اور جن کی نیکیاں اور گناہ برابر ہوئے، انہیں اعراف میں رکھا جائے گا۔ ایسے لوگ پلِ صراط پر رُکے رہیں گے یہاں تک کہ جب ان کو کچھ گناہوں کی سزا دیدی جائے گی تو ان کی نیکیاں بھاری ہو جائیں گی اور پھر انہیں جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

علامہ سیوطی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جس متقی کا کوئی گناہ نہ ہو گا اس کے اعمال بھی تولے جائیں گے تاکہ اس کی فضیلت اور شرف لوگوں پر ظاہر کر دیا جائے، اور یونہی کافر کے اعمال اسے ذلیل کرنے کے لیے تولے جائیں گے۔ (مظہری)

یہ اعتراض بالکل لغو ہے کہ ''اعمال کا وزن کیسے کیا جاسکتا ہے کیونکہ وزن تو مادّی چیز کا کیا جاتا ہے''۔

جواب یہ ہے کہ جب تھرمامیٹر کے ذریعے جسم کی حرارت یعنی بخار کو ناپا جاسکتا ہے، لیبارٹری کے آلات کے ذریعے خون میں کولیسٹرول، شوگر، کیلشیم، پوٹاشیم، سوڈیم اور دیگر بہت ساری غیر مادّی چیزوں کا وزن کیا جاسکتا ہے جبکہ یہ آلات مخلوق کے بنائے ہوئے ہیں تو پھر نیک و بد اعمال کا وزن کیوں نہیں کیا جاسکتا جبکہ خالق و مالک کی شان یہ ہے کہ: {اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ} ''اس کا کام تو یہی ہے کہ جب کسی چیز کو چاہے تو اس سے فرمائے، ہو جا، وہ فوراً ہو جاتی ہے''۔ (پ23، یس:82)

فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ:

''جس کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہوا، وہ من پسند عیش میں ہو گا''۔

پسندیدہ زندگی وہ ہے جس کو زندگی بسر کرنے والا دل سے پسند کرے۔ دنیا میں ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ہر بات اس کی پسند کے مطابق ہو۔ لیکن یہاں کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں گزرتا کہ آدمی یہ کہہ سکے، "آج کے دن ہر بات میری مرضی اور پسند کے مطابق ہوئی ہے"۔

وہ ایمان والے جو دنیاوی زندگی میں اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب ﷺ کی مرضی پر اپنی مرضی کو قربان کر دیتے ہیں اور انکے احکامات پر عمل پیرا رہتے ہیں، وہ جنت کے حقدار ہو جاتے ہیں۔ رب تعالیٰ کی طرف سے اہلِ جنت کے لیے یہ انعام ہے کہ ان کی ہر خواہش پوری کی جائے گی۔ جنت میں فرشتے ان سے کہیں گے،

{وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ٥ نُزُلًا مِّنْ غَفُورٍ رَّحِيمٍ}(پ24، حم السجدہ:31-32)

"اور تمہارے لیے ہے اس میں جو تمہارا جی چاہے، اور تمہارے لیے اس میں جو مانگو، مہمانی بخشنے والے مہربان (رب) کی طرف سے"۔

ایک طبقہ دنیا پرست غافل لوگوں کا ہے جو اس دنیا کی زندگی کو اپنی پسند اور مرضی کے مطابق گزارنا چاہتا ہے۔ آقا و مولیٰ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے، "دنیا مومن کا قید خانہ اور کافر کی جنت ہے"۔[178]

یعنی مومن زندگی کو اپنی خواہشات اور مرضی کے مطابق نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی مرضی کے مطابق گزارتا ہے جبکہ کافر اپنی زندگی اپنی خواہشات اور اپنی مرضی کے مطابق بسر کرتا ہے۔ لہٰذا کافر کے لیے یہی جنت ہے، اور آخرت میں اس کے لیے جہنم کا عذاب ہے۔

دنیا پرست اپنی زندگی کو عیش و عشرت سے بھرپور بنانے کے لیے مال و دولت کے حصول ہی کو اپنا مقصدِ حیات بنالیتے ہیں اور جب جائز و ناجائز ذرائع سے مال حاصل کر لیتے ہیں تو فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ انجام یہ ہوتا ہے کہ ان کی نیکیوں کا پلہ ہلکا رہتا ہے اور وہ جہنم کا ایندھن بن جاتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

{وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوٓا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ٥ فَأَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا

178 ... مسلم، کتاب الزھد والرقاق، باب الدنیا سجن للمؤمن وجنۃ للکافر، حدیث:7417۔

كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ}(پ14، نحل:33-34)

"اور اللہ نے اُن پر کچھ ظلم نہ کیا، ہاں وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔ تو اُن کی بُری کمائیاں اُن پر پڑیں اور انہیں گھیر لیا اُس (عذاب) نے جس پر ہنستے تھے"۔

فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ:

جس کا نیکیوں کا پلہ ہلکا ہو گا، اس کا مسکن اور ٹھکانا ہاویہ ہو گا۔ یہاں ٹھکانے کے لیے "اُم" کا لفظ بیان ہوا ہے جس کے معنی ماں کے ہیں اور "ہاوِیہ" دوزخ کا ایک بہت گہرا گڑھا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ جس طرح ماں کی گود اس کے بچوں کا ٹھکانا ہوتی ہے اسی طرح نافرمان وبدکار لوگوں کے لیے دوزخ کے اس گہرے گڑھے کے سوا اور کوئی ٹھکانا نہیں ہو گا۔

"اُم" کا ایک معنی 'جڑ' اور 'گود' کا بھی ہے۔اس لیے اعلیٰ حضرت محدث بریلوی رحمہ اللہ نے اس آیت کا ترجمہ کیا ہے، "وہ نیچا دکھانے والی گود میں ہے"۔

گویا کافروں کو سر کے بَل جہنم میں گرایا جائے گا اور وہ سب سے نچلے مقام یعنی اس کی جڑ تک پہنچ جائیں گے۔ اور "ھاویہ" ان سب اہلِ دوزخ کو نیچا کر دکھائے گی کیونکہ اسے {نَارٌ حَامِيَةٌ} فرمایا گیا ہے، "ایک آگ شعلے مارتی"۔

اس کے معنی ہیں، انتہائی درجہ کی حرارت والی آگ۔ گویا یہ اس قدر سخت گرم جگہ ہے کہ اس کے مقابلے میں باقی دوزخ کی گرمی کچھ نہیں۔ صحیح بخاری میں حدیث پاک ہے کہ اہلِ جہنم میں سب سے کم عذاب جس کو ہو گا اُسے آگ کے جوتے پہنا دیے جائیں گے جن کی بناء پر اُس کا دماغ کھولتے ہوئے پانی کی طرح کھولنے لگے گا۔

اَللّٰهُمَّ اَجِرْنَا مِنَ النَّارِ بِجَاهِ حَبِيْبِكَ الْمُصْطَفٰى ﷺ

تفسیر سورۃ التکاثر

سورۃ التکاثر مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں آٹھ آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡہٰکُمُ التَّکَاثُرُ ۙ﴿۱﴾ حَتّٰی زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ ؕ﴿۲﴾ کَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۙ﴿۳﴾ ثُمَّ کَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ؕ﴿۴﴾ کَلَّا لَوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عِلۡمَ الۡیَقِیۡنِ ؕ﴿۵﴾ لَتَرَوُنَّ الۡجَحِیۡمَ ۙ﴿۶﴾ ثُمَّ لَتَرَوُنَّہَا عَیۡنَ الۡیَقِیۡنِ ۙ﴿۷﴾ ثُمَّ لَتُسۡـَٔلُنَّ یَوۡمَئِذٍ عَنِ النَّعِیۡمِ ٪﴿۸﴾

"اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا (ہے)"

"تمہیں غافل رکھا مال کی زیادہ طلبی نے، یہاں تک کہ تم نے قبروں کا منہ دیکھا۔ ہاں ہاں جلد جان جاؤ گے، پھر ہاں ہاں جلد جان جاؤ گے۔ ہاں ہاں! اگر یقین کا جاننا جانتے تو مال کی محبت نہ رکھتے۔ بیشک تم ضرور جہنم کو دیکھو گے، پھر بیشک ضرور اسے یقینی دیکھنا دیکھو گے۔ پھر بیشک ضرور اُس دن تم سے نعمتوں کی پُرسش ہو گی"۔

(کنز الایمان از اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ)

لفظی ترجمہ:

اَلۡھٰی	کُمُ	التَّکَاثُرُ
غافل رکھا	تمہیں	مال کی زیادہ طلبی (نے)

حَتّٰی	زُرۡتُمُ	الۡمَقَابِرَ
یہاں تک کہ	منہ دیکھا تم نے	قبروں (کا)

کَلَّا	سَوۡفَ	تَعۡلَمُوۡنَ
ہر گز نہیں	عنقریب	جان جاؤ گے تم

تَعۡلَمُوۡنَ	سَوۡفَ	كَلَّا	ثُمَّ
جان جاؤ گے تم	جلد ہی	ہر گز نہیں	پھر

الۡيَقِيۡنِ	عِلۡمَ	تَعۡلَمُوۡنَ	لَوۡ	كَلَّا
یقین (کا)	جاننا	جانتے تم	اگر	ہر گز نہیں

الۡجَحِيۡمَ	تَرَوُنَّ	لَ
جہنم	ضرور دیکھو گے تم	البتہ

الۡيَقِيۡنِ	عَيۡنَ	هَا	تَرَوُنَّ	لَ	ثُمَّ
یقین (کی)	آنکھ (سے)	اُسے	تم ضرور دیکھو گے	بیشک	پھر

النَّعِيۡمِ	عَنِ	يَوۡمَئِذٍ	تُسۡـَٔلُنَّ	لَ	ثُمَّ
نعمتوں	سے / کے متعلق	اُس دن	ضرور پوچھے جاؤ گے تم	البتہ	پھر

ربط و مناسبت:

سورۃ القارعہ میں قیامت اور اس کے بعض حالات بیان ہوئے تھے، اس سورت میں انسان کو غفلت سے بیدار ہو کر قیامت کی فکر کرنے کا پیغام دیا گیا ہے۔

پچھلی سورت میں اچھے بُرے اعمال تولے جانے کا ذکر تھا، اس سورت میں بتایا گیا ہے کہ مال و اولاد اور نعمتوں کی کثرت آزمائش ہے اور تمام نعمتوں کا حساب دینا ہو گا۔

سابقہ سورت میں نیکوں کے لیے من پسند عیش والی زندگی کی خوشخبری دی گئی تھی، اس سورت میں بتایا گیا ہے کہ پسندیدہ عیش والی زندگی کے لیے اچھے اعمال کرنے میں مال کی کثرت کی ہوس بڑی رکاوٹ ہے۔

پچھلی سورت میں فرمایا گیا کہ برائیوں کا پلہ بھاری ہونے پر دوزخ میں عذاب ہو گا، اس سورت

میں بتایا گیا ہے کہ دوزخ سے بچنے کی کیا تدبیر ہے؟ اور وہ یہ ہے کہ ضرورت سے زائد مال کی ہوس میں اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ سے غافل نہ ہو جاؤ۔

شانِ نزول:

یہ سورت سورۃ الکوثر کے بعد نازل ہوئی۔ اس سورت کے اندازِ بیاں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت کا نزول بھی سورۃ القارعہ کی طرح انہی حالات میں ہوا ہے جب ایمان کی دعوت دینے کے بعد انسانی فکر و ذہن میں وہ شعور بیدار کیا جاتا تھا جس کے سبب بندہ خود اپنے نظریات اور اعمال کا احتساب کرنا شروع کر دے۔

اس سورت میں اسی فکری تعلیم و تربیت کے بنیادی اصول بیان ہوئے ہیں۔

اول: مال کی ہوس اور کثرت کی حرص اللہ تعالیٰ سے غافل کر دیتی ہے۔

دوم: اس غفلت کا انجام بہت برا ہے۔ اگر تمہیں اس کا یقینی علم حاصل ہو جائے تو تم گناہ کے قریب بھی نہ جاؤ کیونکہ تمہیں اس کے ساتھ جہنم نظر آئے گی۔

سوم: دنیا کی نعمتوں کی کثرت کی وجہ سے اپنے رب سے غافل نہ بنو۔ قیامت میں تم سے ہر نعمت کے متعلق ضرور پوچھا جائے گا۔

رسولِ معظم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات کی طاقت نہیں رکھتا کہ وہ روزانہ ایک ہزار آیات کی تلاوت کرے؟ صحابہ نے عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! ہم میں سے ہر روز ایک ہزار آیات کون پڑھ سکتا ہے۔ آقا و مولیٰ ﷺ نے فرمایا: کیا تم میں سے کوئی بھی روزانہ سورۃ التکاثر نہیں پڑھ سکتا؟ یعنی یہ سورت تلاوت کرنا ایک ہزار آیات پڑھنے کے برابر ہے۔ (179)

اَلۡهٰكُمُ التَّكَاثُرُ:

"اَلۡهٰی" کا معنی ہے "زیادہ ضروری چیز سے غافل رکھنا"۔

"التَّکَاثُرُ" کے معنی ہیں، کسی چیز کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی حرص۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے اس کا معنی "تفاخر" بیان کیا ہے۔ لہٰذا تکاثر کے دو معنی ہوئے۔ اول: کسی چیز

179... مستدرک، کتاب فضائل القرآن، حدیث: 2127

کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا اور دوم: پھر اس چیز کے حصول کو فخر کا ذریعہ سمجھنا اور دوسروں پر فخر جتانا۔

سوال یہ ہے کہ یہ کثرت کس چیز میں ہے؟ جواب یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان کے نفس کو پسند ہو مثلاً مال و دولت، اولاد، جاہ و منصب، قوت واقتدار، عالیشان بنگلے وغیرہ۔ چونکہ ان سب چیزوں میں مال و دولت کی حرص انسان کو سب سے زیادہ ہوتی ہے اور دوسری چیزوں کی طلب بھی مال و دولت کی حرص پوری کرنے کا ہی ذریعہ ہوتی ہے نیز سورۃ العادیات میں انسان کو مال کی شدید محبت میں مبتلا بتایا گیا ہے اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تکاثر کا مطلب ہے، ''کثرت کے ساتھ مال و دولت جمع کرنے کی حرص اور پھر اس کثرت پر فخر کرنا''۔

''تَکَاثُر'' کا لفظ قرآن کریم میں ایک اور جگہ یوں آیا ہے،

{اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِیْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَیْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ}

''جان لو کہ دنیا کی زندگی تو نہیں مگر کھیل اور کود، اور آرائش اور تمہارا آپس میں بڑائی مارنا اور مال اور اولاد میں ایک دوسرے پر زیادتی چاہنا''۔(پ27، حدید:20)

اس آیت مبارکہ میں بھی ''تفاخُر'' یعنی ایک دوسرے پر برتری جتانا اور ''تکاثُر'' یعنی نعمتوں کے حصول میں ایک دوسرے پر زیادتی چاہنا، ان دونوں عیبوں کی مذمت فرمائی گئی۔ خیال رہے کہ یہاں مال و متاع کی جس کثرت کا ذکر ہے، وہ مذموم ہے جبکہ مقصود فسق و فجور ہو یا وہ کثرت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت و اطاعت سے غفلت کا سبب بن جائے، ورنہ رب تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے مال طلب کرنا تو اچھا کام ہے۔

آقا و مولیٰ ﷺ کا ارشاد ہے، صرف دو آدمیوں پر رشک کرنا جائز ہے ایک وہ جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کا علم عطا فرمایا اور وہ اسے دن رات پڑھتا ہے اور دوسرا وہ جسے اللہ تعالیٰ نے مال دیا اور دن رات اسے راہِ خدا میں خرچ کرتا ہے۔[180]

اب آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہو گا کہ: تمہیں زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنے کی ہوس نے اللہ تعالیٰ

180 ... بخاری، کتاب العلم، باب الاغتباط فی العلم و الحکمۃ، حدیث:73

کی اطاعت سے غافل رکھا، یہاںتک کہ تمہیں موت آگئی اور تمہیں قبروں میں دفن کر دیا گیا۔ حضورِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے، ”کثرت کی خواہش نے تمہیں اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے غافل کر دیا یہاںتک کہ تمہیں موت آگئی“۔ (181)

جائز طریقوں سے مال حاصل کرنا اور دنیا کمانا بذاتِ خود کوئی بری بات نہیں ہے۔ حضرت سفیان ثَوری رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے، گذشتہ زمانے میں مال جمع کرنا، ناپسندیدہ کام تھا لیکن آج مال مومن کے لیے ڈھال ہے یعنی بہت سے گناہوں سے بچنے کا ذریعہ ہے۔ اگر یہ مال نہ ہوتا تو حاکم واُمراء ہمیں رومال بنا لیتے یعنی اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے۔ پس جسکے پاس کچھ مال ہو، اُسے چاہیے کہ اس کی حفاظت کرے اور بڑھائے کیونکہ اس پُر فتن دور میں اگر کوئی محتاج ہو جائے تو عجب نہیں کہ وہ جو چیز پہلے خرچ کرے وہ اس کا دین ہو لہٰذا حلال مال میں فضول خرچی کی کوئی گنجائش نہیں۔

مشکوٰۃ شریف کی اس روایت سے معلوم ہوا کہ بقدرِ ضرورت حلال طریقے سے مال جمع کرنا مذموم نہیں۔ اور جسے اللہ تعالیٰ نے زیادہ مال عطا فرمایا ہو، اُسے چاہیے کہ اس مال کو راہِ خدا میں خرچ کرے نہ یہ کہ عیاشیوں اور برائیوں میں برباد کر کے خدا کی ناراضی اور اس کے عذاب کا مستحق بنے۔ اصل بات یہ ہے کہ جو چیز بھی انسان کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت سے غافل کرے خواہ وہ مال و متاع ہو یا جاہ و منصب، وہ مذمت کے لائق ہے۔

یہاں مال کی مذمت بھی اسی لیے کی جارہی ہے کہ انسان زیادہ مال جمع کرنے کی ہوس میں اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب ﷺ کی اطاعت کو فراموش کر دیتا ہے، مال حاصل کرنے کی محبت، اللہ عزّوجل اور رسول ﷺ کی محبت پر غالب آجاتی ہے اسی لیے وہ حلال و حرام میں تمیز کھو دیتا ہے، مال و دولت جمع کرنے کی خواہش دیوانگی کی صورت اختیار کر لیتی ہے، ملک سے غداری، قوم سے دھوکا، فرائض میں بددیانتی، امانت میں خیانت، زندگی کا لازمی جزو بن جاتے ہیں۔ پھر انہیں خدا یاد رہتا ہے نہ اُس کا رسول، مقصدِ حیات یاد آتا ہے نہ حقوقُ العباد، اور موت یاد آتی ہے نہ قبر کا تاریک گڑھا۔

ارشاد ہوا: ”اَلْهٰكُم“۔ تمہیں غافل رکھا۔ کس چیز سے؟ اس کی تفصیل نہیں بتائی گئی۔ اس

181...در منثور، تکاثر، تحت الآیۃ:1

تفصیل میں ایمان و فرائض سے متعلقہ امور بھی ہیں اور چھوٹی نیکیاں بھی۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا فراموش شخص صرف خدا سے غافل نہیں ہوتے بلکہ وہ خود فراموش بنا دیے جاتے ہیں اور وہ اپنے انجام سے غافل ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ اُنہیں موت آ جاتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا،

{يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ o وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ}

”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ہر جان دیکھے کہ کل کے لیے کیا آگے بھیجا۔ اور اللہ سے ڈرو، بیشک اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے۔ اور اُن جیسے نہ ہو جو اللہ کو بھول بیٹھے تو اللہ نے انہیں بلا میں ڈالا کہ انہیں اپنی جانیں یاد نہ رہیں، وہی فاسق ہیں“۔(پ28، حشر:18-19)

ایسے غافل لوگوں کو جب موت سامنے نظر آتی ہے اُس وقت سوچتے ہیں، کاش! میں دنیا میں لوٹا دیا جاؤں تاکہ کچھ نیک کام کر لوں۔ کاش! مجھے تھوڑی سی مہلت مل جاتی تو میں اپنے مال سے کچھ صدقہ دے دیتا۔ ارشاد ہوا:

{حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ o لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا}

”یہاں تک کہ جب ان میں کسی کو موت آئے تو کہتا ہے، اے میرے رب! مجھے واپس پھیر دیجیے، شاید اب میں کچھ بھلائی کماؤں اس میں جو چھوڑ آیا ہوں۔ ! ہشت (کلمۂ نفرت) یہ تو ایک بات ہے جو وہ اپنے منہ سے کہتا ہے“۔(پ18، مومنون:99-100)

یعنی یہ بیکار بات ہے جو وہ موت کو دیکھ کر کہے گا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اگر اسے دوبارہ دنیا میں لوٹا دیا جائے تو پھر یہ وہی کچھ کرے گا جو پہلے کیا کرتا تھا۔

ایک اور جگہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے،

{يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ o وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ

فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ}

"اے ایمان والو! تمہارے مال نہ تمہاری اولاد، کوئی چیز تمہیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کرے، اور جو ایسا کرے تو وہی لوگ نقصان میں ہیں۔ اور ہمارے دیے میں سے کچھ ہماری راہ میں خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کو موت آئے پھر کہنے لگے، اے میرے رب! تو نے مجھے تھوڑی مدت تک کیوں مہلت نہ دی کہ میں صدقہ دیتا اور نیکوں میں ہوتا"۔(پ28، منافقون:9-10)

حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ:

اس آیت مبارکہ میں مال ومتاع اور دیگر نعمتوں کی حرص وہوس کے مقابل قبروں کا منہ دیکھنے کا ذکر کیا گیا۔ وجہ یہ ہے کہ انسان ساری عمر مال ودولت، بینک بیلنس، جائیداد، گاڑیاں، بزنس، اقتدار، منصب وغیرہ جو کچھ بھی طلب کرتا رہتا ہے، جیسے ہی انسان کو موت آتی ہے یہ ساری چیزیں اس کے لیے بیکار وبے مقصد ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اور سب لوگ اس حقیقت کو سمجھتے ہیں کہ ان میں سے کوئی چیز بھی اس کے کام آنے والی نہیں اسی لیے ان میں سے کوئی چیز بھی قبر میں انسان کے ساتھ نہیں جاتی۔

جانِ کائنات ﷺ کا فرمانِ عالیشان ہے، تین چیزیں میت کے ساتھ جاتی ہیں، دو واپس آجاتی ہیں اور ایک ساتھ رہتی ہے۔ میت کے ساتھ اس کے گھر والے، اس کا مال اور اس کے اعمال جاتے ہیں۔ اس کے گھر والے اور مال لوٹ آتے ہیں، صرف اس کے اعمال اس کے ساتھ رہتے ہیں۔[182]

قبر آخرت کی پہلی منزل ہے اور یہ پہلی منزل ہی ثابت کر رہی ہے کہ انسان جن چیزوں کی خاطر اپنے رب کی بندگی اور اپنے آقا ومولیٰ ﷺ کی اطاعت کو فراموش کر دیتا ہے، ان میں سے کوئی چیز بھی قبر یا آخرت میں اُسکے کام نہیں آئے گی۔

حضرت مطرف رضی اللہ عنہ کے والد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں آقا کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ اس وقت سورۃ التکاثر تلاوت فرما رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: بندہ کہتا ہے، میرا مال، میرا مال۔ اے فرزندِ آدم! تیرا مال تو صرف وہی ہے جو تو نے کھایا اور فنا کر دیا، یا تو نے پہنا اور بوسیدہ کر دیا، یا تو نے صدقہ کیا اور اپنے لیے آگے بھیج دیا (تاکہ آخرت میں کام آئے) اس کے علاوہ جو بھی مال ہے، تو اسے

182...بخاری، کتاب الرقاق، حدیث:6514۔

لوگوں کے لیے چھوڑ کر اچانک دنیا سے چلا جائے گا۔[183]

موت آتے ہی انسان یہ جان لیتا ہے کہ اس کا سارا مال، جائیداد، گاڑیاں، بنگلے سب کچھ اس کے وارثوں کا ہے۔ ان میں سے کوئی چیز اب اس کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ ایک دن رسولِ معظم ﷺ نے فرمایا: تم میں کون ہے جسے اپنے وارثوں کا مال اپنے مال سے زیادہ پیارا ہو؟ صحابہ کرام نے عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں کیونکہ ہر کسی کو اپنا مال اپنے وارث کے مال سے زیادہ پیارا ہے۔

ارشاد فرمایا: انسان کا اپنا مال وہ ہے جو وہ آگے بھیج دے (یعنی راہِ خدا میں خرچ کر دے) اور وارث کا مال وہ ہے جو وہ چھوڑ جائے۔[184]

"زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ" کے الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو ہمیشہ قبر میں نہیں رہنا کیونکہ زیارت کرنے والا جہاں جاتا ہے وہ جگہ دیکھ کر پھر اپنے اصل مقام کو روانہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مرنے والوں کا قبروں میں قیام عارضی ہو گا پھر وہ دوبارہ زندہ کر کے اپنے انجام کی جگہ جنت یا دوزخ کو جائیں گے۔

دل کی سختی اور غفلت کا علاج یہ ہے کہ بار بار قبروں کی زیارت کی جائے۔ زیارتِ قبور کی ایک اہم حکمت یہ ہے کہ لوگ جب قبرستان جائیں تو سوچیں کہ انسان تمام عمر کس طرح مال کمانے کی دُھن میں مصروف رہتا ہے حتیٰ کہ اسے نماز پڑھنے کی بھی فرصت نہیں ہوتی پھر وہ ہزاروں خواہشیں ادھوری چھوڑ کر اچانک دنیا سے چلا جاتا ہے۔ پھر اس کے مقدر میں کفن کی تین چادریں ہوتی ہیں اور دو گز زمین۔

فقیر نے اپنی کتاب "مزاراتِ اولیاء اور توسل" میں زیارتِ قبور کے متعلق تفصیلی گفتگو کی ہے، اس میں سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے: "حضورِ اکرم ﷺ کا ایک ارشاد گرامی ہے، "قبروں کی زیارت کیا کرو کیونکہ یہ موت یاد دلاتی ہیں"۔[185]

183... مسلم، کتاب الزھد والرقائق، حدیث: 7420

184... بخاری، کتاب الرقاق، حدیث: 6442

185... ابن ماجہ، کتاب ماجاء فی الجنائز، حدیث: 1571

قبروں کی زیارت کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ مسلمان کو اپنی موت یاد آتی ہے جس سے آخرت کی فکر پیدا ہوتی ہے اور وہ برائیوں کو چھوڑ کر نیکیوں کی طرف راغب ہونے لگتا ہے۔ اگر فکر آخرت کے ساتھ بار بار قبروں کی زیارت کی جائے تو یقیناً اس کے اثرات انسانی زندگی پر ظاہر ہوتے ہیں اور وہ رفتہ رفتہ دنیا سے بے رغبت ہو کر راہِ حق پر گامزن ہو جاتا ہے۔

رسولِ معظم ﷺ نے فرمایا، ''میں نے زیارتِ قبور سے منع کیا تھا اب تم قبروں کی زیارت کیا کرو کیونکہ یہ دل کو نرم کرتی ہیں اور آنکھوں میں آنسو لاتی ہیں''۔ (186)

نورِ مجسم ﷺ کا اِرشاد ہے، ''میں نے تمہیں زیارتِ قبور سے منع فرمایا تھا اب انکی زیارت کیا کرو کیونکہ یہ عبرت حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں''۔ (187)

اِن احادیثِ مبارکہ سے زیارتِ قبور کی ایک حکمت تو یہ معلوم ہوئی کہ اس سے موت کی یاد اور آخرت کی فکر نصیب ہوتی ہے اور قبولِ حق کے لیے دل نرم ہو جاتے ہیں نیز یہ عبرت و نصیحت حاصل کرنے کا مؤثر ذریعہ ہے''۔

آیت ۳ تا ۵ کی تفسیر:

ارشاد ہوا: ''ہاں ہاں جلد جان جاؤ گے، پھر ہاں ہاں جلد جان جاؤ گے۔ ہاں ہاں! اگر یقین کا جاننا جانتے تو مال کی محبت نہ رکھتے''۔

پہلی آیت میں وعید کا تعلق موت یا قبر سے ہے اور دوسری وعید کا تعلق قبر سے اُٹھائے جانے کے وقت سے ہے اور دوسری وعید پہلی سے زیادہ سخت ہے۔ یعنی جب قبر میں پہنچو گے تو غفلت والی زندگی کا انجام جان جاؤ گے پھر جب قبر سے نکل کر محشر میں آؤ گے تو تم اپنا انجام ضرور جان جاؤ گے۔

ان آیات کا بصیرت افروز مفہوم سمجھنے کے لیے ذرا تصور کیجیے کہ لوگ اپنے رب سے غافل، اپنی موت سے بے پرواہ اور اپنی آخرت کو فراموش کر کے دنیا اور اس کا مال و متاع جمع کرنے کی حرص وہوس میں مدہوش ہیں اور وہ جہنم کے گہرے گڑھے کے اتنے قریب پہنچ چکے ہیں کہ بس موت آئی اور وہ جہنم میں گرے۔

186...شرح الصدور، ص238
187...شرح الصدور، ص241

ایسے میں ایک ڈر سنانے والا اور غیب کی خبریں بتانے والا ایک بلند مقام پر کھڑے ہو کر انہیں خطرے سے آگاہ کر رہا ہے، اے لوگو! تم دنیا کی فانی چیزوں اور حقیر لذتوں کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی حرص میں مبتلا ہو کر اپنے خالق و مالک اور رب کو بھول چکے ہو۔ ان چیزوں کے حصول کی ہوس میں باہمی مسابقت اور تفاخر نے تمہیں اپنے مقصدِ حیات سے غافل کر دیا ہے۔ تم مال و دولت اور جاہ و منصب کے حصول کی دُھن میں اپنی موت اور آخرت کو بھول بیٹھے ہو۔

اب وہ لمحہ آنے والا ہے کہ اچانک تمہیں موت آئے گی اور تم یہ سب مال و متاع اور جاہ و منصب چھوڑ کر قبر کے تاریک گڑھے میں چلے جاؤ گے، جہاں تمہارے لیے بستر ہے نہ تکیہ، روشنی ہے نہ اے سی، مال ہے نہ خادم، دوست ہیں نہ رشتہ دار، طاقت ہے نہ اقتدار۔ وہاں صرف ایک چیز تمہارے ساتھ ہو گی اور وہ ہیں تمہارے اعمال۔

اگر روزانہ قبرستان میں مُردے دفن ہوتے دیکھ کر بھی تمہیں اس بات کا یقین نہیں تو ''ہاں ہاں جلد جان جاؤ گے''۔ جب تم خود قبر میں پہنچو گے تو یہ حقیقت تم پر آشکارا ہو جائے گی کہ وہاں تمہارے ساتھ سوائے تمہارے نیک و بد اعمال کے کچھ نہیں۔ اور ''پھر ہاں ہاں جلد جان جاؤ گے'' جب قبریں کھلیں گی اور تم قبروں سے اٹھائے جاؤ گے اور تمہارے سینوں میں پوشیدہ راز تک کھول کر سامنے رکھ دیے جائیں گے۔

''ہاں ہاں! اگر یقین کا جاننا جانتے تو مال کی محبت نہ رکھتے''۔ اب بھی وقت ہے دنیا اور مالِ دنیا کی حقیقت کو سمجھو اور اپنے مقصدِ تخلیق پر غور کرو۔ آقائے دو جہاں ﷺ کا فرمان ذیشان ہے، جب بھی سورج طلوع ہوتا ہے تو دو فرشتے پکارتے ہیں، سوائے جن و انس کے تمام مخلوق ان کی یہ بات سنتی ہے۔ ''اے لوگو! اپنے رب کی طرف آؤ! جو تھوڑا ہو اور کافی ہو، وہ اس سے اچھا ہے جو زیادہ ہو اور غافل کر دے''۔ (مشکوٰۃ)

یقین کے درجے:

یقین کے لغوی معنی ہیں، کسی چیز کا ایسا علم جس میں کوئی شک نہ ہو۔
یقین کے تین درجے ہیں۔

اول: علمُ الیقین جو انسان کو دلائل سے حاصل ہوتا ہے۔

دوم: عینُ الیقین جو انسان کو مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔

اور سوم: حقُ الیقین جو انسان کو تجربہ سے حاصل ہوتا ہے۔

مثلاً ہر انسان کو موت کا یقین حاصل ہے، یہ علمُ الیقین ہے۔ جب وہ موت کا فرشتہ خود دیکھ لے گا تو اس کا یقین، عینُ الیقین کہلائے گا اور جب وہ موت کا مزہ چکھ لے گا تو اُس وقت کا یقین، حقُ الیقین کہلائے گا۔

گویا مذکورہ آیت میں اس خواہش کا اظہار کیا گیا ہے کہ کاش! جو بات تم موت کے وقت جان جاؤ گے یا جو بات تمہیں قبر میں جاکر معلوم ہوگی، تم آج ہی اس پر یقین پختہ کرلو اور قرآن وحدیث کے ذریعے اس کا یقینی علم حاصل کرلو ورنہ موت کے وقت کا یقینی علم تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے گا۔

قرآن کریم میں متقین کی پہلی صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ "وہ بے دیکھے ایمان رکھتے ہیں"۔ جن چیزوں کی نسبت ہدایت ویقین سے معلوم ہے کہ یہ دینِ محمدی سے ہیں، ان سب کو ماننے، اور دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کرنے کا نام ایمان ہے۔(188)

یہ بات روز مرہ کے مشاہدے کا حصہ ہے کہ ایک ناسمجھ بچہ آگ میں بلا جھجک ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ اسے علم نہیں کہ آگ جلاتی ہے۔ اگر بالفرض اسے یہ بتا دیا جائے اور پھر بھی وہ آگ میں ہاتھ ڈال دے تو عقلمند یہی کہیں گے کہ اس نے ایسا اس لیے کیا کہ یہ ناسمجھ ہے، اسے آگ کے جلا دینے کا یقین نہیں تھا۔ یہی عقلمند لوگ خود کبھی آگ میں ہاتھ نہیں ڈالتے کیونکہ انہیں آگ کے جلا دینے کا یقین ہوتا ہے۔

غور فرمایئے، اس دنیاوی آگ کے جلا دینے پر پختہ یقین ہونے کے باعث عقلمند اس سے دور رہتے ہیں لیکن جہنم کی آگ سے بچنے کی کوئی فکر نہیں کرتے۔ کیا اس کا سبب یہ نہیں کہ ہمارا آخرت پر یقین دنیاوی لذتوں اور نفسانی خواہشات کے گرد و غبار میں اَٹ کر دھندلا گیا ہے؟

کیا رب تعالیٰ اور اس کے سچے رسول ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ منکروں اور نافرمانوں کو جہنم کی

188... خزائن العرفان، بقرہ، تحت الایۃ: 3

آگ میں جلایا جائے گا؟ اور جہنم کی آگ دنیا کی آگ سے کئی گنا زیادہ طاقتور ہے۔ اگر دنیاوی آگ کے جلانے کی طرح ہمیں جہنم کی آگ کے جلانے پر بھی ایسا یقین ہو جائے تو ہم کبھی حرام کاموں کے قریب نہ جائیں اور شیطان کی پیروی کرنے کی بجائے صرف آقا و مولیٰ ﷺ ہی کی پیروی کریں۔

آیت ۷،٦ کی تفسیر:

ارشاد ہوا: "بیشک ضرور جہنم کو دیکھو گے، پھر بیشک ضرور اسے یقینی دیکھنا دیکھو گے"۔ مفہوم یہ ہے کہ اے لوگو! تمہیں رسولِ معظم ﷺ نے قرآن کریم اور احادیثِ مقدسہ کے ذریعے علم عطا فرما دیا ہے کہ قیامت میں جس کے نیکیوں کے پلّے ہلکے ہونگے وہ جہنم کی آگ میں ڈالا جائے گا۔

آج تم اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب ﷺ کے بتائے ہوئے علم پر یقین کر لو کہ بیشک جہنم کا وجود ہے۔ ورنہ قیامت کے دن تم جہنم کو اپنی آنکھوں سے ضرور دیکھ لو گے۔

جہنم پر یقین نہ کر کے غفلت میں ساری زندگی گزار کر اگر اُس وقت یقین کی آنکھ سے دیکھو گے بھی تو کیا فائدہ۔ تمہاری نجات اسی میں ہے کہ تم آج ہی خوابِ غفلت سے بیدار ہو جاؤ اور جہنم سے بچنے کی تیاری شروع کر دو۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے، "دنیا میں انسان کو یقین اور عافیت سے بہتر کوئی چیز نہیں دی گئی لہٰذا اللہ تعالیٰ سے یہ دونوں چیزیں مانگو"۔

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: بیشک آقا و مولیٰ ﷺ نے سچ فرمایا۔ یقین ہی کی وجہ سے جہنم سے بھاگا جاتا ہے، یقین ہی کی بناء پر جنت مانگی جاتی ہے، یقین ہی سے مصیبت پر صبر ہوتا ہے، یقین ہی کے باعث فرائض ادا کیے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے عافیت دینے میں خیر کثیر ہے۔ (189)

اہلِ معرفت فرماتے ہیں: علمُ الیقین سے محروم رہنا بہت بڑی کم نصیبی ہے اور اس کے حاصل نہ ہونے کی وجہ محبتِ رسول ﷺ سے غفلت، اتباعِ سنت سے دُوری اور نفسانی خواہشات کی تکمیل میں مستغرق ہونا ہے۔ اگر علمُ الیقین حاصل ہو جائے تو بندے کو دنیا ہی میں گناہ کے ساتھ جہنم نظر آنے لگتی ہے اور پھر وہ گناہوں سے اس طرح دور ہو جاتا ہے جیسے وہ جہنم سے دور رہنا چاہتا ہے۔

189... کتاب الزہد، ص362

مومن اور کافر دونوں جہنم کو دیکھیں گے مگر ان کے دیکھنے میں بڑا فرق ہو گا۔ پلِ صراط جہنم پر قائم کیا گیا ہے۔ قیامت کے دن سب کو اس پر سے گزارا جائے گا۔ کافر جہنم میں گر جائیں گے اور یہی ان کا جہنم کو دیکھنا ہے۔ جبکہ مومن پل پر سے سلامتی سے گزر جائیں گے۔ مومنوں کا گزرنا ان کے درجات کے لحاظ سے مختلف ہو گا۔ کئی بجلی کی سی تیزی سے گزریں گے، کئی ہوا کی تیزی سے اور کئی آہستہ آہستہ۔

{وَاِنۡ مِّنۡكُمۡ اِلَّا وَارِدُهَا‌ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتۡمًا مَّقۡضِيًّا‌ۚ ‏ o ثُمَّ نُـنَجِّى الَّذِيۡنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيۡنَ فِيۡهَا جِثِيًّا}(پ16، مریم:71-72)

"اور تم میں کوئی ایسا نہیں جس کا گذر دوزخ پر نہ ہو۔ تمہارے رب کے ذمہ پر یہ ضرور ٹھہری ہوئی بات ہے۔ پھر ہم ڈر والوں کو بچالیں گے اور ظالموں کو اس میں چھوڑ دیں گے گھٹنوں کے بل گرے"۔

نعمتوں کی پُرسش:

ارشاد ہوا: "پھر بیشک ضرور اُس دن تم سے نعمتوں کی پُرسش ہو گی"۔

یعنی قیامت کے دن تم سے ان تمام نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا جو دنیا میں تمہیں دی گئیں کہ تم نے ان نعمتوں کا شکر ادا کیا تھا یا نہیں؟ ان نعمتوں کو کس طرح استعمال کیا تھا؟ ان نعمتوں کا حق ادا کیا تھا یا نہیں؟

انسان کو رب تعالیٰ نے لاتعداد نعمتیں عطا فرمائی ہیں جو دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جو خداداد ہیں یعنی اس میں بندے کی اپنی کوشش کو دخل نہیں۔ مثلاً زندگی، جسم، دماغ، قوت، قابلیت، جوانی، صحت، وغیرہ۔ ان تمام نعمتوں کے متعلق سوال ہو گا کہ تم نے انہیں کس قسم کی کوششوں میں استعمال کیا تھا۔

دوسری قسم کی نعمتیں وہ ہیں کہ ان میں رب تعالیٰ کی عطا کے ساتھ بندوں کی اپنی کوشش و محنت کا بھی دخل ہے۔ مثلاً مال و دولت، گاڑیاں، بنگلے اور ہر قسم کی جائیداد وغیرہ۔ ایسی نعمتوں کے متعلق دو طرح کے سوالات ہونگے۔ ایک یہ کہ ان چیزوں کو کن طریقوں سے حاصل کیا؟ اور دوسرا یہ کہ انہیں کس طرح کے کاموں میں استعمال کیا؟ آقا و مولیٰ ﷺ نے فرمایا:

”قیامت کے دن انسان کے قدم اپنی جگہ سے نہیں ہٹیں گے جب تک کہ ان چیزوں کے متعلق سوال نہ کر لیا جائے گا۔

۱-زندگی کن کاموں میں گزاری؟

۲-جوانی کو کیسے کاموں میں گنوایا؟

۳-مال کن طریقوں سے حاصل کیا؟

۴-مال کو کہاں کہاں خرچ کیا؟

۵-جو علم سیکھا اس پر کتنا عمل کیا؟[190]

اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ مذکورہ دونوں قسم کی نعمتوں کے متعلق سوال ہو گا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ نے عرض کی، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم سے کون سی نعمت کا سوال ہو گا، ہماری خوراک تو کھجوریں اور پانی ہے، دشمن ہمارے قریب ہے اور تلواریں ہمارے کندھوں پر ہیں پھر کس بات کا سوال ہو گا؟ فرمایا، ان چیزوں کے متعلق بھی پوچھا جائے گا۔(ترمذی)[191]

آپ ہی سے مروی ایک طویل حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک انصاری صحابی کے گھر تشریف لے گئے۔ انہوں نے کھجوریں اور بکری کا گوشت کھلایا اور ٹھنڈا پانی پلایا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اُس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! قیامت کے دن تم سے آج کی ان نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ تم اپنے گھروں سے بھوکے نکلے تھے اور اب سَیر ہو کر واپس جا رہے ہو۔[192]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ امن اور صحت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ دنیا کی ہر لذت اور ہر نعمت کے متعلق پوچھا جائے گا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مومن سے اس کے تمام کاموں کے متعلق پوچھا جائے گا یہاں تک کہ اس نے اپنی

190...ترمذی، حدیث:2424

192... مسلم، کتاب الاشربۃ، حدیث:2038

191...ترمذی، کتاب الزھد، حدیث:2369

آنکھ میں جو سرمہ لگایا تھا، اس کے بارے میں بھی پوچھا جائے گا (کہ اس کا ارادہ کیا تھا)۔
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بدن، کان اور آنکھ کے متعلق سوال ہو گا کہ انہیں کن مقاصد کے لیے استعمال کیا؟[(193)]
ارشادِ باری تعالیٰ ہے،
{اِنَّ السَّمۡعَ وَالۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِکَ كَانَ عَنۡهُ مَسۡـُٔوۡلًا}
"بیشک کان اور آنکھ اور دل، ان سب سے سوال ہونا ہے"۔ (پ15، بنی اسرائیل:36)
یعنی ان کے متعلق پوچھا جائے گا کہ تم نے انہیں کن کاموں میں استعمال کیا۔
مذکورہ آیت میں ثُمَّ کا لفظ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ سوال وجواب جہنم کو دیکھنے کے بعد کیے جائیں گے اس لیے یہ سوال پلِ صراط پر ہونگے۔ ارشادِ ربانی ہے،
{وَقِفُوۡهُمۡ اِنَّهُمۡ مَّسۡـُٔوۡلُوۡنَ} (پ23، صفت:24)
"اور انہیں ٹھہراؤ، ان سے پوچھنا ہے"۔
اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ سوال پلِ صراط پر ہونگے جبکہ میدانِ حشر میں بھی سوال ہونگے جیسا کہ اوپر بخاری ومسلم کی حدیث میں مذکور ہے۔
خلاصہ یہ ہے کہ محشر میں بھی سوال ہونگے اور پلِ صراط پر جہنم کو دیکھنے کے بعد بھی۔ اور بعض اہلِ ایمان سے کسی بھی مقام پر کوئی سوال نہ ہو گا۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں رسولِ معظم نورِ مجسم ﷺ کا ارشاد ہے کہ "میری امت کے ستّر ہزار افراد بلا حساب جنت میں جائیں گے"۔
اَللّٰهُمَّ اجۡعَلۡنَا مِنۡهُمۡ بِفَضۡلِکَ وَبِحُرۡمَةِ حَبِیۡبِکَ ﷺ۔
رب تعالیٰ کی نعمتوں پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی بنیاد پر انسان ترقی کے جو دعوے کرتا ہے ان کی حقیقت صرف یہ ہے کہ اس نے قدرت کے سربستہ راز معلوم کر کے قدرت کی عطا کردہ چیزوں کو بہترین انداز میں اپنی خدمت کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ جو چیزیں بھی اس کی ترقی کا جزو ہیں وہ رب تعالیٰ ہی کی بنائی ہوئی ہیں۔ ہوا، پانی، آگ، مٹی، بارش، لوہا، دھاتیں،

193...در منثور، تکاثر، تحت الآیۃ:8

انسانی دماغ اور اس کی تمام صلاحیتیں، کیا کوئی ایک چیز بھی انسان کی اپنی تخلیق ہے؟؟

ہر گز نہیں۔ ان میں سے کوئی ایک چیز بھی انسان کی اپنی تخلیق نہیں، نہ ہی یہ سب چیزیں کسی حادثے کے نتیجے میں ملی ہیں اور نہ ہی اتفاقاً اچانک خود بخود یہ تمام چیزیں معرضِ وجود میں آئی ہیں بلکہ ان تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ سورۃ الواقعہ میں خالقِ کائنات رب تعالیٰ فرماتا ہے،

{ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ}(پ27، واقعہ:59)

کیا تم اس (قطرہ) کا آدمی بناتے ہو یا ہم بنانے والے ہیں؟

{ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ}(پ27، واقعہ:64)

کیا تم اس (بیج) کی کھیتی بناتے ہو یا ہم بنانے والے ہیں؟

{ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ}(پ27، واقعہ:69)

کیا تم نے اسے بادل سے اتارا یا ہم ہیں اتارنے والے؟

رب تعالیٰ کا یہ بھی فرمانِ عالیشان ہے،

{وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ}

"اور تمہارے لیے کام میں لگائے جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں، اپنے حکم سے، بیشک اس میں نشانیاں ہیں سوچنے والوں کے لیے"۔(پ25، جاثیہ:13)

یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اللہ تعالیٰ کی کسی ایک نعمت کے سامنے انسان کی بڑی سے بڑی نیکی بھی کمتر اور ہیچ ہے۔ نجات کے لیے ہم اس کے فضل و کرم کے محتاج ہیں۔

جانِ کائنات ﷺ کا ارشاد ہے، قیامت کے دن کوئی شخص اس قدر وزنی نیک اعمال لیکر آئے گا کہ ان کا وزن پہاڑ بھی نہ اٹھا سکے لیکن رب تعالیٰ کی عطا کردہ صرف ایک نعمت کی قیمت کے عوض یہ سب نیک اعمال ختم ہو جائیں گے، اگر اللہ تعالیٰ فضل و کرم نہ فرمائے تو سب ہیچ ہے۔(الترغیب)

اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ مرحلہ ان پر آسان ہو گا جو اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔ نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان زبان و دل سے اس بات کا اعتراف کرے کہ یہ سب نعمتیں رب کریم ہی کی عطا کردہ ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ ارشاد مشعلِ راہ بنا لیجیے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا:

{الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَیَهْدِیْنِ o وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِo وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ}

"وہ جس نے مجھے پیدا کیا تو وہ مجھے راہ دے گا، اور وہ جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے، اور جب میں بیمار (ہوتا) ہوں تو وہی مجھے شِفا دیتا ہے"۔(پ19، شعراء:78-80)

زبان سے نعمت کا شکر ادا کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ ہر نعمت کے ملنے پر مثلاً کھانے پینے سے قبل اللہ تعالیٰ کا نام لیا جائے اور پھر "الحمدُللہ" کہہ کر یا مسنون دعائیں پڑھ کر رب تعالیٰ کا شکر ادا کیا جائے۔ اتباعِ سنت کی برکت سے نعمت کی پرسش کا مرحلہ آسان ہو جائے گا۔

اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ جو نعمت رب تعالیٰ نے جس مقصد کے لیے دی ہے اس کو اس کے احکام کے مطابق استعمال کیا جائے۔ پس انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے جسم کو، مال کو اور اپنی تمام صلاحیتوں کو رب تعالیٰ کی رضا اور اس کے محبوب رسول ﷺ کی اطاعت میں استعمال کرے اور زبان و دل سے بھی رب تعالیٰ کی حمد و ثناء اور شکر ادا کرتا رہے۔ رب کریم ہمیں اپنی نعمتوں سے مزید فیضیاب فرمائے اور ہمیں اپنی نعمتوں کا حق ادا کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

تفسیر سورۃ العصر

سورۃ العصر مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں تین آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَ الۡعَصۡرِ ۙ﴿۱﴾ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۬ۙ وَ تَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ﴿۳﴾

”اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا (ہے)“

”اُس زمانۂ محبوب کی قسم! بیشک آدمی ضرور نقصان میں ہے مگر وہ جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور ایک دوسرے کو حق کی تاکید کی اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی“۔(کنزالایمان از امام احمد رضا محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ)

لفظی ترجمہ:

خُسۡرٍ	فِیۡ	لَ	الۡاِنۡسَانَ	اِنَّ	الۡعَصۡرِ	وَ
نقصان	میں(ہے)	ضرور	آدمی	بیشک	اُس زمانہ(کی)	قسم

تَوَاصَوۡا	وَ	الصّٰلِحٰتِ	عَمِلُوا	وَ	اٰمَنُوۡا	الَّذِیۡنَ	اِلَّا
باہم تاکید کی انہوں نے	اور	اچھے	کام کیے	اور	ایمان لائے	وہ جو	مگر

الصَّبۡرِ	بِ	تَوَاصَوۡا	وَ	الۡحَقِّ	بِ
صبر	کی	ایک دوسرے کو وصیت کی اُنہوں نے	اور	حق	(کے) ساتھ

ربط و مناسبت:

پچھلی سورت میں مذکور تھا کہ انسان مال و دولت اور جاہ و منصب وغیرہ کو زندگی کا نصبُ العین سمجھ کر ان چیزوں کے حصول میں اپنی عمر کھپا دیتا ہے اور ان کے حصول کو کامیابی سمجھتا ہے حالانکہ ان

حقیر و فانی چیزوں کی طلب میں اس بیش قیمت زندگی کو ضائع کر دینا سراسر خسارہ ہے۔ اس سورت میں انسان کے مقصدِ تخلیق کو بیان کیا گیا ہے اور اسے خسارے سے بچنے کی چار شرائط بتا دی گئی ہیں۔

سورۃ التکاثر میں ان لوگوں کی کم عقلی اور نادانی کا تذکرہ تھا جو نفسانی خواہشات کی تکمیل میں زیادہ سے زیادہ دنیا جمع کرنے اور اس کی حقیر و فانی لذتوں میں ایسے مستغرق ہو جاتے ہیں کہ اپنے خالق و مالک کی بندگی کو فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ اس سورت میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ اپنی قیمتی زندگی کے ہر ہر لمحہ کی قدر کرو اور اسے رضائے الٰہی کے حصول کے لیے وقف کر دو تا کہ خسارے سے بچ جاؤ۔

سابقہ سورت میں ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی تھی جو مال و اسباب جمع کرنے کی حرص و ہوس اور سامانِ تعیش کے حصول میں آخرت سے غافل رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ قبروں میں پہنچ جاتے ہیں۔ اس سورت میں ان لوگوں کی تعریف کی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب ﷺ کے احکامات پر عمل کرتے ہیں اور حق کے داعی و مبلغ بنتے ہیں۔ یہی وہ خوش نصیب ہیں جو دنیا و آخرت میں نقصان سے محفوظ رہیں گے۔

شانِ نزول:

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اسلام قبول کرنے پر کلاہ بن اُسید نے اُن سے کہا، تم تو تجارت میں بہت ہوشیار تھے، تمہارا ہر کاروبار نفع والا ہوتا تھا پھر تم نے خسارے والا کام کیوں کیا کہ اسلام قبول کر کے امیروں کی دوستی کے بدلے چند غریبوں کی محبت اور کئی معبودوں کے بجائے ایک اللہ کی عبادت پسند کی؟ آپ نے فرمایا، مومن ہرگز نقصان میں نہیں رہتا۔ آپ کی تائید میں یہ سورت نازل ہوئی۔ (تفسیر عزیزی)

یہ مختصر سورت انتہائی جامع مضامین پر مشتمل ہے۔ کامیابی اور ناکامی کا فلسفہ اس سورت میں با لکل واضح اور آسان انداز میں بیان کر دیا گیا ہے۔

امام شافعی علیہ الرحمۃ نے بہت خوب ارشاد فرمایا،

اگر لوگ اس سورت میں غور و فکر کر لیں تو انکی فلاح کے لیے یہ سورت ہی کافی ہے۔ صحابہ کرام علیہم الرضوان اس سورت کو اس قدر اہمیت دیتے کہ جب دو صحابی آپس میں ملاقات کرتے تو جدا ہونے سے قبل

ایک صحابی یہ سورت تلاوت کیا کرتے۔(طبرانی،شعب الایمان)

وَالۡعَصۡرِ کا مفہوم:

عصر کا معنی زمانہ ہے۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے، اس سے مراد زمانے کی قسم ہے کیونکہ زمانہ اہلِ تدبر کے لیے نصیحت و عبرت کا ذریعہ ہے۔

عصر درمیانی نماز کا نام بھی ہے۔ آقا و مولیٰ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس کی نمازِ عصر فوت ہو گئی گویا اس کے گھر والے اور مال سب برباد ہو گئے۔ (194)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے عصر سے محبوبِ کبریاء ﷺ کا زمانہ مراد لیا ہے۔ اس بات کی تائید امام رازی رحمہ اللہ کے اس قول سے ہوتی ہے کہ:

"والعصر سے مراد وہ زمانہ ہے جس میں محبوبِ خدا ﷺ جلوہ فرما ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے، اے حبیب! تم ان میں موجود ہو اور انہیں دعوتِ حق دے رہے ہو اور یہ پھر بھی تمہاری دعوت قبول نہیں کر رہے، اس سے بڑھ کر ان کے لیے خسارہ اور ذلت کیا ہو سکتی ہے"۔ (195)

علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، "والعصر سے مراد نبی کریم ﷺ کے زمانۂ نبوت کی قسم ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کی حیات مبارکہ کے زمانے کی قسم ارشاد فرمائی کیونکہ وہ زمانہ تمام زمانوں سے افضل ہے"۔ (196)

شیخ عبد الحق محدث دہلوی قدس سرہٗ نے بھی مدارج النبوت میں یہی بات ارشاد فرمائی ہے۔ امام ثعلبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حضرت ابی بن کعب نے بارگاہِ نبوی میں عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، اس سورت کی کیا تفسیر ہے؟

حضور ﷺ نے فرمایا: **والعصر** سے مراد دن کا آخری حصہ ہے، **ان الانسان لفی خسر** سے مراد ابو جہل ہے، **الا الذین اٰمنوا** سے مراد ہیں ابو بکر، **وعملوا الصلحٰت** سے مراد عمر، **وتواصوا بالحق**

---

194 ...بخاری، کتاب مواقیت الصلوٰۃ، باب اثم من فاتتہ العصر، حدیث: 552

195 ... تفسیر کبیر، عصر، تحت الآیۃ: 1

196 ...روح المعانی، عصر، تحت الآیۃ: 1

سے مراد عثمان اور و تواصوا بالصبر سے مراد علی ہیں۔[197]

شیخ التفسیر مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، عصر زمانے کو کہتے ہیں اور زمانہ چونکہ عجائبات پر مشتمل ہے، اس میں احوال کا تغیر و تبدل ناظر کے لیے عبرت کا سبب ہوتا ہے اور یہ چیزیں خالق و حکیم کی قدرت و حکمت اور اس کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہیں اس لیے ہو سکتا ہے کہ زمانہ کی قسم مراد ہو۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ عصر سے نماز عصر مراد ہو سکتی ہے جو دن کی عبادتوں میں سب سے پچھلی عبادت ہے۔ اور بہترین تفسیر وہی ہے جو امام احمد رضا محدث بریلوی قدس سرہٗ نے اختیار فرمائی کہ زمانہ سے سید عالم ﷺ کا مخصوص زمانہ مراد ہے جو بڑی خیر و برکت کا زمانہ اور تمام زمانوں میں سب سے زیادہ فضیلت و شرف والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے زمانۂ مبارک کی قسم یاد فرمائی جیسا کہ لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ (مجھے اس شہر کی قسم) میں حضور ﷺ کے مسکن و مکان کی قسم یاد فرمائی اور جیسا کہ لَعَمْرُكَ (تمھاری جان کی قسم) میں آپ کی عمر مبارک کی قسم یاد فرمائی، اور وَقِيْلِهٖ (تمہارے قول کی قسم) میں حضور ﷺ کے کلام کی قسم ارشاد فرمائی، اور اس میں شانِ محبوبیت کا اظہار ہے۔[198]

وہ خدا نے ہے مرتبہ تجھ کو دیا، نہ کسی کو ملے نہ کسی کو ملا
کہ کلام مجید نے کھائی شہا، تیرے شہر و کلام و بقا کی قسم

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ:

زمانۂ محبوب ﷺ کی قسم یاد فرمانے کے بعد ارشاد ہوا،

"بیشک آدمی ضرور نقصان میں ہے"۔

اس جملے کی معنویت اچھی طرح سمجھنے کے لیے پہلے انسان کی حقیقت پر غور کیجیے کہ اسے کیوں پیدا کیا گیا؟ انسان کے مقصدِ تخلیق کے بارے میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے

{اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ}

197... تفسیر ثعلبی، عصر، تحت الآیۃ: 1

198... خزائن العرفان، عصر، تحت الآیۃ: 1

"تو کیا یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں بیکار بنایا اور تمہیں ہماری طرف پھرنا نہیں"۔

(پ18، مومنون:115)

یعنی انسان کی تخلیق کا یقینا کوئی نہ کوئی مقصد ہے۔ پھر اس مقصدِ حیات کے بارے میں یوں راہنمائی فرمائی گئی،

{الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا}

"وہ (اللہ ہے) جس نے موت اور زندگی پیدا کی تا کہ تمہاری جانچ (آزمائش) ہو کہ تم میں کس کا کام زیادہ اچھا ہے"۔(پ29، ملک:2)

سورۃ الدھر کی ابتدائی آیات میں فرمایا گیا،

{هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَكُنْ شَیْــٴًـا مَّذْكُوْرًا٥

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِیْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًۢا بَصِیْرًا}(پ29، دھر:1-2)

"بیشک آدمی پر ایک وقت وہ گزرا کہ کہیں اسکا نام بھی نہ تھا، بے شک ہم نے آدمی کو پیدا کیا ملی ہوئی منی سے کہ اسے جانچیں (یعنی آزمائیں) تو اسے سنتا دیکھتا کر دیا"۔

ایک اور جگہ انسان کے مقصد تخلیق کو صاف لفظوں میں یوں بیان فرمایا گیا،

{وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ}(پ27، ذاریات:56)

"اور میں نے جن اور آدمی اتنے ہی لئے (اس لیے ہی) بنائے کہ میری بندگی کریں"۔

ان آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تخلیق فرمایا، اسے علم حاصل کرنے کی صلاحیتیں عطا فرمائیں، الہامی ہدایت کے علاوہ انبیاء کرام علیہم السلام اور آسمانی کتب کے ذریعے ہدایت و گمراہی کے فرق کو واضح فرما دیا پھر انسان کو عقل و فہم کے ساتھ ساتھ ارادہ و عمل کی آزادی بھی عطا فرمائی تا کہ اسے آزمایا جائے کہ یہ اللہ کی بندگی کر کے اس امتحان میں کامیاب ہوتا ہے یا نفس و شیطان کی غلامی کر کے ناکامی و بربادی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ دنیا انسان کے لیے امتحان گاہ ہے اور زندگی وہ مدت ہے جو امتحان کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ انسان کو وہ قوتیں اور صلاحیتیں دی گئی ہیں جن سے علم و شعور

کی روشنی میں راہِ ہدایت پر گامزن رہ کر اس امتحان میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ ہر لمحہ جو گزر رہا ہے وہ امتحان کی مدت کو کم کرتا جارہا ہے۔ اس امتحان کی خاص بات یہ ہے کہ اس کی مدت ہمیں معلوم نہیں۔ پس کسی بھی وقت موت کا فرشتہ آکر روح قبض کرلے گا اور یہ امتحان ختم ہو جائے گا۔

ذرا تصور کیجئے کہ کچھ طلباء وہ ہیں جو ہر لمحہ اپنا امتحانی پرچہ حل کرنے میں مصروف ہیں اور بعض وہ ہیں جو وہاں غیر ضروری کاموں میں مشغول ہیں۔ امتحان کے نگراں کے اس اعلان کے باوجود کہ امتحان کا وقت کسی بھی لمحہ ختم ہو سکتا ہے، وہ مسلسل کھیل کود اور غفلت میں مبتلا ہیں پھر اچانک امتحان ختم ہو جاتا ہے۔ اہل عقل و فہم کے لیے نتیجہ بالکل واضح ہے کہ اس امتحان میں وہی طلباء کامیاب ہونگے جنہوں نے ہر لمحہ اپنا پرچہ حل کرنے میں صرف کیا اور غفلت میں مبتلا نہیں ہوئے۔

سورۃ العصر سے ہمیں یہی درس ملتا ہے کہ زندگی کے اس امتحان میں ناکامی سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ایمان لائیں، نیک کام کریں، ایک دوسرے کو حق بات کی تاکید کریں اور صبر کی وصیت کرتے رہیں۔ اس حقیقت پر زمانہ گواہ ہے کہ جنہوں نے ان اوصاف کو اپنایا وہ کامیاب ہوئے اور باقی سب ناکام و برباد۔

خاص طور پر آقا مولیٰ ﷺ کا زمانہ مبارکہ اس امر کی گواہی دے رہا ہے کہ جن لوگوں نے آپکی دعوتِ حق کو قبول کیا اور ان چاروں اوصاف کو اپنایا، وہ آسمان ہدایت کے درخشاں ستارے قرار پائے اور رب تعالیٰ نے انہیں اپنی رضا اور جنت کی دائمی نعمتوں کی بشارت دی اور جنہوں نے آپکی دعوتِ حق کو جھٹلایا وہ اپنی عزت و شہرت، مال و دولت، اور سرداری ولیڈری کے باوجود اس دنیا میں بھی ذلیل و برباد ہوئے اور آخرت میں بھی انکے لیے بربادی و عذاب ہے۔

سورۃ العصر کی تفسیر میں امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، ایک بزرگ کا قول ہے کہ میں نے سورۃ العصر کا مفہوم ایک برف بیچنے والے سے سمجھا جو یہ آواز لگا رہا تھا، "اس آدمی پر رحم کرو جس کا سرمایہ پگھل رہا ہے، اس آدمی پر رحم کرو جس کا مال پگھل رہا ہے"۔ یہ سن کر میں نے کہا، {اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ} کا یہی مفہوم ہے۔ آدمی کی زندگی برف کے پگھلنے کی طرح تیزی سے کم ہوتی جارہی ہے۔ اب جو شخص اپنی زندگی ضائع کر دے اور اس سے آخرت نہ کمائے وہ ضرور نقصان میں ہے۔

یہ حقیقت ذہن نشین رکھیے کہ برف بیچنے والے کو کامیابی تو مسلسل کوششوں سے حاصل ہو گی لیکن ناکامی کے لیے اسے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ برف پگھل جانے سے نقصان خود بخود اسکا مقدر ہو جائے گا۔ یہی حال انسانی زندگی کا بھی ہے۔ وہ ہر لمحہ پگھلتی جارہی ہے، ہر گزرنے والا دن زندگی سے ایک دن کم کر دیتا ہے مگر انسان کی نادانی دیکھیے کہ یہ زندگی سے ایک سال کم ہونے پر اپنی سالگرہ منا کر خوش ہوتا ہے جبکہ حقیقت میں وہ موت کے مزید قریب ہوتا جاتا ہے۔

پس جس طرح برف بیچنے والے کی کامیابی یہ ہے کہ وہ برف پگھلنے سے پہلے اسے بیچ کر رقم کمالے ،اسی طرح انسان کی کامیابی یہ ہے کہ اپنی عمر کو ختم ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی بندگی اور آقا و مولیٰ ﷺ کی غلامی میں استعمال کر کے انکی رضا حاصل کر لے ورنہ زندگی اسی طرح ختم ہو جائے گی اور انسان ناکام و برباد ہو جائے گا۔

اگر غور کیا جائے تو یہ نکتہ سمجھ میں آتا ہے کہ آدمی کا اصل سرمایہ وقت ہے۔ دنیا میں کچھ کمانے کے لیے بھی وقت چاہیے اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے بھی۔ مزید یہ کہ آپ مال و دولت جمع کر سکتے ہیں اور اگر چاہیں تو آپ کسی سے مال قرض بھی لے سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف وقت وہ دولت ہے جسے نہ تو جمع کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی سے قرض لیا جا سکتا ہے۔ اگر آدمی وقت استعمال کر کے وہ چیزیں کمائے جو موت کے بعد کام نہ آسکیں تو یہ نفع کا سودا نہ ہوا۔ وقت کا اصل مصرف یہ ہے کہ اسے استعمال کر کے فلاحِ دارین حاصل کی جائے۔ ارشادِ ربانی ہے،

{مَا عِنۡدَكُمۡ يَنۡفَدُ وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ بَاقٍ}(پ14، نحل:96)

"جو تمہارے پاس ہے ہو چکے گا (ختم ہو جائے گا) اور جو اللہ کے پاس ہے ہمیشہ رہنے والا ہے"۔

غیب بتانے والے آقا ﷺ کا ارشاد ہے، دو نعمتیں ایسی ہیں جن میں بہت سے لوگ نقصان میں ہیں، وہ ہیں: صحت و فراغت۔ [199]

یعنی صحت اور فارغ وقت وہ نعمتیں ہیں جن کی اکثر لوگ ناشکری کرتے ہیں اور انہیں یا تو بیکار کاموں میں ضائع کرتے ہیں یا بُرے کاموں میں برباد کر دیتے ہیں۔

---

199 ... بخاری، کتاب الرقاق، باب ما جاء فی الرقاق...الخ، حدیث:6412۔

مجد دِ دین وملت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں،

دن لَہو میں کھونا تجھے، شب صبح تک سونا تجھے

شرمِ نبی خوفِ خدا یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں

رسول معظم ﷺ کا فرمانِ عالیشان ہے، پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو۔ بڑھاپے سے پہلے جوانی کو، بیماری سے پہلے تندرستی کو، فقیری سے پہلے امیری کو، مشغولیت سے پہلے فرصت کو اور موت سے پہلے زندگی کو۔ (200)

فلاح ونقصان کا قرآنی تصور:

اس سورت میں انسان کے نقصان یا خسارے میں ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں یہ مفہوم مختلف الفاظ کے ساتھ پچاس سے زائد بار بیان ہوا ہے جبکہ اس کے مقابل قرآن حکیم نے اصطلاح کے طور پر "فلاح" کا ذکر کیا ہے۔

فلاح کسی ادھوری کامیابی یا محض دنیاوی خوشحالی کا نام نہیں، بلکہ اس سے دنیا اور آخرت دونوں میں انسان کی حقیقی کامیابی مراد ہے۔ لغتِ عرب میں دنیا وآخرت کی ساری بھلائیوں اور کامیابیوں پر دلالت کرنے والا فلاح سے زیادہ جامع اور کوئی لفظ نہیں ہے۔ اسی طرح نقصان، گھاٹے یا خُسران کا تعلق بھی صرف دنیاوی ناکامی یا جزوی نقصان سے نہیں بلکہ اس کا مفہوم بھی دنیا وآخرت دونوں میں انسان کی حقیقی ناکامی اور نقصان پر حاوی ہے۔

آپ لوگوں سے پوچھیے کہ نقصان کیا ہے؟ جواب ملے گا، تجارت میں نفع نہ ہونا نقصان ہے۔ کوئی کہے گا، شہرت واقتدار سے محروم رہنا نقصان ہے۔ کوئی بتائے گا، کار اور کوٹھی نہ ملنا نقصان ہے۔ کوئی اعلیٰ منصب نہ ملنے کو نقصان بتائے گا، کوئی امتحان میں ناکامی کو نقصان کہے گا، اور کوئی اپنی کسی خواہش کی تکمیل نہ ہونے کو نقصان قرار دے گا، غرض یہ کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔

وجہ یہ ہے کہ ہر کسی کو اپنی آج کی بہتری کی فکر تو ہے، مگر کل یعنی آخرت کی فکر نہیں۔ آیئے ہم اپنے خالق ومالک عزوجل سے راہنمائی حاصل کریں کہ فلاح اور نقصان کیا ہے نیز گھاٹا، خسارا یا نقصان

200..... مستدرک، کتاب الرقاق، نعمتان مغبون فیہما کثیر من الناس۔۔۔، حدیث:7916۔

پانے والے لوگ کون ہیں؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچی بات کسی کی نہیں ہو سکتی۔ (پ5، نساء:87) وہ فرماتا ہے،

{اَلَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ وَیُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقۡنٰھُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ o وَالَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَآ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَمَآ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ وَبِالۡاٰخِرَۃِ ھُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ o اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنۡ رَّبِّھِمۡ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ}

”وہ جو بے دیکھے ایمان لائیں، اور نماز قائم رکھیں، اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے ہماری راہ میں اٹھائیں (خرچ کریں)۔ اور وہ کہ ایمان لائیں اس پر جو اے محبوب تمہاری طرف اُترا اور جو تم سے پہلے اُترا، اور آخرت پر یقین رکھیں۔ وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی مراد کو پہنچنے والے“۔ (پ1، بقرہ:3-5)

ایسے ہی متعدد آیات میں نقصان پانے والوں کی علامات بیان ہوئیں۔ ہم صرف دو آیات بطور مثال پیش کرتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

{وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِالۡبَاطِلِ وَکَفَرُوۡا بِاللّٰہِ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ}

”اور وہ جو باطل پر یقین لائے اور اللہ کے منکر ہوئے، وہی گھاٹے میں ہیں“۔

(پ20، عنکبوت:52)

جو لوگ دنیا کی رنگینیوں اور مال و دولت کے طلب گار ہوئے اور فکرِ آخرت سے غافل ہو گئے، ان کا انجام بھی نقصان اور بربادی ہے۔ ارشاد ہوا،

{مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا وَزِیۡنَتَھَا نُوَفِّ اِلَیۡھِمۡ اَعۡمَالَھُمۡ فِیۡھَا وَھُمۡ فِیۡھَا لَا یُبۡخَسُوۡنَ o اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ لَیۡسَ لَھُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوۡا فِیۡھَا وَبٰطِلٌ مَّا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ} (پ12، ھود:15-16)

”جو دنیا کی زندگی اور آرائش چاہتا ہو، ہم اس میں انکا پورا پھل دے دیں گے اور اس میں کمی نہ دیں گے۔ یہ ہیں وہ جنکے لیے آخرت میں کچھ نہیں مگر آگ، اور اکارت گیا جو کچھ وہاں کرتے تھے اور نابود ہوئے جو اُنکے عمل تھے“۔

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا:

رسولُ اللہ ﷺ کی بتائی ہوئی تمام باتوں کی دل سے تصدیق کرنے اور ان پر پختہ یقین رکھنے کا نام ایمان ہے۔ یہ یقین اس قدر پختہ ہو کہ کوئی نظریہ، کوئی طاقت یا کوئی مصیبت اسے ہلا نہ سکے۔ سورۃ البقرہ کی ابتدائی آیات مذکور ہو چکیں جن میں ایمان اور اعمالِ صالحہ کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ ایک اور آیت ملاحظہ فرمائیں،

{لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓىٕكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ}

’’کچھ اصل نیکی یہ نہیں کہ منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرو ہاں اصل نیکی یہ ہے کہ ایمان لائے اللہ اور قیامت اور فرشتوں اور کتاب اور پیغمبروں پر‘‘۔(پ2،بقرہ:177)

اس کی تفسیر میں صدرُ الافاضل رحمہ اللہ فرماتے ہیں، ایمان کی تفصیل یہ ہے کہ:-

اول: اللہ پر ایمان لائے کہ وہ حی و قیوم، علیم، حکیم، سمیع، بصیر، غنی، قدیر، ازلی ابدی واحد لا شریک لہٗ ہے (یعنی زندہ اور ہمیشہ قائم رہنے والا، سب کچھ جاننے والا، حکمت والا، سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا، بے نیاز اور قدرت والا، جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، وہ اپنی ذات میں اکیلا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں)۔

دوم: قیامت پر ایمان لائے کہ وہ حق ہے، اس میں بندوں کا حساب ہو گا۔ اعمال کی جزا دی جائے گی، انبیاء کرام اور مقبولان حق شفاعت کریں گے، سید عالم ﷺ سعادت مندوں کو حوض کوثر پر سیراب فرمائیں گے، پل صراط پر گزر ہو گا اور اُس روز کے تمام احوال جو قرآن میں آئے یا سید الانبیا ﷺ نے بیان فرمائے، سب حق ہیں۔

سوم: فرشتوں پر ایمان لائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور فرمانبردار بندے ہیں۔ وہ مرد ہیں نہ عورت۔ ان کی تعداد اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ چار فرشتے ان میں سے بہت مقرب ہیں جبرئیل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل علیہم السلام۔

چہارم: کتب الٰہیہ پر ایمان لانا کہ جو کتاب اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی، حق ہے۔ ان میں چار بڑی کتابیں ہیں، توریت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر، انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر، زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر، اور

قرآن حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوا، اور پچاس صحیفے حضرت شیث پر، تین حضرت ادریس پر، دس حضرت آدم پر اور دس حضرت ابراہیم علیہم السلام پر نازل ہوئے۔

پنجم: تمام انبیاء کرام پر ایمان لانا کہ وہ سب اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ہیں اور معصوم یعنی گناہوں سے پاک ہیں۔ ان کی صحیح تعداد اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ ان میں سے تین سو تیرہ رسول ہیں، انبیاء کرام مرد ہوتے ہیں، کوئی عورت کبھی نبی نہیں ہوئی۔ (201)

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

{یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ}

"اے ایمان والو! ایمان رکھو اللہ اور اس کے رسول پر"۔ (پ5،نساء:136)

اس آیت کی تفسیر میں صدرُ الافاضل فرماتے ہیں، اگر یہ خطاب مسلمانوں سے ہو تو اسکے معنی ہیں، ایمان پر ثابت قدم رہو۔ اگر یہ خطاب اہل کتاب سے ہو تو معنی یہ ہیں، اے بعض رسولوں پر ایمان لانے والو! اللہ اور اسکے رسول ﷺ پر ایمان لے آؤ۔ اور اگر خطاب منافقین سے ہو تو معنی یہ ہیں کہ اے ایمان کا ظاہری دعویٰ کرنے والو! اخلاص کے ساتھ ایمان لے آئو۔ (202)

آقائے دوجہاں ﷺ پر ایمان لانے کا بنیادی اور اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ ان سے سچی محبت کی جائے اور محبت کی علامت اطاعت ہے۔ نور مجسم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے،

"تم میں سے کوئی بھی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اسے اسکے والد، اسکی اولاد اور سب لوگوں سے زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں"۔ (203)

اس محبت کی دس شرائط و علامات ہیں جنہیں اس فقیر نے اپنی کتاب "جمالِ مصطفی ﷺ" میں تفصیل سے بیان کیا ہے، اہلِ ذوق حضرات ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

ایمان کے تقاضے:

قرآن حکیم نے ہر مومن کے لیے ایمان کو جانچنے کا ایک آسان طریقہ بیان فرمایا ہے وہ یہ کہ

201... خزائن العرفان، بقرہ، تحت الایۃ:177

202... خزائن العرفان، نساء، تحت الایۃ:136

203... بخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول من الایمان، حدیث:14

جس کا آخرت پر اور آخرت میں رب تعالیٰ سے ملنے پر پختہ ایمان ہے اس کے لیے نمازوں کی پابندی کرنا ہرگز مشکل اور دشوار نہیں ہوتا۔ ارشاد ہوا،

{ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ o اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ }(پ1،بقرہ:45-46، کنزالایمان)

"اور بے شک نماز ضرور بھاری ہے مگر اُن پر نہیں جو دل سے میری طرف جھکتے ہیں جنہیں یقین ہے کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور اس کی طرف پھرنا (ہے)"۔

اب آپ خود فیصلہ کیجیے کہ ہمارا اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان کس درجہ میں ہے؟ نمازوں کی پابندی کرنا ہمارے لیے دشوار ہوتا ہے یا آسان؟ خاص طور پر فجر اور عشاء کی نمازیں جن کے متعلق آقائے دوجہاں ﷺ کا فرمان ہے، "منافقوں پر فجر اور عشاء سے زیادہ کوئی نماز بھاری نہیں۔ اگر جانتے کہ ان نمازوں میں کیا ثواب ہے تو زمین پر گھسٹتے ہوئے بھی نماز کیلئے آتے"۔[204]

ہماری شامتِ اعمال سے ہمارے معاشرے میں منافقانہ طرزِ عمل عام ہو گیا ہے جو کہ ایمان کی کمزوری کی واضح علامت ہے۔ آپ دیکھ لیجیے اس دور میں مسلمان مردار، خنزیز اور ناپاک چیزیں نہیں کھاتے مگر رشوت، سود اور دیگر حرام کام نہیں چھوڑتے۔ اسی طرح عید کی نماز میں اسقدر اہتمام اور جوش و خروش دیکھنے میں آتا ہے کہ نمازیوں کو مساجد میں جگہ نہیں ملتی، سڑکیں اور میدان بھی بھر جاتے ہیں لیکن یہ سارے نمازی عید ہی کے دن کسی دوسری نماز میں یا عام دنوں میں کسی نماز میں کیوں نظر نہیں آتے؟ حالانکہ عید کی نماز واجب ہے جبکہ پانچوں وقت کی نمازیں فرضِ عین ہیں۔

ہونا تو یہ چاہیے کہ فرائض کے لیے واجب سے زیادہ اہتمام کیا جائے لیکن معاملہ اس کے برعکس ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ ایمان کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اور اسکے حبیب ﷺ کی اطاعت کا جذبہ بھی کمزور ہو گیا ہے۔ پس حرام خوروں کے خنزیر، مردار غلاظت اور نجس چیزیں نہ کھانے کا سبب اطاعتِ الٰہی نہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ طبعاً یہ چیزیں انہیں پسند نہیں۔ اسی طرح عید کی نماز کے لیے یہ سارا اہتمام بھی اطاعتِ الٰہی کے بجائے ایک تہوار منانا یا ایک رسم کو پورا کرنا ہی قرار پائے گا۔

204...بخاری، کتاب الاذان، حدیث:657۔

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ:

محبتِ رسول ﷺ کی بنیادی علامت ہے، اطاعتِ رسول ﷺ، اور یہی اعمالِ صالحہ کی اصل روح ہے۔ جس طرح ایمان کا وہی دعویٰ معتبر سمجھا جاتا ہے جس کا ثبوت انسان نیک اعمال سے پیش کرے اسی طرح وہی اعمال صالح ہوتے ہیں جن کی بنیاد ایمان پر رکھی جاتی ہے یعنی بغیر ایمان کے اچھے کام انسان کو نقصان سے نہیں بچاسکتے۔

ارشادباری تعالیٰ ہوا،{اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ}

"یہ نبی مسلمانوں کا انکی جان سے زیادہ مالک ہے"۔(پ21،احزاب:6)

صدرُ الافاضل مولانا سید نعیم الدین رحمہ اللہ اسکی تفسیر میں فرماتے ہیں، دنیا اور دین کے تمام امور میں نبی کریم ﷺ کا حکم مسلمانوں پر نافذ، انکی اطاعت واجب اور انکے حکم کے مقابل نفس کی خواہش واجب الترک ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ نبی ﷺ مومنوں پر انکی جانوں سے زیادہ رأفت ورحمت اور لطف وکرم فرماتے ہیں اور نافع تر ہیں۔ بخاری ومسلم کی حدیث ہے، سید عالم ﷺ نے فرمایا، "میں ہر مومن کے لیے دنیاو آخرت میں سب سے زیادہ اولیٰ ہوں، اگر چاہو تو یہ آیت پڑھ لو۔[205]

فرمانِ الٰہی ہے،{وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا}

"اور جو کچھ تمہیں رسول عطافرمائیں وہ لو اور جس سے منع فرمائیں، باز رہو"۔(پ28،حشر:7)

اللہ تعالیٰ اور رسول معظم ﷺ پر ایمان لانے کا تقاضا یہی ہے کہ نیک اعمال کیے جائیں اور شریعت کے احکام پر مکمل طور پر عمل کیا جائے۔ ارشادِ باری ہے،

{یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ o فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَیِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ o هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیَهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓىٕكَةُ وَقُضِیَ الْاَمْرُ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ}

"اے ایمان والو! اسلام میں پورے داخل ہو اور شیطان کے قدموں پہ نہ چلو، بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اور اگر اسکے بعد بھی بچلو (پھسلو) کہ تمھارے پاس روشن حکم آچکے تو جان لو کہ اللہ زبر

205...خزائن العرفان، احزاب، تحت الآیۃ:6

دست حکمت والا ہے۔ کاہے کے انتظار میں ہیں (شیطان کی فرمانبرداری کرنے والے) مگر یہی کہ اللہ کا عذاب آئے چھائے ہوئے بادلوں میں اور (عذاب والے) فرشتے اتریں اور کام ہو چکے؟ اور سب کاموں کی رجوع اللہ کی طرف ہے"۔(پ2،بقرہ:208-210)

شانِ نزول یہ ہے کہ اہلِ کتاب میں سے حضرت عبد اللہ بن سلام اور انکے اصحاب ایمان لانے کے بعد شریعت موسوی کے بعض احکام پر قائم رہے۔ ہفتہ کی تعظیم کرتے، اونٹ کے دودھ اور گوشت سے پرہیز کرتے، یہ سوچ کر کہ یہ اسلام میں مباح ہیں، ان کا انکار ضروری نہیں اور توریت میں ان سے بچنا لازم ہے اس لیے توریت پر بھی عمل ہو جائے گا اور یہ اسلام کی مخالفت بھی نہیں۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ توریت کی موافقت میں چند مباح چیزوں کو چھوڑنے پر جب اللہ تعالیٰ نے یہ تنبیہ فرمائی تو اُن لوگوں کا کیا حال ہوگا جو نہ صرف اسلام کے فرائض و واجبات ترک کرتے ہیں بلکہ حرام کاموں کو اپنانے کے ساتھ ساتھ یہود و نصاریٰ اور ہنود کی مشابہت و پیروی کرنے پر اعلانیہ فخر بھی کرتے ہیں۔ نعوذُ باللہ

رحمت عالم ﷺ نے فرمایا، منکر کے سوا میری ساری امت جنت میں جائے گی۔ صحابہ کرام نے عرض کی، منکر کون ہے؟ فرمایا، جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں جائے گا اور جس نے میری نافرمانی کی وہ منکر ہے۔(بخاری)

ایمان، اعمالِ صالحہ اور حضور ﷺ کی اطاعت لازم و ملزوم ہیں۔ ارشاد ہوا:

{فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا}

"تو اے محبوب! تمہارے رب کی قسم وہ مسلمان نہ ہونگے جب تک اپنے آپس کے جھگڑے میں تمہیں حاکم نہ بنائیں، پھر جو کچھ تم حکم فرما دو، اپنے دلوں میں اس سے رکاوٹ نہ پائیں اور جی سے مان لیں"۔(پ5،نساء:65)

پس ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کی غلامی کریں اور ان کے احکامات پر عمل پیرا ہونے میں اپنے دلوں میں کسی قسم کی تنگی محسوس نہ کریں۔

وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ:

اس سورت میں نقصان سے بچنے والوں کی تیسری صفت یہ بیان فرمائی گئی کہ وہ ایک دوسرے کو حق بات کی وصیت کرتے ہیں۔ وصیت کا مفہوم ہے، کسی کو خیر خواہی کے جذبے سے کسی کام کیلئے راغب کرنا یا مسلسل کسی کام کی تاکید کرتے رہنا۔

گویا نقصان سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی ایمان لائے اور نیک اعمال کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی ایمان اور اعمال صالحہ کی تبلیغ و تاکید کرتا رہے، اسے دینی اصطلاح میں "امر با لمعروف و نہی عن المنکر" بھی کہتے ہیں، جس کا مطلب ہے، نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

{كُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَتَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَتُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ}(پ4،ال عمران:110)

"تم بہتر ہو اُن سب امتوں میں جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں، بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو"۔

آقا و مولیٰ ﷺ کا فرمانِ عالی شان ہے، "تم میں سے جو برائی ہوتی دیکھے اسے چاہیے کہ اسے ہاتھ کی طاقت سے روکے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے روکے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو دل سے برا جانے اور یہ ایمان کا نہایت کمزور درجہ ہے"۔ دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ "اگر دل سے برا نہ جانے تو رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان نہ ہوگا"۔[206]

اب اس حدیث پاک کی روشنی میں اپنے ایمان کا جائزہ لیجئے کہ کیا ہم کسی برائی کو ہاتھ سے یا زبان سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں؟ بالفرض اگر مذکورہ دونوں درجے ہمیں حاصل نہیں تو کیا ایمان کا نہایت کمزور درجہ ہمیں حاصل ہے یا ہم اس سے بھی محروم ہیں؟ العیاذ باللہ تعالیٰ۔

جانِ کائنات حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: اُس ذاتِ اقدس کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! تم نیکی کا حکم دیتے رہو اور برائی سے روکتے رہو، ورنہ اللہ تعالیٰ عنقریب تم پر اپنا عذاب نازل

206... مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون النھی عن المنکر الخ، حدیث:49۔

کرے گا پھر تم اس سے دعا کرو گے لیکن تمہاری دعا قبول نہ ہو گی۔ (ترمذی)

آقا و مولیٰ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ خاص لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے عام لوگوں کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتا جب تک کہ ان کے ماحول میں گناہ رواج نہ پا جائیں اور عام لوگ قدرت کے باوجود گناہ نہ روکیں۔ جب ایسا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ سب لوگوں کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔[207]

سید عالم ﷺ نے فرمایا، لوگوں کے گناہوں کی کثرت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جبریل کو حکم دیا، فلاں شہر کو اسکے باشندوں سمیت الٹ کر تباہ کر دو۔ عرض کی، الٰہی! ان لوگوں میں ایک ایسا بندہ بھی ہے جو لمحہ بھر کے لیے بھی تیری یاد سے غافل نہیں ہوا اور نہ ہی کبھی اس نے نافرمانی کی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا، پہلے عذاب اُسی پر نازل کرو پھر دوسروں کو عذاب میں مبتلا کرو کیونکہ اس کے سامنے لوگ میری نافرمانیاں کرتے رہے لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار ظاہر نہ ہوئے (لہٰذا امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے غفلت کی وجہ سے یہ بھی مستحقِ عذاب ہے)۔ (مشکوٰۃ)

ان احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا بقدرِ استطاعت ہر مسلمان پر فرض ہے اور اسے ترک کرنا عذابِ الٰہی کا باعث ہے۔

وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ:

نقصان سے محفوظ رہنے والے خوش نصیبوں کی چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کرتے ہیں۔ یعنی وہ ایمان لا کر تقویٰ کو اپنی زندگی کا شعار بناتے ہیں اور حق کی دعوت و تبلیغ کا فریضہ سر انجام دیتے ہیں پھر جب اس راہ میں دنیا پرستوں کی طرف سے مصائب و تکالیف کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو نہ صرف یہ کہ وہ خود صبر کا پیکر بن جاتے ہیں بلکہ وہ دوسرے ایمان والوں کو بھی صبر کی وصیت کرتے رہتے ہیں اور ان کے پائے استقامت میں کبھی لغزش نہیں آتی۔

راہِ حق میں مصائب و مشکلات کا پیش آنا اور طرح طرح کی آزمائشوں میں مبتلا ہونا ایک فطری عمل ہے کیونکہ جب حق کا کلمہ بلند کیا جاتا ہے تو باطل کو ضرور تکلیف ہوتی ہے اس لیے جب بھی نیکی کی دعوت دی جائے گی، شیطانی قوتیں فوراً مخالفت پر کمربستہ ہو جائیں گی۔ ارشاد ہوا:

207 ... مشکاۃ المصابیح، کتاب الآداب، باب الامر بالمعروف، حدیث:5144

{اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْۤا اَنْ یَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ}

”کیا لوگ اس گھمنڈ میں ہیں کہ اتنی سی بات پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ کہیں ہم ایمان لائے اور ان کی آزمائش نہ ہو گی؟“۔(پ20، عنکبوت:2، کنزالایمان)

اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو ضرور آزماتا ہے کیونکہ آزمائش کے مراحل سے گزر کر ہی ایمان میں مضبوطی پیدا ہوتی ہے اور ان کے ایمانی دعوے کی تصدیق بھی ہو جاتی ہے۔ راہِ حق میں کڑوی باتوں اور ذلت آمیز طعنوں سے بھی آزمائش ہوتی ہے۔ ارشاد ہوا،

{لَتُبْلَوُنَّ فِیْۤ اَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ وَ لَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْۤا اَذًى كَثِیْرًا وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ}

”بے شک ضرور تمہاری آزمائش ہو گی تمہارے مال اور تمہاری جانوں میں، اور بیشک ضرور تم اگلے کتاب والوں اور مشرکوں سے بہت کچھ برا سنو گے۔ اگر صبر کرو اور بچتے رہو تو یہ بڑی ہمت کا کام ہے“۔(پ4،ال عمران:186)

آج آپ دیکھ لیجیے کہ راہِ حق پر چلنے والوں کو مولوی اور ملا کہا جاتا ہے، کبھی بنیاد پرست اور بیک ورڈ قرار دیا جاتا ہے اور کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض اہلِ باطل، دین کی آڑ میں اہلِ حق کو مشرک اور بدعتی کہہ کر ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ قرآنِ عظیم بتاتا ہے کہ یہ آزمائشیں نئی نہیں ہیں، انبیاءِ کرام کو بھی راہِ حق میں بے شمار اذیتیں دی گئیں۔ حدیث شریف میں ہے، آدمی کی آزمائش اسکے دین کے لحاظ سے ہوتی ہے، جو شخص اپنے دین میں مضبوط ہوتا ہے اسکی آزمائش سخت ہوتی ہے۔(208)

دراصل جب بندے کا ایمان پختہ ہو جاتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کو اپنا مقصود بنالیتا ہے، اپنے روز و شب اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع کر دیتا ہے اور سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب ﷺ سے محبت کرتا ہے۔ پھر وہ دوسروں کے دلوں میں بھی اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی محبت کی شمع روشن کرتا ہے اور مصائب کی پرواہ کیے بغیر اس راہِ حق پر خود بھی قائم رہتا ہے اور دوسروں کو بھی استقامت کی تاکید کرتا ہے۔

208... سنن ابی ماجہ، کتاب الفتن، حدیث:4023۔

فلاح والی تجارت:

فلاح وکامیابی قرآنی اصطلاح میں خسارے یا نقصان کی ضد ہے۔چونکہ اکثر لوگ تجارت میں نفع نقصان سے بخوبی آگاہ ہیں اور ہر کوئی نفع والی تجارت کرنا چاہتا ہے۔نیز کوئی عقلمند ایسا نہ ہوگا جو اپنے کاروبار میں نقصان یا خسارے کو پسند کرتا ہو،اس لیے فوزِ عظیم یعنی بڑی کامیابی کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایمان اور اعمالِ صالحہ کی نفع والی تجارت کا ذکر فرمایا ہے۔ارشاد ہوا:

{یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿﴾ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿﴾ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَیُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ}(پ28،صف:10-12)

”اے ایمان والو!کیا میں بتادوں وہ تجارت جو تمہیں دردناک عذاب سے بچالے،(وہ تجارت یہ ہے کہ تم)ایمان رکھو اللہ اور اس کے رسول پر،اور اللہ کی راہ میں اپنے مال وجان سے جہاد کرو،یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔

(اس تجارت کا نفع یہ ہوگا کہ)وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں باغوں میں لے جائے گا جن کے نیچے نہریں رواں(ہیں)اور پاکیزہ محلوں میں جو بسنے کے باغوں میں ہیں۔یہی بڑی کامیابی ہے“۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے،ہر شخص صبح اٹھ کر اپنی زندگی کا سرمایہ(وقت)تجارت پر لگاتا ہے پھر کوئی اسے نقصان سے بچالیتا ہے اور کوئی برباد کرڈالتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اُن لوگوں کی تجارت کا بھی ذکر فرمایا ہے جو آخرت کو چھوڑ کر صرف دنیا ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور نقصان اٹھاتے ہیں۔ارشاد ہوا:

{اُولٰٓىٕكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ}

”یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی تو اُن کا سودا کچھ نفع نہ لایا اور وہ سودے کی راہ جانتے ہی نہ تھے“۔(پ1،بقرہ:16)

جو شخص مضامینِ قرآن میں گہری نظر رکھتا ہو، اس کے لیے یہ سمجھنا ہرگز دشوار نہیں کہ سورۃ العصر میں مذکور چار صفات دراصل فلاح پانے والوں کی ان تمام صفات کا خلاصہ ہیں جو قرآن حکیم میں جابجا بیان ہوئی ہیں۔ رب کریم ہمیں ان صفات کو کامل طور پر اپنانے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ ایک صالح معاشرہ وجود میں آئے۔

[اہلِ ذوق حضرات فقیر کی کتاب ''فلاحِ دارین'' جو سورۃ العصر کی مفصل تفسیر ہے، ملاحظہ فرمائیں]

تفسیر سورۃ الھمزۃ

سورۃ الھمزۃ مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں نو آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَیۡلٌ لِّکُلِّ ہُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِۣ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَہٗ ۙ﴿۲﴾ یَحۡسَبُ اَنَّ مَالَہٗۤ اَخۡلَدَہٗ ۚ﴿۳﴾ کَلَّا لَیُنۡۢبَذَنَّ فِی الۡحُطَمَۃِ ۫﴿۴﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا الۡحُطَمَۃُ ؕ﴿۵﴾ نَارُ اللّٰہِ الۡمُوۡقَدَۃُ ۙ﴿۶﴾ الَّتِیۡ تَطَّلِعُ عَلَی الۡاَفۡـِٕدَۃِ ؕ﴿۷﴾ اِنَّہَا عَلَیۡہِمۡ مُّؤۡصَدَۃٌ ۙ﴿۸﴾ فِیۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَۃٍ ٪﴿۹﴾

”اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا (ہے)“

”خرابی ہے اُس کے لیے جو لوگوں کے منہ پر عیب کرے، پیٹھ پیچھے بدی کرے۔ جس نے مال جوڑا اور گِن گِن کر رکھا۔ کیا یہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اُسے دنیا میں ہمیشہ رکھے گا؟ ہرگز نہیں۔ ضرور وہ روندنے والی میں پھینکا جائے گا۔ اور تو نے کیا جانا، کیا ہے روندنے والی؟ اللہ کی آگ کہ بھڑک رہی ہے۔ وہ جو دلوں پر چڑھ جائے گی، بیشک وہ اُن پر بند کر دی جائے گی لمبے لمبے ستونوں میں“۔

(کنز الایمان از اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ)

لفظی ترجمہ:

وَیۡل	لِ	کُلِّ	ہُمَزَۃٍ	لُمَزَۃِ
خرابی (ہے)	کے لیے	ہر	عیب کرنے والے	غیبت کرنے والے

الَّذِی	جَمَعَ	مَالًا	وَّ	عَدَّدَ	ہٗ
(وہ) جس	(نے) جمع کیا	مال	اور	گِن گِن کر رکھا	اُسے

یَحۡسَبُ	اَنَّ	مَالَ	ہٗ	اَخۡلَدَ	ہٗ
سمجھتا ہے وہ	بیشک	مال	اُس (کا)	ہمیشہ رکھے گا	اُسے

کَلَّا	لَ	یُنۡۢبَذَنَّ	فِی	الۡحُطَمَۃِ
ہرگز نہیں	البتہ	ضرور پھینکا جائے گا وہ	میں	روندنے والی

وَ	مَآ	اَدۡرٰی	کَ	مَا	الۡحُطَمَۃُ
اور	کیا	جانا	تُونے	کیا (ہے)	روندنے والی

نَارُ	اللّٰہِ	الۡمُوۡقَدَۃُ
آگ	اللہ (کی)	بھڑکائی ہوئی

الَّتِیۡ	تَطَّلِعُ	عَلَی	الۡاَفۡـِٕدَۃِ
(وہ) جو	چڑھ جائے گی	پر	اُن دلوں

اِنَّ	ھَا	عَلَیۡ	ھِمۡ	مُّؤۡصَدَۃٌ
بیشک	وہ	پر	ان	بند کی ہوئی ہوگی

فِیۡ	عَمَدٍ	مُّمَدَّدَۃٍ
میں	ستونوں	لمبے لمبے

ربط و مناسبت:

سورۃ العصر میں بیان ہوا کہ ہر انسان نقصان اور خسارے میں ہے سوائے اُن کے جن میں مذکورہ چار اوصاف ہوں۔ جبکہ اس سورت میں شدید نقصان والوں کے چار عیب بیان کیے گئے ہیں، عیب جوئی، غیبت، مال کی حرص اور طویل امیدیں۔

سورۃ العصر میں مذکور تھا کہ مصطفی کریم ﷺ کا زمانہ گواہ ہے کہ مذکورہ چار اوصاف نہ اپنانے والے نقصان میں ہیں اور ایسا ہی ہوا۔ اس سورت میں بتایا گیا ہے کہ جو کافر یہ سمجھتے تھے کہ انکا مال انہیں ہمیشہ رکھے گا، رسول معظم ﷺ ہی کا زمانہ گواہ ہے کہ وہ لوگ مر کر ناکام ونامراد اور جہنمی

ہو گئے۔

سابقہ سورت میں چار اوصاف نہ اپنانے والے ہر انسان کے لیے خسارے اور نقصان کا ذکر تھا جبکہ اس سورت میں خسارہ پانے والے ایک شخص کا بطور مثال تذکرہ ہے گویا یہ سورت، سورۃ العصر کے مضمون کی تشریح ہے۔

شانِ نزول:

بعض مفسرین کے نزدیک یہ سورت ان کفارِ مکہ کی مذمت میں نازل ہوئی جو رسولِ محتشم ﷺ کو طعنے دیتے، آپ کی عیب جوئی کرتے اور دیگر مسلمانوں کی عیب جوئی اور غیبت کرنا ان کا معمول تھا۔ ان کافروں میں ولید بن مغیرہ، اخنس بن شریق اور امیہ بن خلف شامل ہیں۔ دیگر مفسرین کہتے ہیں کہ اس سورت میں بیان کردہ وعید ہر اُس شخص کے لیے ہے جو عیب جوئی اور طعنہ زنی کرے۔

وَيۡلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ:

"وَیۡل" کے معنی خرابی اور ہلاکت کے ہیں۔ "هُمَزَة" کا معنی ہے، "کسی شخص کو اس کے سامنے برا کہنے والا، بہت زیادہ طعنے دینے والا"۔ اور "لُمَزَة" کا معنی ہے، "بہت زیادہ عیب جوئی کرنے والا، کسی کی غیر موجودگی میں اس کی برائی کرنے والا"۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے، "یہ دونوں الفاظ ہم معنی ہیں۔ ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو چغلیاں کرتے ہیں، دوستوں میں جدائی ڈالتے ہیں اور بے عیب لوگوں کی عیب جوئی کرتے ہیں"۔

حضرت مقاتل رحمہ اللہ کا قول ہے، "هُمَزَة" کے معنی سامنے برائی کرنے والا اور "لُمَزَة" کے معنی پیٹھ پیچھے برائی کرنے والا ہے۔

اگرچہ اور بھی کئی اقوال ہیں لیکن اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی رحمہ اللہ اور اکثر مترجمین نے مذکورہ بالا اقوال ہی کو ترجمہ میں اختیار کیا ہے۔

طعنہ زنی اور غیبت وعیب جوئی کی مذمت میں رب تعالیٰ کا ارشاد ہے،

{يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا يَسۡخَرۡ قَوۡمٌ مِّنۡ قَوۡمٍ عَسٰٓى اَنۡ يَّكُوۡنُوۡا خَيۡرًا مِّنۡهُمۡ وَلَا نِسَآءٌ مِّنۡ

نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ o يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ}

"اے ایمان والو! نہ مرد مردوں سے ہنسیں (یعنی مذاق نہ اُڑائیں) عجب نہیں کہ وہ ان ہنسنے والوں سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں عورتوں سے، دور نہیں کہ وہ ان ہنسنے والیوں سے بہتر ہوں، اور آپس میں طعنہ نہ کرو، اور ایک دوسرے کے بُرے نام نہ رکھو، کیا ہی برا نام ہے مسلمان ہو کر فاسق کہلانا، اور جو توبہ نہ کریں تو وہی ظالم ہیں۔

اے ایمان والو! بہت گمانوں سے بچو، بیشک کوئی گمان گناہ ہو جاتا ہے، اور عیب نہ ڈھونڈو، اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو، کیا تم میں سے کوئی پسند رکھے گا کہ اپنے مَرے بھائی کا گوشت کھائے؟ تو یہ تمہیں گوارا نہ ہو گا، اور اللہ سے ڈرو، بیشک اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے"۔(پ26، حجرات:11-12)

طعنہ زنی ہر صورت میں گناہ ہے خواہ زبان سے ہو یا ہاتھ یا آنکھ کے اشارے سے۔ کسی کے سامنے طعنہ زنی اور عیب جوئی کرنے میں اس کی تذلیل بھی ہے اور دل آزاری بھی۔ آقا و مولیٰ ﷺ کا ارشاد ہے، اللہ تعالیٰ کے بندوں میں بدترین لوگ وہ ہیں جو چغل خوری کرتے ہیں، دوستوں کے درمیان جدائی اور فساد ڈالتے ہیں اور بے عیب لوگوں میں عیب ڈھونڈتے ہیں۔[209]

غیبت کو حدیث شریف میں زنا سے بدتر قرار دیا گیا ہے۔ نورِ مجسم رحمتِ عالم ﷺ نے فرمایا: غیبت یہ ہے کہ تم اپنے مسلمان بھائی کی غیر موجودگی میں اس کے متعلق وہ بات کہو جو اسے بُری لگے۔ کسی نے عرض کی، اگر وہ برائی اس میں موجود ہو تو کیا اس کو بھی غیبت کہا جائے گا؟ فرمایا، ہاں! جبھی تو وہ غیبت ہے اور اگر تم ایسی بات کہو جو اس میں موجود نہ ہو تو یہ بہتان ہے (جو اور بڑا گناہ ہے)۔[210]

209... سنن ابی ماجہ، کتاب الفتن، باب الصبر علی البلاء حدیث:4023۔

210 ... ترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ماجاء فی الغیبۃ، حدیث:1941

غیبت، عیب جوئی اور طعنہ زنی اسلامی معاشرے میں بگاڑ کا بڑا سبب ہیں۔ اسی لیے رسولِ معظم ﷺ نے ایمان والوں کو ان کبیرہ گناہوں سے بچنے کی بارہا تاکید فرمائی۔ آپ کا فرمانِ عالیشان ہے،

"بدگمانی سے بچو، بدگمانی بدترین جھوٹ ہے۔ نہ کسی کی کمزوریاں ڈھونڈو اور نہ لوگوں کی عیب جوئی کرو۔ نہ ایک دوسرے سے حسد کرو اور نہ آپس میں بغض رکھو اور نہ ہی ایک دوسرے سے لاتعلق رہو۔ اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ"۔

ایک اور موقع پر فرمایا، مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ ہی اسے حقیر سمجھتا ہے۔ پھر آقا و مولیٰ ﷺ نے تین بار اپنے سینے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا، تقویٰ یہاں ہے۔ پھر فرمایا، انسان کے لیے یہ برائی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے۔ ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی ہر چیز حرام ہے، اس کا خون، اس کا مال اور اس کی عزت۔[211]

الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ:

ارشاد ہوا: "جس نے مال جوڑا اور گِن گِن کر رکھا"۔ اس آیت میں کافروں کی تیسری بری خصلت کا ذکر ہے کہ وہ مال جمع کرنے کی حرص میں مبتلا تھے۔

اسلامی معاشرے کے اہم اوصاف میں باہم محبت و اخلاص سے پیش آنا اور ضرورت میں ایک دوسرے کی مدد کرنا خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے برخلاف غیبت و عیب جوئی اور حرص و بخل معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیتے ہیں۔

ان آیات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کافروں میں موجود مذکورہ برائیوں کا سبب دراصل یہی تھا کہ وہ مالدار تھے اسی لیے وہ دولت کے نشے میں خود کو برتر اور دوسروں کو حقیر سمجھتے اور ان پر زبانِ طعن دراز کرتے تھے۔ مال و دولت کا نشہ انسان کو متکبر بنا دیتا ہے۔ خود کو بڑا سمجھنا اور دوسروں کو حقیر خیال کرنا تکبر ہی کا حصہ ہے۔

آپ دیکھ لیجیے، کبھی کسی مفلس نے خدائی کا دعویٰ نہیں کیا۔ نمرود و شداد ہوں یا فرعون و قارون، ابوجہل و ابولہب ہوں یا ولید بن مغیرہ و امیہ بن خلف، سب امیر و کبیر یا حاکم و رئیس تھے۔

---

211 ... مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب تحریم ظلم المسلم وخذلہ۔۔۔الخ، حدیث:2564۔

اس لیے مال و دولت اور طاقت و اقتدار کے نشے میں حق کا انکار کرتے رہے اور ان کا تکبر انہیں لے ڈوبا۔ کسی کے مال نے اسے زندگی نہیں دی اور نہ ہی کسی کا مال اس کے ساتھ قبر میں گیا، پھر ایسی فانی و ناپائیدار چیز پر تکبر کیسا؟

جَمَعَ مَالاً سے ایسے مال پرست لوگوں کی یہ ذہنیت واضح ہوتی ہے کہ وہ مالدار ہونے کے باوجود بہت کنجوس ہوتے ہیں۔ مال گن گن کر رکھتے ہیں مگر اسے غریب لوگوں کی بھلائی کے لیے خرچ کرنے کی ہمت نہیں کرتے۔ گن گن کر رکھنے کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ وہ صبح و شام مال جمع کرنے کی فکر میں رہتے ہیں اور ہر جائز و ناجائز طریقے سے مال جمع کرتے ہیں۔

مال سے مراد صرف روپیہ پیسہ نہیں ہوتا بلکہ مال سے مراد دنیا کا سارا مال و اسباب ہے۔ یہ بات سورۃ العادیات اور سورۃ التکاثر کی تشریح میں بیان ہو چکی کہ مال بذاتِ خود کوئی بُری چیز نہیں ہے۔ اس لیے مال کا جائز طریقوں سے کمانا اور مال کو جمع کرنا کوئی مذموم بات نہیں ہے بشرطیکہ قرآن و سنت میں مذکور مال کے حقوق ادا کیے جائیں اور اس سے ایک دوسرے پر برتری جتانا مقصود نہ ہو۔ نیز مال کے حصول میں منہمک ہو کر بندہ اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب کی فرمانبرداری سے غافل نہ ہو جائے۔

خسارا اور نقصان یہ ہے کہ مال و اسباب جمع کرنے کو ہی زندگی کا مقصود اور مطلوب بنالیا جائے اور مال کی محبت میں برف کی طرح پگھلتی ہوئی زندگی کو ضائع کر دیا جائے۔ ایسے شخص کو حدیث شریف میں "مال کا بندہ" قرار دیا گیا ہے۔

آقا و مولیٰ ﷺ نے فرمایا: "دینار و درہم (یعنی مال و دولت) کے بندے ہلاک ہو جائیں کیونکہ یہ چیزیں اگر انہیں مل جاتی ہیں تو راضی ہو جاتے ہیں اور اگر نہ ملیں تو ناراض رہتے ہیں"۔ (212)

ایک اور حدیث شریف میں ارشاد ہوا: "دنیا مردار ہے اور اس کے طالب کُتے"۔ اگرچہ کوّا بھی مردار کھاتا ہے لیکن دنیا کو مردار اور اس کے طالب کو کُتے سے تشبیہ اس لیے دی گئی کہ دنیا پرستوں میں بھی وہی صفات پائی جاتی ہیں جو مردار کھانے والے کتوں میں پائی جاتی ہیں۔

آپ دیکھ لیجیے کہ کتا مردار اکیلے ہی کھاتا ہے خواہ وہ گائے وغیرہ بڑا جانور ہی کیوں نہ ہو بلکہ جب

212...بخاری، کتاب الرقاق، حدیث:6435

کوئی اور کتا اس کے ساتھ شریک ہونا چاہے تو وہ فوراً اس پر غرانا اور بھونکنا شروع کر دیتا ہے۔ یہی حال دنیا پرست کا ہے۔ وہ ہر گز نہیں چاہتا کہ کوئی اور اس کی دنیا میں حصہ دار بنے، جبکہ کوّا مردار دیکھتے ہی کائیں کائیں کر کے اپنی برادری جمع کر لیتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ کوّے کی خصلت یہ ہے کہ وہ دن ہی میں کھاتا ہے رات میں نہیں، جبکہ کتا مردار کو دن رات کھاتا ہے۔ آپ دیکھ لیجیے کہ مال و دولت کمانے کی ہوس دنیا پرست پر ایسی سوار ہوتی ہے کہ رات دن کماتا ہے، نہ دن کو سکون نہ رات کو آرام، ہر وقت دنیا جمع کرنے کی فکر اس پر مسلط رہتی ہے۔

تیسری بات یہ کہ کتا مرے ہوئے کتے کو بھی کھا لیتا ہے یعنی اپنے مردار بھائی کو بھی نہیں چھوڑتا جبکہ کوّا مردہ کوّے کو نہیں کھاتا۔ دنیا پرست کا حال دیکھ لیجیے، وہ بھی اپنے بھائیوں سے حسد کرتا ہے اور دنیا کمانے کی خاطر وہ مسلمان بھائیوں کو تو عموماً اور بعض اوقات سگے بھائیوں کو بھی دھوکا دینے سے باز نہیں رہتا۔

يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ:

پھر ارشاد ہوا: ”کیا یہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اُسے دنیا میں ہمیشہ رکھے گا؟“۔ یعنی جو مال جمع کرتا ہے اور اسے بار بار گن کر خوش ہوتا ہے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ مال اس کے پاس رہے گا تو اسے موت نہیں آئے گی۔ یا مطلب یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال کبھی ختم نہیں ہو گا، ہمیشہ اس کے پاس رہے گا۔ ہر گز نہیں۔

اگرچہ ہر آدمی جانتا ہے کہ ایک دن موت آنی ہے اور یہ مال پھر اس کے ساتھ نہیں رہے گا، پھر بھی وہ مال ایسے جمع کرتا ہے کہ گویا اس نے کبھی مرنا ہی نہیں۔ دراصل یہ انسان کی لمبی امیدوں اور موت سے اس کے غافل رہنے کی طرف اشارہ ہے۔

بعض مفسرین کا قول ہے، اس آیت میں یہ بتانا مقصود ہے کہ حقیقت میں دائمی زندگی عطا کرنے والا مال نہیں بلکہ ایمان اور عمل صالح ہے۔ قرآن کریم بتاتا ہے کہ آخرت کی فلاح انہی کے لیے ہے جو آخرت کا نفع چاہتے ہیں۔

{مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا

وَمَالَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِیْبٍ}(پ25،شوریٰ:20)

”جو آخرت کی کھیتی چاہے، ہم اس کے لیے اس کی کھیتی بڑھائیں، اور جو دنیا کی کھیتی چاہے، ہم اسے اس میں سے کچھ دیں گے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں“۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آقا و مولیٰ ﷺ نے خطوط کے ذریعے ایک مربع شکل بنائی اور اس کے درمیان ایک لمبی لکیر کھینچی جو اس مربع سے کچھ باہر نکل گئی۔ پھر اس درمیانی لکیر کے دائیں بائیں کچھ چھوٹے خطوط کھینچے اور فرمایا،

یہ درمیانی لکیر انسان ہے اور مربع کی شکل اس کی موت ہے جس نے اسے گھیر اہوا ہے۔ یہ باہر کو نکلا ہوا خط اس کی آرزو ہے اور یہ چھوٹے خطوط اس کے مصائب و امراض ہیں۔ اگر وہ ایک مصیبت سے بچتا ہے تو دوسری آجاتی ہے اور دوسری سے بچتا ہے تو تیسری آجاتی ہے۔(اس کی آرزو ختم نہیں ہوتی کہ اسے موت آجاتی ہے)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ غیب بتانے والے آقا ﷺ نے کچھ خطوط کھینچے اور فرمایا، یہ انسان کی اُمید اور یہ اُس کی موت ہے۔ وہ ان کے (یعنی اُمیدوں) درمیان ہی پھنسا رہتا ہے کہ قریبی خط سے اسے موت آجاتی ہے۔[213]

آقا و مولیٰ ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے، جیسے جیسے انسان کی عمر بڑھتی ہے اُسی قدر اس کی دو چیزیں بڑھتی جاتی ہیں یعنی مال کی محبت اور لمبی عمر کی خواہش۔[214]

لمبی امیدوں میں گرفتار ہونا اور دنیاوی لذتوں میں غرق ہو کر آخرت کو بھلا دینا مسلمان کی شان کے لائق نہیں۔ کافروں کے طرزِ زندگی کے متعلق ارشاد ہوا:

{ذَرْهُمْ یَاْكُلُوْا وَ یَتَمَتَّعُوْا وَ یُلْهِهِمُ الْاَمَلُ}(پ13، حجر:3)

”انہیں چھوڑو کہ کھائیں اور برتیں (فائدہ اٹھائیں)، اور امید انہیں کھیل میں ڈالے رکھے“۔

حضرت مولا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لمبی امیدیں آخرت کو بھلاتی ہیں اور خواہشات کی پیروی حق سے

---

213 ... بخاری، کتاب الرقاق، باب فی الامل وطولہ، حدیث:6417۔

214 ... البخاری، کتاب الرقاق، باب من بلغ ستین سنۃ....الخ، حدیث:6420

روکتی ہے۔[215]

آپ کا یہ بھی حکمت بھرا ارشاد ہے، دنیا پیٹھ پھیر کر چلی جانے والی اور آخرت ضرور پیش آنے والی ہے۔ان دونوں کے بیٹے ہیں۔ تمہیں چاہیے کہ آخرت کے بیٹے بنو، دنیا کے بیٹے نہ بن جانا کیونکہ آج عمل ہے مگر حساب نہیں لیکن کل حساب ہو گا مگر عمل نہیں ہو گا۔[216]

مال پرستوں کو اپنے جال میں پھانسنے کے شیطان کے تین طریقے ہیں۔

شیطان کہتا ہے کہ تین باتیں ایسی ہیں جن کی بناء پر مالدار مجھ سے بچ نہیں سکتا۔ وہ ناجائز طور پر مال حاصل کرتا ہے، اسے غلط کاموں میں خرچ کرتا ہے، اور میں اس کے دل میں مال کی ایسی محبت ڈال دیتا ہوں کہ وہ مال کے حقوق ادا نہیں کرتا۔

ناجائز مال کے حصول میں چوری، سود، رشوت، خیانت، جوا، دھوکا وغیرہ آگئے۔ غلط خرچ میں شراب خوری، عیاشی، رقص وسرود اور فضول خرچی کی تمام صورتیں شامل ہو گئیں اور مال کے حقوق ادا نہ کرنے سے مراد زکوٰۃ وصدقات نہ دینا اور دینی وفلاحی امور میں خرچ نہ کرنا ہے۔ یہ سب شیطانی کام ہیں۔

كَلَّا لَيُنۢبَذَنَّ فِي الۡحُطَمَةِ:

”ہرگز نہیں۔ ضرور وہ روندنے والی میں پھینکا جائے گا“۔

رب تعالیٰ نے دنیا اور مال جمع کرنے کی حرص وہوس میں مستغرق غافل شخص کی غلط روش کی مذمت سخت انداز میں فرمائی۔ کَلَّا، ہرگز نہیں۔ اس کی فکر اور سوچ باطل ہے۔ اس کا مال اسے حیاتِ جاوداں دے گا نہ ہی اسے جہنم کے عذاب سے بچائے گا۔ بلکہ اسے کسی حقیر وناکارہ چیز کی طرح اٹھا کر ”حطمۃ“ میں پھینک دیا جائے گا۔

”نبذ“ کے معنی ہیں کسی چیز کو حقیر سمجھتے ہوئے پھینک دینا، اور ”حطمة“ کے معنی ہیں جو روند ڈالے، کچل دے اور پیس کر ریزہ ریزہ کر دے۔

اب مفہوم یہ ہو گا کہ اس غافل ومتکبر اور مال پرست کو جو مال ودولت کی وجہ سے خود کو معزز

215...خزائن العرفان، حجر، تحت الآیۃ:3

216...شعب الایمان، شعب ۷۱، حدیث:10616۔

وبرتر سمجھتا تھا اور لوگوں کی عیب جوئی، طعنہ زنی اور غیبت کرکے ان کی عزتِ نفس مجروح کرتا تھا، قیامت میں اس کو حقارت وذلت کے ساتھ اٹھاکر ایسی آگ میں پھینک دیا جائے گا جو اس کو روند ڈالے گی اور چورا چورا کر دے گی۔ یہ آگ دنیا کی آگ کی مانند نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ قہار وجبار کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے۔

غیب بتانے والے آقا ومولیٰ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جہنم کی آگ کو ایک ہزار سال تک بھڑکایا گیا یہاں تک کہ وہ سرخ ہوگئی، پھر اسے ایک ہزار سال تک بھڑکایا گیا یہاں تک کہ وہ سفید ہوگئی، پھر اسے مزید ایک ہزار سال تک بھڑکایا گیا یہاں تک کہ وہ سیاہ ہوگئی۔ پس اب وہ سیاہ اندھیری ہے۔[(217)]

یہ بھی فرمایا، تمہاری دنیا کی آگ دوزخ کی آگ کا ستّرواں حصہ ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! یہ آگ ہی (عذاب کے لیے) کافی تھی۔ فرمایا، جہنم کی آگ تمہاری آگ سے اُنہتر درجہ زیادہ سخت گرم ہے۔[(218)]

{فَاَمَّا مَنْ طَغٰی o وَاٰثَرَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا o فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰی o وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَی النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی o فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی}

”تو وہ جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تو بیشک جہنم ہی اس کا ٹھکانا ہے۔ اور وہ جو اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو خواہش سے روکا تو بیشک جنت ہی اس کا ٹھکانا ہے“۔(پ30،نازعات:37-41،)

آقائے دوجہاں نورِ مجسم ﷺ کا یہ فرمان ذیشان بھی مشعلِ راہ بنائیے۔

”اے لوگو! انتہائی کوشش کے ذریعے جنت کے طالب بنو اور انتہائی کوشش کے ساتھ دوزخ سے بچنے کی فکر کرو۔ کیونکہ جنت ایسی چیز ہے جس کا چاہنے والا سو نہیں سکتا اور آگ بھی ایسی چیز ہے جس سے بھاگنے والا غافل نیں ہو سکتا۔ آخرت ناخوشگوار چیزوں سے گھیر دی گئی ہے اور دنیا لذتوں اور خواہشوں میں گھری ہوئی ہے پس دنیا کی لذتیں اور خواہشیں تم کو آخرت سے غافل نہ کر دیں“۔[(219)]

---

217 ... شعب الایمان، باب فی الخوف من اللہ تعالی ،حدیث:799۔

218 ... مسلم،کتاب صفۃ الجنۃ...الخ،حدیث:2843

219 ... معجم الکبیر،حدیث:16478

الَّتِیۡ تَطَّلِعُ عَلَی الۡاَفۡـِٕدَۃِ:

اس آگ کی پہلی صفت یہ بیان ہوئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بھڑکائی ہوئی ہے۔ اور اب دوسری صفت یہ بیان ہوئی کہ وہ دلوں پر چڑھ جائے گی۔

دل کا ذکر کرنے کی پہلی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی آگ جب انسانی جسم کو لگتی ہے تو دل تک پہنچنے سے پہلے اس کی موت واقع ہو جاتی ہے اور دوزخ میں چونکہ موت نہیں آنی اس لیے یہ آگ دل تک زندگی کی حالت میں پہنچے گی اور دل کے جلنے کی اذیت انسان زندہ حالت میں محسوس کرے گا۔

حضورِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے، جہنم کی آگ جہنمیوں کو کھائے گی یہاں تک کہ جب دل تک پہنچے گی تو رک جائے گی پھر جہنمی اسی طرح ہو جائے گا جس طرح پہلے تھا۔ پھر آگ جلانا شروع کرے گی جب دل تک پہنچے گی تو پھر پہلے والا معاملہ ہو گا۔

دل کا ذکر کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ بدن میں یہ سب سے لطیف جزو ہے اور سب سے زیادہ شدید درد اسی میں ہوتا ہے۔ اور تیسری وجہ یہ ہے کہ باطل عقائد اور برے اعمال کا سرچشمہ دل ہی ہے۔ قرآن کریم میں ہے،

{فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ} (پ1،بقرہ:10) "ان کے دلوں میں بیماری ہے"۔

{فَاِنَّهَا لَا تَعۡمَی الۡاَبۡصَارُ وَلٰکِنۡ تَعۡمَی الۡقُلُوۡبُ الَّتِیۡ فِی الصُّدُوۡرِ}

"تو یہ کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں"۔

(پ17،حج:46)

مال کی حرص و ہوس، بخل، تکبر، دوسروں کو حقیر سمجھنا، یہ سب دل ہی کے امراض ہیں اسی لیے جہنم کی آگ دلوں پر چڑھ جائے گی۔ عذاب کی شدت سے وہ موت چاہیں گے مگر موت نہ آئے گی۔

فِیۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَۃٍ:

ارشاد ہوا: "بیشک وہ (آگ) اُن پر بند کر دی جائے گی لمبے لمبے ستونوں میں"۔ مفسرین فرماتے ہیں: ان منکروں کو "حُطَمة" میں ڈالا جائے گا تو آگ انہیں ہر طرف سے گھیر لے گی اور پھر جہنم کے اس طبقہ کے دروازے کو لوہے کے ستونوں سے بند کر دیا جائے گا تاکہ یہ کبھی باہر نہ آسکیں اور آگ

ہمیشہ انہیں جلاتی رہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب دوزخ میں وہ دوزخی رہ جائیں گے جنہوں نے ہمیشہ اس میں رہنا ہے تو انہیں لوہے کے تابوتوں میں بند کر کے ان میں لوہے کی کیلیں ٹھونک دی جائیں گی پھر ان تابوتوں کو دوسرے آہنی صندوقوں میں بند کر کے دوزخ کے سب سے نچلے درجے میں پھینک دیا جائے گا اور کوئی کسی دوسرے کے عذاب کو نہیں دیکھ سکے گا۔

بعض کا قول ہے کہ حُطمہ میں آگ کے شعلے لمبے لمبے ستونوں کی طرح بلند ہونگے اور یہ تعداد میں اس قدر زیادہ ہوں گے کہ ان پر بند دروازے کی مثل ہو جائیں گے۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ انہیں آگ کے لمبے لمبے ستونوں سے باندھ دیا جائے گا، نہ آگ ہلکی ہو گی اور نہ وہ عذاب سے بھاگ سکیں گے۔ فرمانِ الٰہی ہے،

{اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى}

"بیشک جو اپنے رب کے حضور مجرم ہو کر آئے تو ضرور اُس کے لیے جہنم ہے جس میں نہ مرے نہ جیے"۔(پ16،طہٰ:74)

تفسیر سورۃ الفیل

سورۃ الفیل مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں پانچ آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِیۡلِ ﴿۱﴾ اَلَمۡ یَجۡعَلۡ کَیۡدَہُمۡ فِیۡ تَضۡلِیۡلٍ ﴿۲﴾ وَّ اَرۡسَلَ عَلَیۡہِمۡ طَیۡرًا اَبَابِیۡلَ ﴿۳﴾ تَرۡمِیۡہِمۡ بِحِجَارَۃٍ مِّنۡ سِجِّیۡلٍ ﴿۴﴾ فَجَعَلَہُمۡ کَعَصۡفٍ مَّاۡکُوۡلٍ ﴿۵﴾

”اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا (ہے)“

”اے محبوب ﷺ! کیا تم نے نہ دیکھا تمہارے رب نے ان ہاتھی والوں کا کیا حال کیا۔ کیا اُن کا داؤ تباہی میں نہ ڈالا۔ اور اُن پر پرندوں کی ٹکڑیاں (فوجیں) بھیجیں، کہ انہیں کنکر کے پتھروں سے مارتے۔ تو اُنہیں کرڈالا جیسے کھائی کھیتی کی پتی (یعنی بھوسہ)“۔

(کنز الایمان از امام احمد رضا محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ)

لفظی ترجمہ:

اَ	لَمۡ	تَرَ	کَیۡفَ	فَعَلَ	رَبُّ	کَ	بِ	اَصۡحٰبِ	الۡفِیۡلِ
کیا	نہ	دیکھا تم نے	کیسا	کیا	رب (نے)	تمہارے	ساتھ	والوں (کے)	ہاتھی

اَ	لَمۡ	یَجۡعَلۡ	کَیۡدَ	ھُمۡ	فِیۡ	تَضۡلِیۡلٍ
کیا	نہ	کردیا اُس نے	مکر	اُن کا	میں	تباہی

وَّ	اَرۡسَلَ	عَلیٰ	ھِمۡ	طَیۡرًا	اَبَابِیۡلَ
اور	بھیجے	پر	اُن	پرندے	جُھنڈ کے جھنڈ

سِجِّيْلٍ	مِّنْ	حِجَارَةٍ	بِ	هِمْ	تَرْمِيْ
کنکر	سے	پتھریاں	کے ساتھ	اُن (پر)	پھینکتے وہ

مَّاْكُوْلٍ	عَصْفٍ	كَ	هُمْ	جَعَلَ	فَ
کھائے ہوئے	بھوسے	کی طرح	اُنہیں	کر دیا اُس نے	پس

ربط و مناسبت:

سورۃ الھمزۃ میں بُرے لوگوں کا اُخروی انجام مذکور تھا، اس سورت میں بُرے لوگوں کا دنیاوی انجام بیان ہوا۔ پچھلی سورت میں یہ بیان ہوا تھا کہ مذکورہ جرائم پر شدید عذاب ہو گا، اس سورت میں اصحابُ الفیل پر عذاب کے ذکر سے ثابت کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی گرفت کر سکتا ہے اور آخرت میں بھی۔

سابقہ سورت میں ان لوگوں کا اُخروی انجام بیان کیا گیا جو عیب جوئی، غیبت اور طعنہ زنی کے ذریعے رسولِ معظم ﷺ کے خلاف سازشیں کیا کرتے تھے۔ سورۃ الفیل میں ان کو تنبیہ کی گئی ہے کہ جس طرح بیتُ اللہ کے خلاف ہاتھی والوں کی سازش ناکام ہوئی اور ان کو برباد کر دیا گیا۔ تم رسولُ اللہ ﷺ کے خلاف سازشیں کرنا چھوڑ دو کہ جن کی شان و عظمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک بیتُ اللہ سے بدرجہا زیادہ ہے ورنہ تم بھی برباد ہو جاؤ گے اور تمہارا کوئی نام لیوا بھی نہ ہو گا۔

سابقہ سورت میں کفار کا یہ باطل گمان بیان ہوا تھا کہ ان کا مال انہیں ہمیشہ رکھے گا اور انہیں موت سے بچالے گا، اس سورت میں اصحابِ فیل کی تباہی کا حال بتا کر خبردار کر دیا گیا کہ جب ابرہہ کی دولت و حکومت اس کو تباہی سے نہ بچا سکی تو پھر جان لو کہ کسی کافر کی دولت و سرداری اسے خدا کے عذاب سے نہیں بچا سکتی۔

شانِ نزول:

ابرہہ یمن کا عیسائی بادشاہ تھا۔ اس نے صنعاء میں ایک کلیسا (عبادت خانہ) بنوایا اور وہ چاہتا تھا کہ عرب کے لوگ آئندہ خانہ کعبہ کے بجائے اس کلیسا کا حج اور طواف کیا کریں۔ عرب کے لوگوں کو یہ

بات ناگوار گزری۔ قبیلہ بنی کنانہ کے ایک شخص نے موقع پاکر اس کلیسا میں قضائے حاجت کی اور اس کو نجاست سے آلودہ کر دیا۔

اس پر ابرہہ کو بہت طیش آیا، اور اس نے خانہ کعبہ کو ڈھانے کی قسم کھائی۔ اس ناپاک ارادے سے وہ اپنا لشکر لے کر روانہ ہوا جس میں بہت سے ہاتھی تھے اور ان کا پیش رو ایک عظیم کوہ پیکر ہاتھی تھا جس کا نام محمود تھا۔

ابرہہ کے لشکر نے مکہ مکرمہ کے قریب پہنچ کر مکہ والوں کے جانور قید کر لیے۔ ان میں دو سو اونٹ حضرت عبد المطلب کے بھی تھے۔ حضرت عبد المطلب ابرہہ کے پاس آئے تو ابرہہ نے ان کی بہت تعظیم کی اور ان کے آنے کا مقصد پوچھا۔ آپ نے فرمایا: میں اس لیے آیا ہوں کہ میرے اونٹ واپس کیے جائیں۔

ابرہہ نے کہا، مجھے بہت تعجب ہے کہ میں خانہ کعبہ کو ڈھانے آیا ہوں اور وہ تمہارا اور تمہارے باپ دادا کا معظم و محترم مقام ہے۔ تم اس کے لیے تو کچھ نہیں کہتے اور اپنے اونٹوں کے لیے کہتے ہو۔ آپ نے فرمایا: میں اونٹوں کا مالک ہوں اس لیے ان کے لیے کہتا ہوں، اور کعبہ کا مالک اللہ تعالیٰ ہے وہ خود اس کی حفاظت فرمائے گا۔

حضرت عبد المطلب کو ابرہہ نے اونٹ واپس کر دیے۔ آپ نے آکر قریش کو حال سنایا اور مشورہ دیا کہ مکہ سے نکل کر پہاڑوں کی گھاٹیوں میں پناہ گزین ہوں۔ قریش نے ایسا ہی کیا۔ آپ خود خانہ کعبہ میں گئے اور وہاں یہ دعا کی،

اے اللہ! ہر کوئی اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے، تو ان سے اپنے حرم کی حفاظت فرما۔ بیشک اس گھر کا دشمن تیرا دشمن ہے، انہیں اپنی بستی کو اُجاڑنے سے روک دے۔

اس دعا کے بعد آپ بھی پہاڑوں کی طرف چلے گئے۔ اگلی صبح ابرہہ نے اپنی فوج کو حملہ کے لیے تیار کیا۔ اس نے اپنے دیو پیکر ہاتھی محمود کو اٹھانا چاہا مگر وہ نہ اٹھا اور کعبہ کی طرف نہ چلا۔ جب اس کا منہ دوسری طرف کیا جاتا تو وہ تیز چلنے لگتا لیکن جب اس کا رُخ مکہ کی طرف کیا جاتا تو وہ پھر بیٹھ جاتا۔

اسی دوران اللہ تعالیٰ نے سمندر کی جانب سے چھوٹے چھوٹے پرندے بھیجے۔ ہر پرندے کے پاس تین تین کنکریاں تھیں۔ پرندے وہ کنکریاں گرانے لگے۔ جس شخص پر وہ کنکریاں گرتیں، اس

کے آہنی خود کو توڑ کر سر سے ہوتی ہوئی، جسم کو چیر کر ہاتھی میں سے گزر کر زمین میں دھنس جاتیں۔اس طرح ابرہہ کا لشکر تباہ وبرباد ہو گیا۔

جس سال یہ واقعہ ہوا،اسی سال اس واقعہ کے پچاس روز بعد سیدِ عالم حبیبِ خدا حضرت محمد مصطفی ﷺ کی ولادتِ باسعادت ہوئی۔[220]

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ:

ارشاد ہوا:"اے محبوب ﷺ! کیا تم نے نہ دیکھا تمہارے رب نے ان ہاتھی والوں کا کیا حال کیا"۔(پ30،فیل:1،)

مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت میں خطاب نبی کریم ﷺ سے ہے۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ واقعہ تو نبی کریم ﷺ کی ولادت مبارکہ سے پہلے کا ہے پھر "کیا تم نے نہ دیکھا" کیوں فرمایا گیا۔

ایک جواب یہ ہے کہ یہاں دیکھنے سے مراد رؤیتِ قلبی یعنی علم ہے۔چونکہ یہ واقعہ تواتر سے ثابت اور عرب میں نہایت مشہور تھا اس لیے اس کا علم اتنا ہی یقینی ہے کہ گویا آنکھوں سے دیکھا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر اس کو رویتِ بصریہ یامشاہدہ کے معنی میں لیا جائے تو بھی درست ہے۔سورۃ العلق کی تفسیر میں احادیثِ مبارکہ پہلے مذکور ہو چکیں کہ نبی کریم ﷺ کا نور سب سے پہلے تخلیق ہوا اور آپ کو نبوت اس وقت عطا ہوئی جبکہ آدم علیہ السلام روح اور جسم کے درمیان تھے۔

پس نورِ محمدی ﷺ بارگاہِ الٰہیہ میں ذاتِ باری تعالیٰ کی تجلیات کے مشاہدے بھی کرتا رہا اور ساتھ ہی کائنات میں رونما ہونے والے واقعات بھی دیکھتا رہا۔

ایک قول یہ ہے کہ اس آیت میں حضور ﷺ کے واسطے سے تمام قریش مخاطب ہیں۔ان سے کہا جارہا ہے کہ تم نے اس واقعے پر غور نہیں کیا کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ جس طرح تمہارے رب نے اپنے گھر کے دشمنوں کو نیست ونابود کر دیا، ایسے ہی وہ اپنے محبوب رسول ﷺ کے دشمنوں کو بھی تباہ وبرباد کر سکتا ہے،پس تم اس سے عبرت حاصل کرو۔

ایک بصیرت افروز نکتہ یہ ہے کہ جب دو اشخاص میں مصاحبت ہوتی ہے تو کم درجہ والے شخص

220...خزائن العرفان،فیل،ص1120۔

کو ''صاحبِ اعلیٰ'' کہا جاتا ہے کیونکہ عربی میں لفظ ''اصحاب'' کی نسبت جس ہستی کی طرف کی جاتی ہے وہ ان اصحاب سے اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہے۔ اسی لیے رسولِ معظم ﷺ کی صحبت میں بیٹھنے والوں کو ''اصحابِ رسول'' کہا جاتا ہے۔

اس سورت میں اصحابُ الفیل کے الفاظ یہ حقیقت واضح کر رہے ہیں کہ یہ لوگ انسانیت کے درجہ سے گر چکے تھے بلکہ حال اور درجہ میں ہاتھیوں سے بھی کمتر اور گھٹیا تھے۔ ارشادِ باری تعالیٰ {بَلْ هُمْ اَضَلُّ} ''بلکہ یہ چوپایوں سے بڑھ کر گمراہ'' سے بھی یہی مراد ہے۔

اس حقیقت کی مزید تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ جب وہ ہاتھی کو کعبہ کی جانب چلانا چاہتے تو وہ بیٹھ جاتا اور جب دوسری جانب چلانا چاہتے تو وہ چلنے لگتا۔ اس بات سے بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ ہاتھی ان سے بہتر تھا۔

اس آیت میں لفظ ''رَبُّکَ'' فرمانے میں لطیف رمز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہاتھی والوں کے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ آپ کی تشریف آوری اور عظمت کے اظہار کی خاطر کیا ہے، کیونکہ اسی سال جانِ کائنات رحمتِ عالم ﷺ عالمِ قدس سے عالمِ دنیا میں جلوہ گر ہوئے۔ گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

اے حبیب! میں تیرا رب ہوں۔ جب میں نے تیری آمد سے پہلے تیری عظمت کا خیال رکھا ہے تو تیرے ظہور کے بعد تیری ضرور ضرور مدد کروں گا اور تجھے باطل ادیان پر غلبہ عطا کروں گا۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مفہوم یہ ہے کہ اے حبیب! کعبہ تمہاری نمازوں کا قبلہ ہے اور تمہارا دل، تمہارے رب کی معرفت کا قبلہ ہے۔ جب میں نے تمہارے اعمال کے قبلہ کی دشمنوں سے حفاظت کی ہے تو تمہارے عقائد کے قبلہ کی دشمنوں سے حفاظت کیوں نہ کروں گا۔

کسی نبی سے بعثت سے قبل جو خلافِ عادت باتیں ظاہر ہوتی ہیں، انہیں اصطلاح میں اِرہاص کہتے ہیں۔ حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے ایسے کئی معجزات (ارہاصات) ظاہر ہوئے، مثلاً بادل کا حضور ﷺ پر سایہ کرنا، پتھر کا حضور کو سلام کرنا، اسی طرح ہاتھی والوں کا تباہ کیا جانا بھی امام الانبیاء ﷺ کا ارہاص ہے۔

علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں، اس واقعہ کا پیش آنا حضور ﷺ کے ظہور و بعثت سے

قبل تمہید و مقدمہ کے طور پر تھا۔[221]

اَلَمۡ یَجۡعَلۡ کَیۡدَهُمۡ...:

ارشاد ہوا: ’’کیا اُن کا داؤ تباہی میں نہ ڈالا‘‘۔ یعنی کیا اللہ تعالیٰ نے اُن کے مکر و فریب کو ناکام نہیں بنا دیا۔

لفظ ’’کید‘‘ کے معنی خفیہ تدبیر اور پوشیدہ چال کے ہیں۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابرہہ ساٹھ ہزار سپاہیوں کا لشکر لے کر آیا جبکہ مکہ مکرمہ کی کُل آبادی چند ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ پھر اس نے اعلان بھی کر دیا کہ وہ خانۂ کعبہ کو گرانے کے لیے آیا ہے، اس کے باوجود اسے خفیہ تدبیر کیوں فرمایا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی خفیہ بات ضرور ایسی تھی جو کہ لوگوں پر ظاہر نہ تھی۔

ایک بات تو یہ ہے کہ وہ یہ چاہتا تھا کہ (معاذاللہ) کعبہ کو گرانے کے بعد اس کا کلیسا کعبہ بن جائے۔ اس طرح تمام عرب، یمن کی عیسائی حکومت کو اپنا مذہبی پیشوا تسلیم کرلیں گے اور پھر تمام عرب کے لوگوں کو عیسائی بنانا آسان ہو جائے گا۔ اس کا خطرناک پہلو یہ ہے کہ اس طرح نبی کریم ﷺ کے ظہور سے پہلے ہی اسلام کے مقابلے میں عیسائیت ایک مسلح طاقت کے طور پر کھڑی ہو جاتی، جس کی پشت پناہ، حبش اور روم کی عیسائی حکومتیں ہوتیں۔ رسول معظم ﷺ کی دعوتِ حق کو کامیاب بنانے کے لیے رب تعالیٰ نے ان کی چال کو خاک میں ملا دیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ تمام تجارتی قافلے عرب سے گزر کر ہی شام اور مصر جاتے۔ خانۂ کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے قریش کو عرب میں سرداری حاصل تھی اور وہ تجارتی قافلوں کے نگراں تھے۔ یہ بات عیسائیوں کو ناگوار تھی۔

یہ بات تحقیق طلب ہے کہ ابرہہ کے کلیسا کو کسی نے آلودہ کیا تھا یا نہیں، لیکن اسی پراپیگنڈے کی بنیاد پر اس نے کعبہ پر حملہ کا اعلان کیا جس کے پسِ پردہ اس کے مذموم مقاصد میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تجارت میں عربوں کا عموماً اور قریش کا خصوصاً عمل دخل ختم کیا جائے۔ اس سازش کو رب تعالیٰ نے ناکام بنا کر عربوں پر خاص احسان کیا۔

221... مظہری، فیل، تحت الآیۃ: 1

وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا...:

یہ بات پہلے مذکور ہوئی کہ ابرہہ کا لشکر اس قدر بڑا اور مسلح تھا کہ اگر مکہ اور اس کے تمام حلیف قبائل جمع ہو جاتے تب بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ مزید یہ کہ اس میں جنگی ہاتھی بھی شامل تھے۔ ابرہہ کی جنگی حکمتِ عملی میں شکست کا قطعاً کوئی امکان نہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت نے اس کی تمام چالوں کو ناکام بنا دیا۔

رب تعالیٰ نے اس کی چالوں کو اس طرح اکارت کیا کہ ان پر جوق در جوق چھوٹے چھوٹے پرندے بھیجے۔ عموماً اردو میں ایک خاص چڑیا کو ابابیل کہتے ہیں۔ یہاں ابابیل سے وہ چڑیا مراد نہیں بلکہ عربی زبان میں ابابیل کا معنی ہے، کسی چیز کا مختلف ٹکڑیوں میں یکے بعد دیگرے آنا۔ ارشادِ باری ہوا:

" اور اُن پر پرندوں کی ٹکڑیاں (فوج در فوج) بھیجیں، کہ انہیں کنکر کے پتھروں سے مارتے"۔(پ30، فیل:2-3)

ہر پرندے نے ایک کنکر اپنی چونچ میں اور ایک ایک کنکری اپنے دونوں پنجوں میں پکڑی ہوئی تھی اور ہر کنکری پر اس شخص کا نام لکھا تھا جس نے اس کنکری سے ہلاک ہونا تھا۔ کنکری کا حجم چنے یا مسور کے دانے کے برابر تھا۔ وہ عام پرندے نہیں تھے بلکہ ایک خاص قسم کے تھے۔ ان کی چونچیں پرندوں کی طرح اور ان کے پنجے کتوں کی طرح کے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان کے سر درندوں کے سروں جیسے تھے۔

وہ پرندے اچانک فوج در فوج نمودار ہوئے اور تھوڑی ہی دیر میں ابرہہ کے لشکر پر چھا گئے۔ پھر حکمِ الٰہی سے انہوں نے کنکریاں پھینکنا شروع کیں۔ وہ کنکری جس سپاہی پر پڑتی، اس کے فولادی خود، آہنی زرہ کو چیرتی ہوئی، اس کے جسم سے پار ہو کر اس کی سواری کے جسم کو چھلنی کرتی ہوئی زمین میں دھنس جاتی۔ وہ کنکری جس پر پڑی، اس کے جسم پر پھوڑے نکل آئے اور ان سے پیپ اور خون بہنے لگا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا گوشت گل سڑ کر گرنے لگا۔

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُوْلٍ:

پھر فرمایا گیا، اس سنگ باری نے انہیں ایسا کر ڈالا جیسے کھایا ہوا بھوسہ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جانور جب

بھوسہ کھاتا ہے تو کھاتے ہوئے اسے دانتوں سے مزید پیستا ہے اور پھر وہ معدے سے ہو کر آخر کار گوبر بن کر باہر نکلتا ہے۔ اب مفہوم یہ ہو گا کہ جس طرح جانور کا کھایا ہوا بھوسہ گوبر کی صورت میں تباہ حال ہو جاتا ہے اسی طرح کی حالت اس لشکر کی ہو گئی تھی جس پر عذابِ الٰہی نازل ہوا۔

اس لشکر کا اکثر حصہ تو وہیں تباہ ہو گیا البتہ چند لوگ یمن پہنچنے میں کامیاب ہوئے ان میں ابرہہ بھی تھا۔ لیکن ان کی حالت بہت بری تھی۔ جسم پھوڑوں سے بھرے ہوئے، ان سے بہتی ہوئی بدبودار پیپ اور درد کی شدت سے زخمیوں کی آہ و پکار۔ ان کا گوشت گلتا رہا یہاں تک کہ وہ سسک سسک کر مر گئے۔ گوشت گلنے سے ابرہہ کا سینہ پھٹ گیا اور وہ بھی تڑپ تڑپ کر مرا۔

ابرہہ سمیت ان لوگوں کے اپنے دارالحکومت زندہ پہنچ کر ایسی کربناک موت مرنے کی یہی حکمت سمجھ میں آتی ہے کہ رب تعالیٰ نے یہ چاہا کہ مکہ والے ہی نہیں بلکہ اہلِ یمن اور راستے والے بھی دیکھ لیں کہ اُس کے گھر کی بے ادبی کا ارادہ کرنے والے کس طرح اُس کے عذاب سے تباہ و برباد ہوتے ہیں۔

ابرہہ کے ہاتھی محمود کے دو ہاتھی بان، اندھے اور اپاہج ہو گئے اور بعد میں وہ مکہ میں بھیک مانگتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے ان دونوں کو اس حالت میں بھیک مانگتے دیکھا کہ وہ اندھے اور اپاہج تھے۔[222]

ملحدین کا رد:

اکثر ملحدین آسمانی عذابوں کا انکار کرتے ہیں مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے کافروں کو پانی میں غرق کر دیا جانا، فرعون کے لشکر کی سمندر میں ہلاکت، قومِ عاد کو آندھی سے ہلاک کیا جانا، حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر پتھروں کی بارش، نیز کسی قوم کو زلزلے سے اور کسی کو آگ برسا کر ہلاک کیا گیا۔

قرآن کریم میں ان تمام واقعات کو مختلف سورتوں میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ الاعراف، سورۃ ھود اور سورۃ الشعراء ملاحظہ فرمائیے۔

دہریے ان واقعات کو اتفاقی واقعات و حادثات یا کائناتی تبدیلیاں قرار دے کر ان کی بھونڈی

222... تفسیر کبیر، فیل، تحت الآیۃ:4

تاویلیں کرتے ہیں۔ اصحابِ فیل کے واقعہ میں کوئی دہریہ کسی قسم کی تاویل نہیں کر سکا کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ پرندے کنکر اٹھا کر کچھ لوگوں کو اس طرح ماریں کہ وہ انکے آر پار ہو جائیں۔

مزید یہ کہ اس واقعہ کا تاریخی طور پر انکار بھی ممکن نہیں۔ کیونکہ اس واقعہ کے سال ہی حضور ﷺ کی ولادت ہوئی اور اس کے چالیس سال بعد آپ نے اپنی نبوت کا اعلان فرمایا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد مکہ میں یہ سورت نازل ہوئی۔ اگر بالفرض ایسا کوئی واقعہ نہ ہوا ہوتا تو کفارِ مکہ ضرور اسے جھٹلاتے اور آسمان سر پر اٹھا لیتے، لیکن کسی کا انکار نہ کرنا ہمارے آقا ﷺ کی نبوت پر روشن دلیل ہے۔

دنیا پرستوں کا رد:

اس سے قبل سورۃ ھمزۃ میں بیان کیا گیا تھا کہ مال و دولت کی بارگاہِ الٰہی میں کوئی حیثیت اور وقعت نہیں ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سب کچھ یہی مال و دولت ہے، قیامت کے دن ان کو اٹھا کر "حُطَمَہ" یعنی روندنے والی آگ میں پھینک دیا جائے گا جو اُن کو چورا چورا کر دے گی۔

اس سورت میں بیان ہوا کہ طاقت و اقتدار کے نشہ میں مست لشکر جب اللہ تعالیٰ کے گھر کو گرانے کی نیت سے آیا تو رب تعالیٰ نے چھوٹے چھوٹے پرندوں کے ذریعے اس لشکر کو ایسے ریزہ ریزہ کر دیا جیسے کھایا ہوا بھوسہ ہوتا ہے۔

گویا سابقہ سورت میں مال و دولت کے نشہ کی وجہ سے حق سے منہ موڑنے والوں کو آخرت کے عذاب کی وعید سنائی گئی اور اس سورت میں طاقت و اقتدار کی وجہ سے زمین پر فرعون بن کر حق کی نشانی مٹانے کی ناپاک کوشش کرنے والوں کو دنیا ہی میں عذاب نازل فرما کر نیست و نابود کر دیا گیا۔

ان سورتوں کے ذریعے تمام انسانوں کو دعوتِ فکر دی گئی ہے کہ دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے مقابل مال و دولت اور طاقت و اقتدار کام آنے والی چیزیں نہیں ہیں۔ {لَا یُجَارُ عَلَیۡہِ} "اللہ کے خلاف کوئی پناہ نہیں دے سکتا"۔

کام آنے والی اصل چیز اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب ﷺ پر ایمان اور ان کے احکامات کی پیروی ہے جو فلاح و نجات کا سیدھا راستہ ہے۔

تفسیر سورۃ القریش

سورۃ القریش مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں چار آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ ۙ﴿۱﴾ اٖلٰفِہِمۡ رِحۡلَۃَ الشِّتَآءِ وَ الصَّیۡفِ ۚ﴿۲﴾ فَلۡیَعۡبُدُوۡا رَبَّ ہٰذَا الۡبَیۡتِ ۙ﴿۳﴾
الَّذِیۡۤ اَطۡعَمَہُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ ۬ۙ وَّ اٰمَنَہُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ ٪﴿۴﴾

"اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا (ہے)"

"اس لیے کہ قریش کو میل دلایا (یعنی مائل کیا) اُن کے جاڑے اور گرمی دونوں کے کوچ (سفر) میں میل دلایا، تو انہیں چاہیے کہ اس گھر کے رب کی بندگی کریں جس نے انہیں بھوک میں کھانا دیا اور انہیں ایک بڑے خوف سے امان بخشا"۔ (کنز الایمان از اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ)

لفظی ترجمہ:

لِ	اِیۡلٰفِ	قُرَیۡشٍ
(کے) واسطے	الفت دلانے	قریش (کو)

اٖلٰفِ	ہِمۡ	رِحۡلَۃَ	الشِّتَآءِ	وَ	الصَّیۡفِ
الفت دلانے	اُن (کو)	سفر (سے)	سردی	اور	گرمی (کے)

فَ	لۡ	یَعۡبُدُوۡا	رَبَّ	ہٰذَا	الۡبَیۡتِ
پس	چاہیے کہ	عبادت کریں وہ	رب (کی)	اس	گھر (کے)

الَّذِیۡۤ	اَطۡعَمَ	ہُمۡ	مِّنۡ	جُوۡعٍ
(وہ) جس	(نے) کھلایا	اُنہیں	سے / میں	بھوک

خَوْفٍ	مِّنْ	هُمْ	اٰمَنَ	وَّ
خوف	سے	اُنہیں	امن بخشا	اور

ربط و مناسبت:

سورۃ الفیل میں بیان ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے قریش کے دشمن ہاتھی والوں کو ہلاک کر دیا جو خانہ کعبہ کو گرانے آئے تھے۔ مزید یہ کہ ابرہہ کے زخمی سپاہی مکہ سے یمن تک راستے میں گر گر کر مرتے گئے، اس سے کعبہ کے بیت اللہ ہونے پر عربوں کا ایمان اور مضبوط ہو گیا۔ اگرچہ پہلے بھی کعبہ کا متولی ہونے کی وجہ سے قریش کو نمایاں حیثیت حاصل تھی لیکن اس واقعہ کی وجہ سے عرب کے لوگوں میں قریش کی عزت و عظمت مزید بڑھ گئی۔

سورۃ القریش میں رب تعالیٰ نے قریش کو اپنی مزید دو اہم ترین نعمتیں یاد دلائی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے قریش کے دلوں میں دوسرے شہروں کی طرف تجارت کے لیے سفر کرنے کی رغبت پیدا کی جس کی وجہ سے وہ خوش حال ہو گئے۔ بیت اللہ کے خادم اور متولی ہونے کی برکت سے انہیں عرب میں خاص عزت اور سرداری بھی حاصل تھی اور اسی کے باعث انہیں ہمیشہ امن حاصل رہا۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ دونوں سورتیں مضمون کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت زیادہ ربط و مناسبت رکھتی ہیں کیونکہ دونوں سورتوں میں رب تعالیٰ نے قریش پر خصوصی انعامات کا ذکر فرمایا ہے۔

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ:

تاریخِ اسلام میں قبیلۂ قریش کو ایک منفرد حیثیت حاصل ہے۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ حبیبِ کبریاء ﷺ قریش سے تعلق رکھتے تھے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"بیشک اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل کی اولاد سے کنانہ کو چن لیا اور بنو کنانہ سے قریش کو چن لیا اور قریش میں سے بنو ہاشم کو چن لیا۔ اور بنو ہاشم میں سے مجھے چن لیا"۔ [223]

223... مسلم، کتاب الفضائل، باب فضل نسب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ... الخ، حدیث:2276۔

اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ کنانہ کے بیٹے نضر کی اولاد کو قریش کہا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ سے قریش کے مورثِ اعلیٰ تک تیرہ پشتیں ہیں۔

حضرت محمد ﷺ، عبد اللہ، عبد المطلب، ہاشم، عبد مناف، قصی، کلاب، مُرہ، کعب، لوی، غالب، فہر، مالک، نضر۔ ان میں سے قصی بن کلاب نے قریش قبیلہ کے لوگوں کو جو پہلے پورے عرب میں منتشر تھے، مکہ مکرمہ میں یکجا کر کے آباد کیا۔

قریش کا ایک اور اعزاز یہ ہے کہ وحیٔ الٰہی کے اولین مخاطب قریش ہی کے لوگ تھے اور انہی لوگوں کو اس دعوتِ حق کو دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ نیز قریش کے لوگ کعبہ شریف کے متولی تھے اور ایامِ حج میں حاجیوں کی خدمت کرتے تھے، اس بناء پر پورے عرب میں ان کی عزت کی جاتی تھی۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آقا و مولیٰ ﷺ نے فرمایا: لوگ خیر اور شر میں قریش کے تابع ہیں۔ (224)

اس ارشاد میں قریش کی قائدانہ استعداد کی طرف اشارہ ہے کہ وہ کفر میں بھی راہنما تھے اور اسلام میں بھی پیشوا بنے۔ قریش کے مومنوں کے لیے زیادہ اجر ہے کیونکہ ان کی تبلیغ و کوشش سے بعد والوں نے اسلام قبول کیا۔ اسی طرح ان کے کافر زیادہ عذاب میں ہونگے کیونکہ وہ بعد والوں کے لیے کفر کا ذریعہ بنے۔

غیب بتانے والے آقا کریم ﷺ کا ارشاد ہے، جو کوئی قریش کو ذلیل کرنے کا ارادہ کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل کر دے گا۔ (225)

رسولِ معظم ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے، "اللہ تعالیٰ نے سات وجوہ سے قریش کو فضیلت دی ہے۔ میں قریش میں سے ہوں۔ نبوت ان میں ہے۔ کعبہ کی دربانی انہیں کے لیے مخصوص ہے۔ حاجیوں کو زمزم پلانے کی خدمت ان کے ذمہ ہے۔

اصحابِ فیل کے مقابل ان کی مدد کی گئی۔ نبوت کے ابتدائی دس سال قریش کے سوا کسی اور نے اللہ

224... مسلم، کتاب الامارۃ، حدیث: 1819

225... ترمذی، کتاب المناقب، حدیث: 3905

تعالیٰ کی عبادت نہیں کی۔ قریش کے متعلق ایک مستقل سورت نازل ہوئی یعنی سورۃ القریش"۔ (226)

قریش پہلے افلاس اور معاشی تنگی میں رہے یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ کے پردادا عمرو بن عبد مناف نے جو غرباء پروری کی وجہ سے ہاشم کے لقب سے مشہور تھے اور اُس وقت قریش کے سردار تھے، اپنے قبیلے کے ہر خاندان کو تجارت کرنے کی ترغیب دی۔ اُس زمانہ میں تجارت کی راہ میں بڑی رکاوٹ قتل وغارت اور لوٹ مار کا سلسلہ تھا جو عرب میں عام تھا۔ کوئی بھی مالِ تجارت لے کر ایک جگہ سے بحفاظت دوسری جگہ نہیں جاسکتا تھا۔

حضرت ہاشم کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کعبہ کے متولی ہونے کی بناء پر چونکہ انہیں خاص عزت حاصل ہے تو کیوں نہ عرب قبائل سے قریش کے تجارتی سفر کے لیے حفاظت وامن کا معاہدہ کیا جائے۔ جب آپ نے یہ تجویز پیش کی تو دیگر قبائل نے اسے بخوشی منظور کر لیا۔ یوں آپ کو عرب قبائل میں نمایاں مقام حاصل ہو گیا۔

اس کے بعد آپ نے قرب وجوار کی حکومتوں سے تجارتی مراعات حاصل کیں جن میں شام، حبش، یمن، مصر، عراق، روم اور فارس کی حکومتیں شامل ہیں۔ اس طرح قریش کی تجارت تیزی سے ترقی کرتی چلی گئی اور ہاشم اور ان کے بھائی تاجروں کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ دیگر حکومتوں سے انہی روابط کی بناء پر انہیں "اصحابُ الایلاف" کہا گیا جس کے معنی "الفت پیدا کرنے والوں" کے ہیں۔

"ایلاف" کے معنی الفت، میل، شوق کے علاوہ معاہدہ اور ذمہ داری کے بھی ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "علماء کہتے ہیں کہ ایلاف سے مراد معاہدہ وذمہ ہے۔ یہ معاہدہ سب سے پہلے قریش کے لیے ہاشم بن عبد مناف نے حکمرانوں سے کیا"۔ (227)

غور کیا جائے تو معاہدہ بھی آپس میں الفت پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ ایلاف کا مذکورہ مفہوم تفسیر البحر المحیط اور تفسیر روح المعانی میں بھی مذکور ہے۔

اِلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ....:

"لِاِیْلٰفِ" کے لام کے متعلق مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ لام تعلیل کا ہے اور اس کا

226...معجم الکبیر، حدیث:16478

227...فتح الباری، مقدمہ، 1/200

تعلق "فَلْيَعْبُدُوْا" سے ہے۔

تو مفہوم یہ ہو گا کہ اگرچہ قریش پر رب تعالیٰ کی بیشمار نعمتیں ہیں لیکن اگر کسی اور نعمت کی بناء پر نہیں تو اسی ایک نعمت کی وجہ سے کہ اس کے فضل و کرم سے وہ تجارتی سفروں کی طرف مائل ہوئے، انہیں چاہیے کہ وہ اس گھر کے رب کی بندگی کریں۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "صحیح بات یہ ہے کہ یہ لام تعجب کے معنی میں ہے"۔ اب مفہوم یہ ہو گا کہ قریش کا رویہ بہت قابلِ تعجب ہے کہ ربِ کعبہ کے فضل و کرم سے وہ مکہ میں اکٹھے ہوئے، ان میں باہم الفت و یکجہتی پیدا ہوئی، انہیں خوشحالی اور امن ملا، ان کے دشمن ابرہہ کو تباہ کر دیا گیا پھر بھی وہ ربِ کعبہ کی بندگی اور حبیبِ کبریاء ﷺ کی اطاعت سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ ہم نے اہلِ مکہ سے ہاتھی والوں کو روک کر تباہ و برباد کر دیا تا کہ قریش اس امن والے شہر میں الفت اور یکجہتی سے زندگی گزاریں۔

مکہ مکرمہ ایسی خشک وادی ہے جہاں نہ زراعت ہے نہ باغات، اور سبزہ نہ ہونے کی بناء پر وہاں جانور بھی پالے نہیں جاسکتے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اہلیہ اور بیٹے کو اس مقام پر چھوڑتے وقت یہ دعا فرمائی تھی،

{رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَھْوِیْٓ اِلَیْھِمْ وَارْزُقْھُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّھُمْ یَشْکُرُوْنَ}

(پ13، ابراہیم:37)

"اے میرے رب! میں نے اپنی کچھ اولاد ایک نالے میں بسائی جس میں کھیتی نہیں ہوتی، تیرے حرمت والے گھر کے پاس۔ اے میرے رب! اس لیے کہ وہ نماز قائم رکھیں تو تُو لوگوں کے کچھ دل ان کی طرف مائل کر دے، اور انہیں کچھ پھل کھانے کو دے، شاید وہ احسان مانیں"۔

اس دعا کے طفیل اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ کو امن کا گہوارہ بنا دیا اور وہاں رہنے والوں کو پھل بھی عطا فرمائے۔ پہلے ذکر ہوا کہ ابتدا میں قریش کی معیشت کا انحصار زائرینِ کعبہ کے نذرانوں پر ہوتا تھا۔ اس لیے بسا اوقات تنگدستی اور فاقوں تک نوبت جا پہنچتی۔ پھر ہاشم کی حکمتِ عملی کی وجہ سے

قریش تجارت کی طرف مائل ہوئے۔

یہ سردیوں میں ملک یمن و حبشہ کی طرف تجارتی سفر کرتے اور وہاں سے ہندوستان اور جنوبی ایشیا کے ممالک کی مصنوعات خرید کر مکہ آتے۔ پھر گرمیوں میں رومی سلطنت کے ٹھنڈے علاقے شام میں جاکر وہ چیزیں فروخت کرتے اور وہاں سے مغربی ممالک کی مصنوعات خرید کر انہیں یمن میں فروخت کرتے، اور جو منافع ہوتا اسے امیر و غریب سب برابر تقسیم کر لیتے۔

اس زمانہ میں تجارتی قافلوں کو لوٹ لینا معمول کی بات تھی۔ مگر خانہ کعبہ کی برکت سے عرب کے قبائل قریش کے تجارتی قافلوں سے محصول یا ٹیکس بھی وصول نہ کرتے اور ان کی حفاظت بھی کرتے۔ نیز یمن اور شام کے درمیان وسیع صحرا عبور کرنے کا حوصلہ رب تعالیٰ نے قریش ہی کو عطا کیا۔ اس طرح رفتہ رفتہ مکہ عرب کا اہم تجارتی مرکز بن گیا اور قریش خوشحال ہوگئے۔

فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ...:

غور طلب بات یہ ہے کہ عرب کے جنگجو اور اکھڑ قبائل نے ہاشم کی محفوظ تجارت کے متعلق تجویز کیوں قبول کی؟ گردونواح کی حکومتیں انہیں تجارتی مراعات دینے پر کیوں رضامند ہوئیں؟ ہر سوال کا ایک ہی جواب ہے کہ محض کعبۃُ اللہ کے طفیل قریش کو یہ تمام نعمتیں حاصل ہوئیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس سورۂ مبارکہ میں قریش کو یہی دعوتِ فکر دی ہے کہ تمہارے رب نے تمہارے دلوں کو تجارت کی طرف مائل کیا، میرے گھر سے نسبت اور تعلق کی وجہ سے عرب قبائل تمہارا احترام کرتے ہیں، اسی بناء پر دوسری حکومتوں نے تمہیں عزت کا مقام دیا ہے، اس گھر کی دربانی کے سبب تمہارے قافلوں پر کوئی بری نگاہ نہیں ڈالتا، اور اس لق و دق صحرا میں دنیا بھر کی نعمتیں تمہیں میسر ہیں، تو جس گھر کے سبب تمہیں عزتیں و نعمتیں ملیں ہیں، اس گھر کے مالک کی بندگی کرنے لگ جاؤ۔ ارشاد ہوا:

”تو انہیں چاہیے کہ اس گھر کے رب کی بندگی کریں جس نے انہیں بھوک میں کھانا دیا اور انہیں ایک بڑے خوف سے امان بخشا“۔

بندوں کو چاہیے کہ وہ ہر نعمت کے حصول پر نعمت دینے والے رب کریم کا شکر ضرور ادا کریں خصوصاً دینی امور کے سبب عزت، شہرت، دولت یا کوئی اور نعمت ملے تو رب تعالیٰ کی بندگی کا بہت

زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔ کیونکہ قرآنی تعلیم یہ ہے کہ شکر ادا کرنے پر رب تعالیٰ مزید عطا فرماتا ہے۔

قریش کا سردی و گرمی میں دور دراز کے تجارتی سفر کا خوگر ہونا اسلام کی ترقی کا سبب بنا۔ وہ اس طرح کہ وہ سفر کی صعوبت و مشقت جھیلنے کے عادی ہو چکے تھے اس لیے جہاد اور ہجرت کے سفر ان کے لیے مشکل نہ ہوئے۔ انہوں نے ایک سمت مصر اور اندلس تک اور دوسری طرف ترکستان اور سندھ تک اسلام کا پرچم بلند کر دیا۔

اَلَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ...:

انسانی زندگی کے یہی دو مسائل اہم ترین بنیادی مسائل سمجھے جاتے ہیں۔ غذا اور امن۔ جانور بھی اپنے غذا دینے والے کی اطاعت کرتے ہیں، تو مشرکین جانوروں سے بھی بدتر ہوئے کہ ان عظیم نعمتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتے۔

{اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ یُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ اَفَبِالْبَاطِلِ یُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ یَكْفُرُوْنَ} (پ20، عنکبوت:67)

"کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ ہم نے حرمت والی زمین، پناہ بنائی اور ان کے آس پاس والے لوگ اُچک لیے جاتے ہیں۔ تو کیا باطل (یعنی بتوں) پر یقین لاتے ہیں اور اللہ کی دی ہوئی نعمت (حضور پر ایمان لانے) سے ناشکری کرتے ہیں"۔

قرآن کریم کا پیغام یہی ہے کہ جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے، وہ اسے دنیا اور آخرت میں امن و امان عطا فرماتا ہے اور جو ان کی نافرمانی کرتا ہے وہ اس سے امان چھین لیتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

{وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْیَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىٕنَّةً یَّاْتِیْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا یَصْنَعُوْنَ} (پ14، نحل:112)

"اور اللہ نے کہاوت بیان فرمائی، ایک بستی کہ امان و اطمینان سے تھی، ہر طرف سے اس کی روزی کثرت سے آتی تو وہ اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرنے لگی، تو اللہ نے اسے یہ سزا چکھائی کہ اسے بھوک اور ڈر کا پہناوا پہنایا، بدلہ اُن کے کیے کا"۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کی نعمتوں کی ناشکری کرنا عذابِ الٰہی کا سبب ہے۔ اس

کے برعکس اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور گناہوں سے سچی توبہ رب تعالیٰ کی نعمتوں کے نزول کا ذریعہ ہوتی ہے۔ حضرت ھود علیہ السلام کا ارشاد ہے: {وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ}

"اور اے میری قوم! اپنے رب سے معافی چاہو، پھر اس کی طرف رجوع لاؤ، وہ تم پر زور کا پانی (بارش) بھیجے گا اور تم میں جتنی قوت ہے اس سے اور زیادہ دے گا، اور جرم کرتے ہوئے روگردانی نہ کرو"۔(پ13، ھود:52۔)

ائمہ فرماتے ہیں، دشمن کا خوف ہو یا کوئی اور مصیبت، اس سورت کا پڑھنا حفاظت اور امان کا باعث ہے۔(حصن حصین، تفسیر مظہری)

تفسیر سورۃ الماعون

سورۃ الماعون مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں سات آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ ؕ﴿۱﴾ فَذٰلِکَ الَّذِیۡ یَدُعُّ الۡیَتِیۡمَ ۙ﴿۲﴾ وَ لَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ ؕ﴿۳﴾ فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ ۙ﴿۴﴾ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنۡ صَلَاتِہِمۡ سَاہُوۡنَ ۙ﴿۵﴾ الَّذِیۡنَ ہُمۡ یُرَآءُوۡنَ ۙ﴿۶﴾ وَ یَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ ٪﴿۷﴾

"اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا (ہے)"

"بھلا دیکھو تو جو دین کو جھٹلاتا ہے، پھر وہ وہ ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے، اور مسکین کو کھانا دینے کی رغبت نہیں دیتا، تو ان نمازیوں کی خرابی ہے جو اپنی نماز سے بھولے بیٹھے ہیں، وہ جو دکھاوا کرتے ہیں اور برتنے کی چیز مانگے نہیں دیتے"۔ (کنز الایمان از اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ)

لفظی ترجمہ:

اَ	رَءَیۡتَ	الَّذِیۡ	یُکَذِّبُ	بِ	الدِّیۡنِ
کیا	دیکھا تم نے	(اس کو) جو	جھٹلاتا ہے	کو	دین

فَ	ذٰلِکَ	الَّذِیۡ	یَدُعُّ	الۡیَتِیۡمَ
پھر	وہ	(وہ ہے) جو	دھکے دیتا ہے	یتیم (کو)

وَ	لاَ	یَحُضُّ	عَلٰی	طَعَام	الۡمِسۡکِیۡنِ
اور	نہیں	آمادہ کرتا وہ	پر	کھانا دینے	مسکین (کو)

فَ	فَوَیۡلٌ	لِّ	الۡمُصَلِّیۡنَ
پس	خرابی (ہے)	واسطے	نمازیوں (کے)

سَاهُوْنَ	هِمْ	صَلَاتِهِمْ	عَنْ	هُمْ	الَّذِیْنَ
غافل (ہیں)	اپنی	نماز	سے	وہ	جو

یُرَآءُوْنَ	هُمْ	الَّذِیْنَ
دکھاوا کرتے ہیں	وہ	وہ لوگ (کہ)

الْمَاعُوْنَ	یَمْنَعُوْنَ	وَ
برَتنے کی چیز (سے)	جو منع کرتے ہیں	اور

ربط و مناسبت:

سورۃ القریش میں اللہ تعالیٰ نے اپنی بندگی کرنے کا حکم دیا تھا، اس سورت میں ان برائیوں کا ذکر ہے جو رب تعالیٰ کی بندگی میں رکاوٹ ہیں۔ ان برائیوں میں دو نشانیاں کافر کی ہیں۔ یتیم کو دھکے دینا اور مسکین کو کھلانے کی ترغیب نہ دینا۔ اور تین نشانیاں منافق کی ہیں۔ نماز سے غفلت، اعمال میں دکھاوا اور استعمال کی عام چیز کسی کے مانگنے پر نہ دینا۔

پچھلی سورت میں قریش پر انعامات کا ذکر ہوا۔ اور ان میں سے اکثر قیامت اور جزا و سزا پر ایمان نہ رکھتے تھے جبکہ اس سورت میں جزا و سزا کے منکروں کو رب تعالیٰ نے اپنے عذاب سے ڈرایا ہے۔

سابقہ سورت میں رب تعالیٰ کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا، اس سورت میں ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے جو نماز پڑھنے میں سستی اور غفلت کا ارتکاب کرتے ہیں۔

سابقہ سورت میں قریش کو بھوک میں کھانا دینے کا ذکر تھا، یہاں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتے۔

شانِ نزول:

ابوجہل مردود کی عادت تھی کہ جب کوئی مالدار بیمار ہوتا تو وہ اس کے پاس آکر بیٹھتا اور کہتا، تم اپنے یتیموں کو میرے سپرد کر دو اور انکے حصے کا مال میرے پاس امانت رکھ دو۔ میں ان کی خبر گیری اور

خدمت گزاری بخوبی کروں گا اور دوسرے وارث ان پر زیادتی نہیں کر سکیں گے۔ پھر جب ان کا مال اپنے قبضے میں لے لیتا تو ان یتیموں کو دھتکار دیتا اور وہ بیچارے دربدر بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاتے۔

اسی طرح ایک دن ایک یتیم نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور اُس ملعون کی شکایت کی۔ آپ اس ملعون کے پاس تشریف لے گئے اور اسے قیامت کے حساب وعذاب سے ڈرایا۔ اس نے آپ کی ایک نہ سنی بلکہ قیامت کو جھٹلایا۔ آپ رنجیدہ ہو کر وہاں سے واپس تشریف لے آئے۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔[228]

اَرَءَيْتَ الَّذِىْ...:

ارشاد ہوا: "بھلا دیکھو تو جو دین کو جھٹلاتا ہے"۔

"اَرَءَيْتَ" کا مفہوم یہ ہے کہ "کیا تم جانتے ہو کہ قیامت کے دن کو جھٹلانے والا کون ہے؟"۔ اگرچہ الفاظ سوالیہ انداز میں ہیں لیکن ان کا مقصد انتہا درجے کا تعجب ہے۔ یعنی اگر تم نہیں جانتے تو جان لو کہ "وہ، وہ ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے، اور مسکین کو کھانا دینے کی رغبت نہیں دیتا"۔

قرآنی اصطلاح میں "الدین" سے مراد دینِ اسلام بھی ہے اور قیامت میں جزا و سزا بھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے پہلا معنی مراد لیا ہے۔ گویا مذکورہ بُرے اعمال ان لوگوں کے ہیں جو دینِ اسلام ہی کے منکر ہیں۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ قیامت اور جزا و سزا کا انکار درحقیقت دین ہی کا انکار ہے۔

بعض نے کہا، یہ خطاب رسولِ معظم ﷺ سے ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ خطاب ہر عقلمند انسان کے لیے ہے۔ یعنی اے عقل والو! کیا تم اسے جانتے ہو جو روشن دلائل اور واضح براہین کے باوجود قیامت کو جھٹلاتا ہے اور عقلمند ہونے کا دعویدار بھی ہے؟

کسی عقلمند کے شایانِ شان نہیں کہ وہ دنیاوی لالچ کے بدلے خود کو آخرت کے عذاب میں مبتلا کرے اور یہ بھی عقل کے لائق نہیں کہ چند روزہ فانی زندگی کے بدلے میں آخرت کی ہمیشہ باقی رہنے والی زندگی کو قربان کر دیا جائے۔

228... تفسیر عزیزی، ماعون، تحت الآیۃ: 1

اس آیت کے شانِ نزول کے حوالے سے اگرچہ بعض کافروں کا ذکر آیا ہے لیکن امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت ہر اس شخص کے متعلق نازل ہوئی جو قیامت کو جھٹلاتا ہے۔ کیونکہ انسان کا رب تعالیٰ کی اطاعت کرنا اور بُرے اعمال سے بچنا دراصل ثواب کے شوق اور عذاب کے خوف کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جب بندہ قیامت کا منکر ہو گا تو وہ خواہشاتِ نفس اور دنیاوی لذتوں کو ہرگز نہیں چھوڑے گا۔ ثابت ہوا کہ قیامت کا انکار ہر قسم کے کفر اور تمام گناہوں کی جڑ ہے۔[229]

الَّذِیۡ یَدُعُّ الۡیَتِیۡمَ:

اللہ تعالیٰ نے دین کی تکذیب کرنے والے کے دو بُرے کام بیان فرمائے ۔ ایک کا تعلق "کرنے" سے ہے، یعنی "وہ یتیم کو دھکے دیتا ہے"۔ اور دوسرے کا تعلق "نہ کرنے" سے ہے، یعنی "وہ مسکین کو کھانا دینے کی رغبت نہیں دیتا"۔

"فَذٰلِکَ" میں 'فا' سبب کے لیے ہے یعنی ان بُرے کاموں کا سبب اس کا کفر ہے۔ خدا کے بندوں پر ظلم کرنا اسی شخص کا معمول ہوسکتا ہے جس کا آخرت اور جزاوسزا پر یقین نہ ہو۔ "یَدُعُّ" میں 'عین' پر تشدید سے واضح ہوتا ہے کہ یتیم کو دھکے دینا ان کا معمول ہے۔ بلاشبہ دین کے منکر ہی گناہوں پر اَڑے رہتے ہیں۔

یہاں یہ دو کام مثال کے طور پر بیان ہوئے ہیں ورنہ سب جانتے ہیں کہ قیامت کا منکر صرف انہی دو کاموں پر اکتفا نہیں کرتا۔ ان دو برائیوں کے پیچھے منکرینِ جزاوسزا کی گمراہ سوچ اور پورا شیطانی طرزِ زندگی چھپا ہے۔ یہ برائیاں اس لیے ذکر کی گئیں کہ یہ شریعت کے علاوہ انسانی مروت کے لحاظ سے بھی قابلِ نفرت ہیں اور ان کاموں کو وہی کرتا ہے جس کے رگ وپے میں مال کی شدید محبت رچی بسی ہوئی ہو، اسی لیے وہ یتیم کا مال کھانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

{بَلۡ لَّا تُکۡرِمُوۡنَ الۡیَتِیۡمَ o وَلَا تَحٰٓضُّوۡنَ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ o وَتَاۡکُلُوۡنَ التُّرَاثَ اَکۡلًا لَّمًّا o وَّتُحِبُّوۡنَ الۡمَالَ حُبًّا جَمًّا}

"بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے، اور آپس میں ایک دوسرے کو مسکین کے کھلانے کی رغبت

229... تفسیر کبیر، ماعون، تحت الآیۃ:1

نہیں دیتے، اور میراث کا مال ہَپ ہَپ کھاتے ہو، اور مال کی نہایت محبت رکھتے ہو"۔(پ30، فجر:17-20)

جانِ کائنات رحمتِ عالم ﷺ نے فرمایا: جس نے مسلمانوں میں سے کسی یتیم کو اپنے پاس رکھا اور اسے اپنے کھانے پینے میں شامل کیا، اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل فرمائے گا سوائے اس کے کہ اس کا کوئی گناہ قابلِ مغفرت نہ ہو۔(ترمذی)

وَلَا يَحُضُّ عَلٰى...:

مسکین وہ ہوتا ہے جو کھانے اور پہننے کے لیے مانگنے کا محتاج ہو۔ رب تعالیٰ نے کھانے کی نسبت مسکین کی طرف فرمائی تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ کھانا اُس مسکین کا حق ہے اور اُسے کھانا دینے والا کوئی احسان نہیں کرتا بلکہ اُسی کا حق اس کو دیتا ہے۔

{وَفِيٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ}(پ26، ذاریات:19)

"اور ان کے مالوں میں حق ہے منگتا اور بے نصیب کا"۔

منگتا وہ ہے جو اپنی حاجت کے لیے مانگے اور محروم وہ ہے جو حاجت مند ہو مگر حیا کے باعث سوال نہ کرے۔ تو جو شخص مالدار ہونے کے باوجود مسکین کو اس کا حق نہیں دیتا اور نہ ہی دوسروں کو اس کی ترغیب دیتا ہے، اس کا طرزِ عمل اس کے بخیل، سنگ دل اور کمینہ ہونے کی علامت ہے۔

اس آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ "وہ مسکین کو کھانا نہیں کھلاتا" بلکہ ارشاد ہوا: "وہ مسکین کو کھانا دینے کی رغبت نہیں دیتا"۔ جب وہ دوسرے کے مال میں بخل سے کام لے رہا ہے کہ وہ اپنا مال مسکین کے لیے خرچ نہ کریں تو وہ خود اپنے مال سے مسکین کو کیونکر کھلائے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آخرت کا منکر ہے۔

اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور آخرت پر ایمان رکھنے والوں کی صفات قرآن کریم میں یہ بیان ہوئیں ہیں کہ وہ خود بھی راہِ حق میں مشکلات پر صبر کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے ہیں نیز وہ خود بھی مومنوں سے شفقت و مہربانی کا برتاؤ کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اسی بات کی نصیحت کرتے ہیں۔ ارشاد ہوا:

{وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ٥ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ}

"اور انہوں نے آپس میں صبر کی وصیتیں کیں اور آپس میں مہربانی کی وصیتیں کیں۔ یہ دہنی طرف والے ہیں"۔(پ30،بلد:17-18،)

نبی کریمﷺ کی خدمت میں سوال کیا گیا، اسلام میں کون سا عمل افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: تم کھانا کھلاؤ اور سلام کرو خواہ تم اسے پہچانتے ہو یا نہیں۔[230]

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ...:

پھر ارشاد ہوا: "تو اُن نمازیوں کی خرابی ہے جو اپنی نماز سے بھُولے بیٹھے ہیں"۔

"اس سے مراد منافقین ہیں جو تنہائی میں نماز نہیں پڑھتے کیونکہ اس کے معتقد نہیں اور لوگوں کے سامنے نمازی بنتے ہیں اور اپنے آپ کو نمازی ظاہر کرتے ہیں اور دکھانے کے لیے اُٹھ بیٹھ لیتے ہیں"۔[231]

اس سورت کی ابتدائی آیات میں کفارِ مکہ کا ذکر تھا اب منافقینِ مدینہ کا حال بیان کیا جارہا ہے۔ اہلِ تفسیر نے لکھا ہے کہ اس سورت کی پہلی تین آیات مکہ میں اور آخری چار آیات مدینہ میں نازل ہوئیں۔ بے نمازیوں کے لیے یہ وعید پڑھیے۔

{فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا} (پ16،مریم:59)

"تو اُن کے بعد ان کی جگہ وہ ناخلف آئے جنھوں نے نمازیں گنوائیں اور اپنی خواہشوں کے پیچھے ہوئے تو عنقریب وہ دوزخ میں غیّ کا جنگل پائیں گے"۔

غیّ دوزخ کے نچلے حصے میں ایک کنواں ہے جس میں اہلِ دوزخ کی پیپ گرتی ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ جہنم کی سب سے زیادہ گرم اور گہری وادی ہے اور اس میں ایک کنواں ہے۔ جب جہنم کی آگ بجھنے پر آتی ہے تو اللہ عزوجل اس کنوئیں کو کھول دیتا ہے جس سے وہ بدستور بھڑکنے لگتی ہے۔ یہ کنواں بے نمازیوں، زانیوں، شرابیوں، سود خوروں اور والدین کو ایذا دینے والوں کے لیے ہے۔

قرآن کریم میں منافقوں کی ایک نشانی یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ نماز پڑھنے میں سستی کرتے ہیں

230...بخاری، کتاب الایمان، اطعام الطعام، حدیث:12

231...خزائن العرفان، ماعون، تحت الآیۃ:4

اور اسے بوجھ سمجھتے ہیں۔ ارشاد ہوا:

{وَاِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ}(پ5،نساء:142)

”اور جب نماز کو کھڑے ہوں تو ہارے جی (دل) سے، لوگوں کو دکھاوا کرتے ہیں“۔

صدرُ الشریعہ فرماتے ہیں: ”نماز کو مطلقاً چھوڑ دینا تو سخت ہولناک بات ہے، نماز قضا کرنے والوں کے لیے رب تعالیٰ فرماتا ہے، ”خرابی ہے ان نمازیوں کے لیے جو اپنی نمازوں سے بے خبر ہیں، وقت گزار کر پڑھنے اٹھتے ہیں“۔(پ30،ماعون:5)

جہنم میں ایک وادی ہے جس کی سختی سے جہنم بھی پناہ مانگتا ہے اس کا نام ”ویل“ ہے۔ قصداً نماز قضا کرنے والے اس کے مستحق ہیں“۔(بہارِ شریعت)[232]

رسول کریم ﷺ سے {عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ} کا مطلب پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: اس کا مطلب ہے نماز کو ضائع کر دینا۔

اس سے معلوم ہوا کہ مذکورہ آیت سے مراد نماز ضائع کر دینا ہے خواہ نماز قصداً وقت پر نہ پڑھی جائے، یا دکھاوے کے لیے پڑھی جائے یا بے یقینی اور غفلت سے پڑھی جائے یا نماز کے فرائض وواجبات کو صحیح طریقے سے ادا نہ کیا جائے، ان تمام صورتوں میں نماز ضائع ہو جاتی ہے۔ پس ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ کسی صحیح العقیدہ عالم سے نماز کا طریقہ اور ضروری مسائل سیکھے تاکہ نماز کی حفاظت ہو۔

اَلَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ:

ارشاد ہوا: ”وہ جو دکھاوا کرتے ہیں“۔ اس سے مراد منافقین ہیں جو اور لوگ موجود ہوتے تو دکھاوے کی نماز پڑھ لیتے اور کوئی دیکھنے والا نہ ہوتا تو نہیں پڑھتے۔

ریاکار لوگوں پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اخلاص اور خشوع سے عبادت کرتا ہے حالانکہ اس کا دل اخلاص اور للّٰہیت سے خالی ہوتا ہے۔ ریاکار عبادت کے بدلے لوگوں سے تعریف کا خواہشمند ہوتا ہے اور دنیاوی مفادات کا طلبگار رہتا ہے۔ چونکہ ریاکار کی عبادت اللہ تعالیٰ کی بجائے لوگوں کو دکھانے کی خاطر

232...بہارِ شریعت، حصہ 3، ج1، ص434

ہوتی ہے اس لیے حدیث پاک میں ریا کو "شرکِ اصغر" کہا گیا ہے۔

ریا کا خیال شیطانی وسوسہ ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ نیت میں اخلاص پیدا کریں، ریا اور اخلاص پر آیات و احادیث کا مطالعہ کریں اور شیطان کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے رہیں۔

ایک حدیث میں ارشاد ہوا: جہنم میں ایک ایسی وادی ہے جس سے خود جہنم روزانہ چار سو مرتبہ پناہ مانگتی ہے۔ یہ وادی امتِ محمدیہ کے ریاکاروں کے لیے ہے۔ (طبرانی)

وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ:

ارشاد ہوا: "اور برتنے کی چیز مانگے نہیں دیتے"۔ یعنی عام ضرورت کی معمولی چیز لوگوں کو استعمال کے لیے نہیں دیتے۔

اس کی تفسیر میں صحابہ کرام و تابعین کے دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ ماعون سے مراد زکوٰۃ ہے کیونکہ ماعون کے اصل معنی تھوڑی چیز کے ہیں اور زکوٰۃ بھی مال کا تھوڑا سا حصہ ہوتا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ماعون سے مراد عام استعمال کی ایسی چیزیں ہیں جو عموماً ایک دوسرے کو عاریۃً دی جاتی ہیں جیسے ڈول، کلہاڑی، کھانے پکانے کے برتن، پانی، نمک وغیرہ۔ خلاصہ یہ کہ جس نمازی میں تین برائیاں ہونگی اس کے لیے خرابی ہے۔

اول: وہ نماز سے غافل رہتا ہو، نہ وقت کا خیال نہ خشوع و خضوع۔

دوم: نماز اخلاص سے خالی ہو اور لوگوں کو دکھانے کے لیے پڑھی جائے۔

سوم: نہ زکوٰۃ دے اور نہ لوگوں کو ضرورت کا معمولی سامان عاریۃً دے۔

تفسیر سورۃ الکوثر

سورۃ الکوثر مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں تین آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ ؕ﴿۱﴾ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَ انۡحَرۡ ؕ﴿۲﴾ اِنَّ شَانِئَکَ ہُوَ الۡاَبۡتَرُ ﴿۳﴾

”اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا (ہے)“

”اے محبوب! بیشک ہم نے تمہیں بیشمار خوبیاں عطا فرمائیں تو تم اپنے رب کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو۔ بیشک جو تمہارا دشمن ہے وہی ہر خیر سے محروم ہے“۔

(کنز الایمان از اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ)

لفظی ترجمہ:

اِنَّا	اَعۡطَیۡنَا	کَ	الۡکَوۡثَرَ
بیشک ہم	عطا کی ہم نے	آپ (کو)	خیرِ کثیر یا کثیر خوبیاں

فَ	صَلِّ	لِ	رَبِّ	کَ	وَ	انۡحَرۡ
پس	نماز پڑھیں	لیے	رب	اپنے (کے)	اور	قربانی کریں

اِنَّ	شَانِئَ	کَ	ھُوَ	الۡاَبۡتَرُ
بیشک	دشمن	آپ (کا)	وہی	بے نسل ہے

ربط و مناسبت:

اس سے قبل سورۃ الماعون میں رب تعالیٰ نے منافقوں کی چار بری صفات بیان فرمائی تھیں۔ بخل، نماز نہ پڑھنا، ریاکاری اور زکوۃ نہ دینا۔ اس سورت میں اس کے مقابل چار بہترین اوصاف کا ذکر ہے۔

بخل کے مقابل فرمایا گیا، ہم نے آپ کو بیشمار نعمتیں عطا فرمائی ہیں لہٰذا آپ بھی اپنے امتیوں کو کثرت سے نعمتیں عطا فرمائیے۔

منافقین کے نماز نہ پڑھنے کے مقابل ارشاد ہوا: فَصَلِّ۔ یعنی ہمیشہ نماز پڑھتے رہیے۔ ریاکاری کے مقابل فرمایا لِرَبِّکَ۔ یعنی لوگوں کو دکھانے کے لیے نہیں بلکہ صرف اپنے رب کی رضا کی خاطر نماز پڑھیے۔

یوں ہی زکوٰۃ نہ دینے کے مقابل فرمایا، وَانۡحَرۡ۔ یعنی قربانی کر کے اس کا گوشت رضائے الٰہی کی خاطر دوسروں کو دیجیے۔

آخری آیت سے یہ پیغام بھی ملتا ہے کہ وہ منافق لوگ جن میں چار بری خصلتیں ہیں وہ ہر خیر سے محروم ہیں اور مرنے کے بعد ان کا نام ونشان تک باقی نہ رہے گا جبکہ آپ ﷺ کو خیرِ کثیر کا سمندر عطا ہوا ہے اور آپ کے متبعین بھی خوش نصیب ہیں جو اس خیرِ کثیر سے فیض یاب ہوتے رہیں گے اور آپ ﷺ کا ذکر ہمیشہ باقی رہے گا۔

شانِ نزول:

مفسرین فرماتے ہیں کہ جس شخص کا بیٹا نہ ہوتا، اہلِ عرب اُسے اَبۡتَرۡ (یعنی جس کی نسل ختم ہو جائے) کہا کرتے۔ جب حضرت قاسم (علیٰ ابیہ وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کے وصال کے بعد نبی کریم ﷺ کے دوسرے صاحبزادے حضرت عبد اللہ (علیٰ ابیہ وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کا انتقال ہوا تو ابولہب نے کہا، ''آج محمد (ﷺ) کی نسل منقطع ہو گئی ہے''۔ عاص بن وائل نے بھی کہا، ''ان کا کوئی بیٹا نہیں جو ان کا جانشین ہو، جب ان کا انتقال ہو گا تو ان کا ذکر ختم ہو جائے گا''۔ اور بھی کئی کافر اسی قسم کے دل آزار جملے کہا کرتے۔

ان حالات میں رب تعالیٰ نے یہ سورہ مبارکہ نازل فرما کر اپنے محبوب رسول ﷺ کو تسلی دی کہ اے حبیب! ہم نے تمہیں کثیر نعمتیں اور بیشمار خوبیاں عطا کی ہیں۔ نرینہ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے تمہیں طعنے دینے والے اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ نہ صرف تمہاری نسبی اولاد دنیا میں رہے گی بلکہ تمہارے نام لیوا، عاشق اور غلام اس قدر کثیر تعداد میں دنیا میں ہونگے کہ زمین کے ہر ہر گوشے میں تمہارے ذکر کی محافل سجائیں گے، اور صبح وشام تمہاری بارگاہ میں درود وسلام کے نذرانے پیش کیا

کریں گے۔اے محبوب ﷺ! میں تیرا ذکر بلند کردوں گا اور ان کا نام نشان مٹا دوں گا جو تجھ سے عداوت رکھتے ہیں۔ محدث بریلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

مٹ گئے مٹتے ہیں مٹ جائیں گے اعداء تیرے
نہ مٹا ہے نہ مٹے گا کبھی چرچا تیرا

کوثر کے معانی:

"کوثر" کثرت سے ماخوذ ہے جس میں بہت زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔اس بناء پر کوثر سے مراد ہے کسی چیز کا اس قدر کثیر وزیادہ ہونا کہ جس کا اندازہ لگانا ممکن نہ ہو۔ گویا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیبِ لبیب ﷺ کو جو نعمت و کمال عطا فرمایا، وہ بے حد و بے حساب عطا فرمایا۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کوثر کی تفسیر میں فرمایا، کوثر وہ خیرِ کثیر (یعنی بیشمار بھلائیاں اور خوبیاں) ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی ہیں۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا، بعض لوگ کہتے ہیں کہ کوثر سے مراد جنت کی ایک نہر ہے۔ انہوں نے جواب دیا، جنت کی وہ نہر جس کا نام کوثر ہے، وہ بھی اسی خیر کثیر میں داخل ہے۔[233]

مشہور تابعین حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے بھی کوثر کی تفسیر میں فرمایا، اس سے مراد دنیا و آخرت کی خیر کثیر ہے اور اس میں جنت کی نہر کوثر اور حوضِ کوثر بھی داخل ہیں۔[234]

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کافروں نے مختلف الفاظ سے نبی کریم ﷺ کو برا کہا لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کی ایسی تعریف فرمائی جس میں تمام فضائل داخل ہیں۔ لفظ "کوثر" کے ساتھ کسی قید کا اضافہ نہیں کیا کہ فلاں شے میں کثرت ہے اور فلاں میں نہیں۔ لہٰذا اس میں دنیا اور آخرت کی تمام بھلائیاں شامل ہیں۔[235]

ان تفاسیر کی روشنی میں مجددِ دین وملت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ترجمۂ قرآن میں کوثر کا ترجمہ "بیشمار خوبیاں" فرمایا ہے۔ صدرُ الافاضل مولانا سید محمد نعیم الدین

233...بخاری کتاب التفسیر
234...تفسیر ابن کثیر، کوثر، تحت الایۃ:1
235...تفسیر کبیر، کوثر، تحت الایۃ:1

مرادآبادی رحمہ اللہ لکھتے ہیں،

"(اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو) فضائلِ کثیرہ عنایت کر کے تمام مخلوق پر افضل کیا۔ حسنِ ظاہر بھی دیا حسنِ باطن بھی، نسبِ عالی بھی نبوت بھی، کتاب بھی حکمت بھی، علم بھی شفاعت بھی، حوضِ کوثر بھی مقامِ محمود بھی، کثرتِ امت بھی اعدائے دین پر غلبہ بھی، کثرتِ فتوح بھی اور بیشمار نعمتیں اور فضیلتیں بھی جن کی انتہا نہیں"۔ (236)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن آقا و مولیٰ ﷺ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے کہ آپ پر اچانک نزولِ وحی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ پھر آپ نے مسکراتے ہوئے سر مبارک اٹھایا۔ ہم نے عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! آپ کے مسکرانے کا سبب کیا ہے؟ فرمایا، ابھی ابھی مجھ پر ایک سورت نازل ہوئی ہے۔ پھر آپ نے سورۃ الکوثر تلاوت کی اور فرمایا، کیا تم جانتے ہو کہ کوثر کیا ہے؟ ہم نے عرض کی، اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

"یہ جنت کی ایک نہر ہے جس کا میرے رب نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے۔ اس میں خیر کثیر ہے اور وہ حوض ہے جس پر قیامت کے دن میری امت آئے گی۔ اس کے کناروں پر پینے کے برتن اس قدر ہونگے جتنے آسمان کے ستارے"۔ (237)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث میں ہے کہ اس حوض میں جنت سے دو پرنالے گر رہے ہونگے۔ (صحیح مسلم کتاب الفضائل)

تفاسیر میں ہے، حوضِ کوثر کو یہی دو پرنالے نہر کوثر کے پانی سے بھر دیں گے۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ لفظ کوثر کی جامع تفسیر "خیر کثیر" ہے اور اس خیر کثیر میں وہ حوضِ کوثر بھی داخل ہے جس سے آقا و مولیٰ ﷺ میدانِ حشر میں اپنی امت کو سیراب فرمائیں گے۔ آخری روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اصل نہر کوثر جنت میں ہے اور اس نہر سے دو پرنالوں کے ذریعے حوضِ کوثر میں پانی ڈالا جائے گا۔

آبِ کوثر کی فضیلت میں آقا و مولیٰ ﷺ کا فرمانِ ذیشان ہے، اس حوض سے پینے والا جنت میں

236... خزائن العرفان، کوثر، تحت الآیۃ:1، ص1122

237... بخاری، کتاب التفسیر، حدثنا ادم، حدیث:4964

جانے تک پیاسا نہیں ہو گا۔[238]

ایک دن آقا و مولیٰ ﷺ منبر پر تشریف لائے اور ارشاد فرمایا: میں حوضِ کوثر پر تمہارا پیش رو ہوں گا اور تمہارے حق میں گواہی دوں گا۔ بیشک اللہ تعالیٰ کی قسم! میں اب بھی اپنے حوض کو دیکھ رہا ہوں، اور بیشک مجھے زمین کے تمام خزانوں کی چابیاں دے دی گئیں ہیں، اور بیشک اللہ تعالیٰ کی قسم! مجھے تم پر یہ خوف نہیں کہ تم میرے بعد شرک کروگے لیکن مجھے یہ خطرہ ہے کہ تم دنیا کی محبت میں مبتلا ہو جاؤ گے۔[239]

اس حدیث پاک سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آقا و مولیٰ ﷺ اپنی امت کے اعمال پر گواہ ہیں اور گواہی بغیر دیکھے مقبول نہیں ہوتی۔ آپ صرف امت کے اعمال ہی ملاحظہ نہیں فرماتے بلکہ حوضِ کوثر بھی آپ کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔

حوضِ کوثر کے متعلق اس قدر صحیح احادیث آئی ہیں جو تواتر کو پہنچتی ہیں۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے حوضِ کوثر کے راوی صحابہ کرام کی تعداد پچاس سے زائد بتائی ہے۔[240]

بعض مفسرین کے نزدیک کوثر سے مراد قرآن کریم، بعض کے نزدیک دینِ اسلام، بعض کے نزدیک شفاعت اور مقامِ محمود ہے، بعض کے نزدیک علوم نبوت ہیں اور بعض کے نزدیک اس سے مراد کثیر اولاد ہے۔

آخر الذکر قول کے متعلق امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ایسی نسل عطا فرمائے گا جو ہمیشہ باقی رہے گی۔ تم دیکھو! کتنے اہلِ بیت شہید کیے گئے، اس کے باوجود دنیا ان سے بھری ہوئی ہے"۔[241]

غیب بتانے والے آقا کریم ﷺ کے ایک ارشادِ پاک سے حوضِ کوثر، قرآنِ مجید اور اہلبیتِ اطہار کے درمیان باہم خاص ربط و تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ ارشاد ہوا:

238...مسند امام احمد بن حنبل، حدیث:12478

239...بخاری، کتاب الرقاق، حدیث:6426

240...تفسیر مظہری، کوثر، تحت الایۃ:1

241...تفسیر کبیر، کوثر، تحت الایۃ:1

"میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، جب تک تم انہیں مضبوط تھامے رہو گے گمراہ نہیں ہو گے۔ ایک ہے اللہ کی کتاب، یہ اللہ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک تنی ہے۔ اور دوسری چیز ہے میری اولاد جو میرے اہلبیت ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہیں ہونگے حتیٰ کہ میرے پاس حوضِ کوثر پر آجائیں گے"۔ (242)

علامہ اسماعیل حقی رحمہ اللہ ایسے متعدد اقوال ذکر کر کے خلاصہ لکھتے ہیں:

"یہ بات ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو ظاہری و باطنی جو نعمتیں بھی عطا فرمائی ہیں وہ سب کوثر کے مفہوم میں داخل ہیں۔ ظاہری نعمتوں سے دنیا و آخرت کی تمام بھلائیاں مراد ہیں اور باطنی نعمتوں سے مراد وہ علومِ لدنیہ ہیں جو بغیر کوشش کے محض رب تعالیٰ کے کرم سے آپ ﷺ کو عطا ہوئے"۔ (243)

اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ:

اس سورت کے آغاز میں لفظ "اِنَّا" فرمایا گیا جس میں "اِنَّ" حرفِ تاکید ہے جو قسم کے قائم مقام ہوتا ہے یعنی جو مضمون بیان ہو رہا ہے اس میں ہرگز کسی قسم کا شک نہ کیا جائے۔ لفظ "اِنَّا" جمع کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور عظمت و شان کے اظہار کے لیے بھی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اس لیے یہاں دوسری صورت یعنی تعظیم مراد ہو گی۔ اب اس آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ آپ کو کوثر عطا فرمانے والا، تمام مخلوق کا خالق و مالک اور عظمت و قدرت والا ہے۔

یہاں عطیہ کو لفظ "کوثر" سے تعبیر کیا گیا جو کہ کثرت میں مبالغہ ہے اور اس عطیہ کی عظمت کی دلیل ہے نیز یہ کہ خالقِ کائنات کی طرف سے عطا کیے جانے کی وجہ سے اس عظیم عطیہ کی عظمت و کمال میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ مقامِ غور ہے کہ عطیہ عظمت والا ہے، عطا فرمانے والا بڑی عظمت والا ہے تو وہ ہستی کس قدر عظیم ہو گی جسے عظمت والے رب نے براہِ راست خطاب فرما کر اُس عظیم عطیہ سے نوازا ہے۔

عربی زبان میں اِیتَاء اور اَعطاء دونوں کا معنی دینا اور عطا کرنا ہے۔ اَعْطاء میں ملکیت کا معنی پایا جاتا

242...مسند امام احمد بن حنبل، حدیث:11354

243...روح البیان، کوثر، تحت الآیۃ:1

ہے جبکہ اِیتاء میں یہ معنی نہیں ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں سلطنت و بادشاہت کے لیے دعا کی،

{هَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ}

"مجھے ایسی سلطنت عطا کر کہ میرے بعد کسی کو لائق نہ ہو"۔(پ23،ص:35)

تو رب تعالیٰ نے انہیں ایسی سلطنت عطا فرما دی اور ارشاد ہوا:

{هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَیْرِ حِسَابٍ}(پ23،ص:39)

"یہ ہماری عطا ہے، اب تو چاہے تو احسان کر یا روک رکھ، تجھ پر کچھ حساب نہیں"۔

اسی طرح رب تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اپنے محبوب رسول ﷺ کو کوثر عطا فرما کر اس کا مالک بنا دیا، اب آپ جس کو چاہیں اس کوثر سے کچھ عطا فرما دیں اور جس کو چاہیں کچھ نہ دیں۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ عربی میں "اَعطاء" اُس عطا کرنے کو کہتے ہیں جو دینے والا محض اپنے فضل و کرم سے دے، وہ کسی چیز کا بدلہ نہ ہو۔ چنانچہ اس آیت کریمہ سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ رب کریم کا اپنے حبیب ﷺ کو "کوثر" عطا فرمانا کسی عمل کی جزا نہیں ہے بلکہ محض اس کا فضل و کرم ہے اور حضور ﷺ کی شانِ محبوبیت کا اعلان ہے۔

ایک اور قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے یہاں ماضی کا صیغہ ذکر کیا، کہ "ہم نے آپ کو کوثر عطا فرما دیا"۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سرکارِ دوعالم ﷺ کو "کوثر" ماضی میں عطا کیا جا چکا ہے۔ نیز خطاب میں "ک" فرمایا گیا تاکہ واضح ہو جائے کہ یہ عطا صرف حضور ﷺ کے لیے ہے، اس میں ان کا کوئی شریک نہیں۔ جس کو اس عطا کی برکتیں نصیب ہو نگی وہ صرف حضور ﷺ ہی کے طفیل ہوں گی۔

آقا و مولیٰ ﷺ کا یہ فرمانِ ذیشان اسی حقیقت کا بیان ہے،

اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَ اللّٰهُ یُعْطِیْ۔ بیشک اللہ عطا فرماتا ہے اور میں اس کی نعمتیں تقسیم کرتا ہوں۔[244]

ایک اور قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ قرآن حکیم میں جہاں جہاں بھی رسولِ معظم ﷺ کی شان و عظمت بیان ہوئی ہے وہاں پہلے رب تعالیٰ نے اپنا ذکر کیا ہے پھر حضور ﷺ کی شان ارشاد فرمائی ہے۔

244...بخاری، کتاب العلم، حدیث:71

مثلاً:

{وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ}

"اور ہم نے تمھیں نہ بھیجا مگر رحمت سارے جہان کے لیے"۔(پ17،انبیا:107)

{اِنَّآ اَرۡسَلۡنٰکَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیۡرًا}

"بے شک ہم نے تمھیں بھیجا حاضر و ناظر اور خوشی اور ڈر سناتا"۔(پ26،فتح:8)

{سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِهٖ لَیۡلًا}

"پاکی ہے اُسے جو اپنے بندے کو راتوں رات لے گیا"۔(پ15،بنی اسرائیل:1)

اسی طرح یہاں ارشاد ہے، "بیشک ہم نے تمھیں بیشمار خوبیاں عطا فرمائیں"۔

اس اندازِ بیان میں دو حکمتیں ہیں۔ ایک یہ کہ حضور ﷺ کی بلند شان دیکھ کر کوئی آپ کو خدا نہ سمجھے۔ دوم یہ کہ کوئی کم عقل حبیبِ مکرم ﷺ کی عظمت کا انکار نہ کر سکے۔ حبیبِ کبریاء ﷺ کی عظمت وشان اور خصائص و کمالات کا انکار کرنا دراصل اللہ تعالیٰ کی قدرت اور عطا کا انکار کرنا ہے۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانۡحَرۡ:

رسول کریم ﷺ کو "کوثر" یعنی دنیا و آخرت کی بیشمار نعمتیں اور خوبیاں بلکہ ہر بھلائی کثرت سے عطا فرمانے کے بعد رب تعالیٰ نے شکر ادا کرنے کے لیے دو چیزوں کی ہدایت فرمائی۔ اول: نماز، دوم: قربانی۔

جسمانی عبادات میں سب سے اہم اور عظیم عبادت نماز ہے۔ نیز نماز کو "کوثر" سے اس طرح بھی خاص مناسبت ہے کہ اس میں خالق و مالک سے مناجات اور رکوع و سجدہ میں عجز و نیاز، شہد سے زیادہ شیریں ہیں، اور نمازی پر جو انوارِ غیبیہ نازل ہوتے ہیں وہ دودھ سے زیادہ سفید و روشن ہوتے ہیں، اور پھر اس عبادت سے دل و دماغ کو ایسا سرور و سکون نصیب ہوتا ہے کہ جیسے صحرا کے پیاسے مسافر کو سخت دھوپ میں برف سے زیادہ ٹھنڈا پانی مل جائے۔

نورِ مجسم رحمتِ عالم ﷺ کے ارشادِ پاک قُرَّةُ عَیۡنِیۡ فِی الصَّلٰوۃ (نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے) میں یہی حقیقت بیان ہوئی ہے۔

ارشادِ ربانی ہوا، صرف اپنے رب کے لیے نماز پڑھو۔ گویا کمالِ اخلاص کے ساتھ کامل ترین عبادت کا حکم دیا گیا اور آقا و مولیٰ ﷺ نے اس حکمِ الٰہی کی ایسی تعمیل فرمائی کہ اکثر رات بھر کھڑے رہ کر نماز ادا فرماتے یہاں تک کہ پاؤں مبارک سُوج جاتے۔

ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! آپ اس قدر مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: افلا اکون عبداً شکوراً۔ کیا میں اپنے رب کا شکر گزار بندہ نہ بنوں![245]

وَانْحَرْ، "اور قربانی کرو"۔ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ مالی عبادات میں زکوٰۃ زیادہ اہم عبادت ہے پھر اس کی بجائے قربانی کا ذکر کیوں کیا گیا؟ اس کے دو جواب ہیں۔ ایک نبی کریم ﷺ کی نسبت سے اور دوسرا امت کے حوالے سے۔ پہلا جواب یہ ہے مالی عبادات میں اللہ تعالیٰ کے نام پر قربانی کرنا اس بناء پر خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں ان مشرکوں کی مخالفت ہے جو بتوں کے نام پر جانور قربان کیا کرتے تھے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ مالی عبادات میں زکوٰۃ کسی مستحق کو پوشیدہ طور پر اس طرح دی جا سکتی ہے کہ دینے والے اور لینے والے کے سوا کسی شخص کو علم نہ ہو۔ جبکہ قربانی کرنے کی صورت میں یقیناً آس پڑوس کے لوگوں کو قربانی کا علم ہو جاتا ہے اس لیے یہاں نیت کو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کرنا بیحد ضروری ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

{لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ}

"اللہ کو ہرگز نہ ان کے گوشت پہنچتے ہیں نہ ان کے خون، ہاں تمہاری پرہیز گاری اس تک باریاب ہوتی ہے"۔ (پ17، حج:37)

اسی لیے قرآن مجید کی ایک اور آیت میں بھی نماز کے ساتھ قربانی کا ذکر ہوا ہے،

{قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ}

"تم فرماؤ! بیشک میری نماز اور میری قربانیاں اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لیے ہے جو رب سارے جہان کا"۔ (پ8، انعام:162)

---

245 ... بخاری، کتاب التہجد، باب قیام النبی حتی ترم قدماہ، حدیث:1130

امت کے لحاظ سے ایک اور مفہوم یہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ قربانی سے مراد رب تعالیٰ کی بندگی کرنے میں جان ومال اور وقت کی قربانی دینا نیز صراطِ مستقیم پر چلنے کے لیے خواہشاتِ نفس کو قربان کرنا ہے۔ اس لیے امت پر لازم ہے کہ وہ نماز کی پابندی کرے اور اپنے آپ کو ان تمام چیزوں سے روکے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب رسول ﷺ کو ناپسند ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا،

{وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا}(پ22، احزاب:36)

”اور جو حکم نہ مانے اللہ اور اس کے رسول کا، وہ بیشک صریح گمراہی بہکا“۔

خلاصہ یہ کہ اس آیت مبارکہ میں نبی کریم ﷺ کو ادائے شکر کے لیے اخلاص کے ساتھ نماز اور قربانی کا حکم دیا گیا اور اس طرح آپ کی امت کو یہ تعلیم دی گئی کہ نماز ادا کرنے اور قربانی دینے میں اخلاص پیدا کریں۔ جسمانی عبادات ہوں یا مالی، سب کو خالص رب تعالیٰ ہی کی رضا کے لیے انجام دینا چاہیے۔ ریاکاری اور دکھاوے سے عبادات ضائع ہو جاتی ہیں۔

قربانی ایک اہم مالی عبادت ہے اور ہر مالکِ نصاب پر واجب ہے۔

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ نے عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! ان قربانیوں کی وجہ کیا ہے؟ سرکارِ دوعالم ﷺ نے فرمایا: یہ تمہارے والد ابراھیم علیہ السلام کی سنت ہے۔ صحابہ نے عرض کی، اس کا کیا اجر ہے؟ فرمایا، ہر بال کے عوض ایک نیکی ہے۔[246]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آقا کریم ﷺ نے فرمایا: قربانی کے دنوں میں اللہ تعالیٰ کو قربانی کرنے سے زیادہ اور کوئی عمل محبوب نہیں۔ وہ جانور قیامت کے دن اپنے سینگوں، بالوں اور کھروں کے ساتھ پیش ہوگا۔ اللہ تعالیٰ جانور کا خون زمین پر گرنے سے قبل ہی قربانی قبول فرمالیتا ہے لہٰذا خوش دلی کے ساتھ قربانی کیا کرو۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آقا ومولیٰ رحمتِ عالم ﷺ نے قربانی کے دن دو چتکبرے، خصّی، سینگ والے مینڈھے ذبح فرمائے۔[247]

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ:

246...مسند امام احمد بن حنبل، حدیث:2147

247...ابو داود، کتاب الضحایا، حدیث:2795

لفظ شَانِئَ کے معنی بغض رکھنے والے دشمن کے ہیں۔ جب کسی شخص کی نرینہ اولاد فوت ہو جاتی تو عرب والے اسے اَبْتَر کہا کرتے تھے۔ کفارِ مکہ حضور ﷺ کو اَبتر کہہ کر طعنہ دیتے تھے کہ جب ان کا انتقال ہو جائے گا تو کوئی ان کا نام لینے والا بھی نہ رہے گا۔ رب تعالیٰ نے اپنے محبوب رسول ﷺ کو نعمتوں کی خوشخبری دی اور کفار کے طعنوں کے جواب میں فرمایا، آپ کا دشمن ہر خیر سے محروم اور بے نام ونشان ہے۔

ان دشمنوں میں سے اکثر تو غزوۂ بدر میں مارے گئے اور ان کی نسل میں سے جو کوئی بچا وہ رسولِ کریم ﷺ کے دامنِ رحمت سے وابستہ ہو گیا اور پھر اس نے اپنے آپ کو ان کافروں کی طرف منسوب کرنا بھی گوارا نہ کیا۔ آج ان کفار کا نام لینے والا کوئی نہیں جبکہ دنیا کے ہر کونے ہر خطے میں محبوبِ خدا ﷺ کا ذکرِ پاک جاری وساری ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کا دشمن خوبیوں اور فضائل سے محروم ہو جاتا ہے ،اس لیے دنیا میں کہیں اُس کا ذکرِ خیر نہیں ہوا کرتا۔ اسکے برعکس حضور ﷺ سے سچی محبت رکھنے والا اعلیٰ اوصاف وفضائل کا پیکر بن کر اللہ کا ولی بن جاتا ہے۔ ایسے پاکیزہ نفوس ایک دو نہیں اس قدر ہیں کہ ان کے متعلق علماء نے ضخیم کتب لکھی ہیں مثلاً حلیۃ الاولیاء، طبقاتُ الکبریٰ، اخبارُ الاخیار، بہجۃُ الاسرار وغیرہ۔

اللہ عزوجل نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے رسول کریم ﷺ کی نسل پروان چڑھائی اور انہیں اس قدر برکت دی کہ ساداتِ کرام دنیا کے کونے کونے میں پھیل گئے۔

رب تعالیٰ نے اپنے محبوب رسول ﷺ کو عظمت وارفع شان اور آپ کے ذکر کو لازوال بلندی عطا فرمائی ہے۔ اربوں مسلمان روزانہ کئی مرتبہ آپ ﷺ پر اور آپ کے آل واصحاب پر درود بھیجتے ہیں، اذانوں اور نمازوں میں حضور ﷺ کا نام لیا جاتا ہے اور آپ کے ذکر کا سلسلہ قیامت تک بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ آپ ﷺ کا ذکر بلند کرنے والا آپ کا رب فرماتا ہے،

{وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ}

"اور ہم نے تمہارے لیے تمہارا ذکر بلند کر دیا"۔

تفسیر سورۃ الکافرون

سورۃ الکافرون مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں چھ آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قُلۡ یٰۤاَیُّہَا الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۱﴾ لَاۤ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۲﴾ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ﴿۳﴾ وَ لَاۤ اَنَا
عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ ﴿۴﴾ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ﴿۵﴾ لَکُمۡ دِیۡنُکُمۡ وَ لِیَ دِیۡنِ ﴿۶﴾

”اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا (ہے)“

”تم فرماؤ، اے کافرو! نہ میں پوجتا ہوں جو تم پوجتے ہو، اور نہ تم پوجتے ہو جو میں پوجتا ہوں۔ اور نہ میں پوجوں گا جو تم نے پوجا اور نہ تم پوجو گے جو میں پوجتا ہوں۔ تمہیں تمہارا دین اور مجھے میرا دین“۔

(کنزالایمان از امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ)

لفظی ترجمہ:

قُلۡ	یٰۤاَیُّہَا	الۡکٰفِرُوۡنَ
تم فرماؤ	اے	کافرو

لَاۤ	اَعۡبُدُ	مَا	تَعۡبُدُوۡنَ
نہ	میں پوجتا ہوں	جو	تم پوجتے ہو

وَ لَاۤ	اَنۡتُمۡ	عٰبِدُوۡنَ	مَا	اَعۡبُدُ
اور نہ	تم	عبادت کرنے والے (ہو)	جو	میں پوجتا ہوں

وَ لَاۤ	اَنَا	عَابِدٌ	مَّا	عَبَدۡتُّمۡ
اور نہ	میں	عبادت کرنے والا (ہوں)	جو	تم نے پوجا

وَ	لَآ	اَنْتُمْ	عٰبِدُوْنَ	مَا	اَعْبُدُ
اور	نہ	تم	عبادت کرنے والے(ہو)	جو	میں پوجتا ہوں

لَ	کُمْ	دِيْنُ	کُمْ	وَ	لِ	یَ	دِيْنِ
لیے	تمہارے	دین	تمہارا	اور	لیے	میرے	دین میرا

فضائل ومناقب:

حضورِ اکرم نورِ مجسم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے، سورۃ کافرون پڑھنے کا ثواب چوتھائی قرآن پاک کے برابر ہے۔(248)

ایک صحابی نے عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! مجھے کچھ نصیحت فرمایئے۔ آقا ومولیٰ ﷺ نے فرمایا: سوتے وقت سورہ کافرون پڑھا کرو کیونکہ یہ سورت شرک سے بری کرتی ہے۔(249)

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جب تم سفر میں جاؤ تو سب سے زیادہ خوشحال ہو جاؤ اور تمہارا سامان زیادہ ہو جائے۔ میں نے عرض کی، بیشک میں ایسا ہی چاہتا ہوں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

تم قرآن کریم کے آخر سے پانچ سورتیں الکافرون، النصر، الاخلاص، الفلق، الناس پڑھا کرو اور ہر سورت کو بسم اللہ الرحمن الرحیم سے شروع کر کے بسم اللہ ہی پر ختم کیا کرو۔ حضرت جبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، میں مالدار ہونے کے باوجود سفر میں تنگدست ہو جاتا تھا، جب سے میں نے یہ سورتیں پڑھنا شروع کیں، میں خوشحال رہنے لگا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ رسول معظم ﷺ کو بچھو نے کاٹ لیا تو آپ نے نمک اور پانی منگوایا(اور متاثرہ جگہ پر ڈالا)۔ آپ سورہ کافرون، سورہ فلق اور سورہ الناس پڑھتے رہے اور اپنا دستِ مبارک پھیرتے رہے۔(250)

248...فردوس الاخبار، حدیث:4658

249 ... ابو داؤد، کتاب الادب، ابواب النّوم، باب ما یقال عند النوم، حدیث:5055۔

250 ...تفسیر مظہری، کافرون

ربط و مناسبت:

کافروں نے جب رسول کریم ﷺ کو برا بھلا کہا تو رب تعالیٰ نے اُن کے جواب میں انہیں اَبْتَر فرمایا۔ گویا رب تعالیٰ نے فرمایا: اے حبیب ﷺ! اگر کافروں نے تمہارا ذکر غلط الفاظ میں کیا تو میں جواب دوں گا اور جب وہ میرا ذکر غلط انداز میں کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں تو تم جواب دو۔ ''اے کافرو!......''۔

سورۃ الکوثر کے آخر میں فرمایا گیا، بیشک آپ کے دشمن کا نام ونشان مٹ جائے گا۔ اس بشارت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اپنے دشمنوں سے مصالحت کی ہر غلط پیشکش کو ٹھکرا دیجیے کیونکہ حق اور باطل کے درمیان کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔

سورۃ الکوثر میں نبی کریم ﷺ کو بیشمار خوبیاں اور کثیر نعمتیں عطا فرمانے کی بشارت دی گئی اور پھر اخلاص کے ساتھ رب تعالیٰ کی عبادت کا حکم دیا گیا جبکہ سورۃ الکافرون میں رب تعالیٰ نے حکم دیا کہ آپ باطل پرستوں کے سامنے کھلے لفظوں میں یہ اعلان فرما دیں کہ تم کافر ہو۔ تمہارے باطل معبودوں کی نہ میں نے کبھی عبادت کی ہے اور نہ ہی کبھی ایسا کروں گا۔

شانِ نزول:

رسول کریم ﷺ نے جب دعوتِ حق دینا شروع کی تو مکہ میں سے بعض لوگوں نے اس دعوتِ حق کو قبول کر لیا۔ جب آہستہ آہستہ دین کی روشنی پھیلنے لگی تو ابتدا میں کفار نے ظلم و ستم اور دھمکیوں کے ذریعے اس دین کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ قرآن کریم نے کافروں کی اس روش کا ذکر یوں کیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہوا،

{وَدُّوۡا لَوۡ تُدۡهِنُ فَيُدۡهِنُوۡنَ}

''وہ تو اس آرزو میں ہیں کہ کسی طرح تم نرمی کرو تو وہ بھی نرم پڑ جائیں''۔(پ29، قلم:9،)

جب اس میں ناکامی ہوئی تو انہوں نے لالچ کا راستہ اختیار کیا۔ حضور ﷺ کے چچا ابو طالب کو کفار کے ایک وفد نے یہ پیشکش کی کہ آپ اپنے بھتیجے سے کہیں:-

اگر اسے مال و دولت کی خواہش ہے تو ہم اس کے قدموں میں سونے چاندی کا ڈھیر لگا دیں گے،

اگر اسے حاکم بننے کا شوق ہے تو ہم اسے اپنا سردار تسلیم کرنے پر تیار ہیں، اور اسے خواہش ہو تو ہم اس کی پسند کی جگہ اس کی شادی کرادیں گے لیکن اسے کہیے کہ وہ ہمارے معبودوں کو برا کہنا چھوڑ دے۔

جب یہ پیغام بار گاہِ رسالت میں پہنچایا گیا تو آقا و مولیٰ ﷺ نے فرمایا: ”اگر وہ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی لاکر رکھ دیں تو بھی میں دعوتِ حق دینا نہیں چھوڑ سکتا“۔

راہِ حق سے روکنے کی اس سازش میں ناکامی پر کافروں نے ایک اور مکارانہ چال چلی۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے کہا، آپ کی دعوت و تبلیغ سے قوم میں انتشار پھیل رہا ہے اس لیے ہم باہم اتحاد کی خاطر اس پر صلح کر لیتے ہیں کہ ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی پوجا کیا کریں اور ایک سال ہم سب آپ کے خدا کی عبادت کیا کریں گے۔ یہ سن کر آقا و مولیٰ ﷺ نے فرمایا:

”میں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میں اس کے ساتھ کسی اور کو شریک کروں“۔

ایک اور روایت میں ہے کہ کفار نے باہمی مصالحت کے لیے یہ تجویز بھی پیش کی کہ آپ ہمارے کسی معبود کو ہاتھ ہی لگا دیجیے تو ہم آپ کی تصدیق کریں گے اور آپ کے معبود کی عبادت کریں گے۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ (251)

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ:

ارشادِ باری تعالیٰ ہوا، ”تم فرماؤ، اے کافرو!“۔ یہاں وہ مخصوص کافر مخاطب کیے گئے ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے اور کفر ہی پر مریں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس سے سرکارِ دوعالم ﷺ کی نبوت ورسالت کی صداقت بھی ثابت ہوئی کہ جن کافروں کو آپ نے کافر قرار دیکر فرمایا تھا کہ تم ایمان نہیں لاؤ گے، وہ ایمان نہیں لائے اور کفر ہی پر مرے۔

حضور ﷺ کو جھوٹ سے شدید نفرت تھی، یہ بات کافر بھی مانتے تھے اسی لیے وہ آپ ﷺ کو صادق وامین کہا کرتے تھے۔ جب یہ سورت نازل ہوئی تو کفار کو معلوم ہو گیا کہ جب بیحد مہربان و شفیق ہونے کے باوجود یہ ہمیں اس طرح کہہ رہے ہیں اور یہ ہمیشہ سچ ہی بولتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ واقعی ہم میں یہ عیب موجود ہیں۔

251... تفسیر خزائن العرفان، ماعون، ص1122

ایک اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ مشرکینِ مکہ باوجود کفر و شرک کے ارتکاب کے یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی انہیں کافر کہے۔ اس لیے ان کی مصالحت کی تجویز کے جواب میں رب تعالیٰ نے یہ حکم دیا، اے محبوب! ”تم یہ اعلان فرمادو، اے کافرو!“۔ تا کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ تمہارے دل میں ان کا کوئی احترام نہیں، وہ کافر ہیں اور تم ان کے کفر سے بیزار ہو۔ یہاں قُلْ اعلان کر دینے کے معنیٰ میں ہے۔

اس سورت کے شانِ نزول کا تقاضا بھی یہی تھا کہ حضور ﷺ یہ اعلان فرمادیں تا کہ کفر و اسلام کے درمیان مصالحت اور بیچ کی راہ ڈھونڈنے والے مایوس ہو جائیں۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کفارِ مکہ تو مشرک تھے انہیں کافر کیوں فرمایا گیا؟ جواب یہ ہے کہ شرک در حقیقت کفر ہی ہے۔ ایمان وہی معتبر ہے جو خالص توحید کے ساتھ ہو۔ ارشادِ ربانی ہے، {اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ}(پ23،زمر:3)

”ہاں خالص اللہ ہی کی بندگی ہے“۔

اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔

آیت ۲ تا آیت ۵:

پھر ارشاد ہوا: ”نہ میں پوجتا ہوں جو تم پوجتے ہو، اور نہ تم پوجتے ہو جو میں پوجتا ہوں۔ اور نہ میں پوجوں گا جو تم نے پوجا اور نہ تم پوجو گے جو میں پوجتا ہوں“۔

ان آیات میں بظاہر مضمون کی تکرار نظر آرہی ہے لیکن در حقیقت ایسا نہیں ہے۔ مذکورہ کلمات آیت ۲ اور ۳ میں زمانہ حال کے لیے ہیں جبکہ آیت ۴ اور ۵ میں زمانۂ مستقبل کے لیے۔ اس لیے مفہوم یہ ہوگا: ”میں نہ تو زمانۂ حال میں تمہارے معبودوں کی عبادت کرتا ہوں اور نہ تم میرے معبود کی عبادت کرتے ہو۔ اور نہ ہی زمانۂ مستقبل میں، مَیں تمہارے معبودوں کی عبادت کروں گا اور نہ ہی تم میرے معبود کی عبادت کرو گے“۔

گویا سرکارِ دوعالم ﷺ نے دوٹوک الفاظ میں فرما دیا، میں توحید کا علمبردار ہوں۔ میں نے جب اعلانِ نبوت سے قبل کبھی کسی بت کی پوجا نہیں کی اور شرک سے محفوظ رہا تو تم اب مجھ سے یہ توقع کیسے

کرسکتے ہو کہ میں شرک سے اپنا دامن داغدار کرنے پر آمادہ ہو جاؤں گا۔ اے کافرو! ایک سال تو بہت طویل عرصہ ہے میں تو ایک لمحہ کے لیے بھی تمہارے جھوٹے خداؤں کی عبادت نہیں کر سکتا۔

اس تکرار کی حکمت مفسرین کرام نے یہ بیان کی ہے کہ کفار ہمیشہ کے لیے مایوس ہو جائیں کہ مسلمان ان کے کفر کو ایک لمحہ کے لیے بھی قبول نہیں کریں گے اور کفر و اسلام کے درمیان مداہنت و مصالحت کی باتیں ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ باطل کو اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے حق کی ملاوٹ سے کچھ عار نہیں ہوتا جبکہ حق کبھی بھی باطل کی ادنیٰ سی آمیزش گوارا نہیں کرتا، کیونکہ حق میں باطل کی معمولی سی آمیزش سے حق باطل بن جاتا ہے۔ جیسے ایک من دودھ میں اگر ایک قطرہ پیشاب ملا دیا جائے تو وہ سارے کا سارا نجس اور ناپاک ہو جاتا ہے۔

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکتِ میانۂ حق وباطل نہ کر قبول

گویا آقا و مولیٰ ﷺ نے ارشاد فرما دیا، حق، حق ہے اور باطل باطل ہے، ان دونوں میں کوئی مفاہمت و مصالحت ممکن نہیں۔ یہ مضمون اس آیت کریمہ میں بھی آیا ہے۔

{لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ}

"کہ سچ کو سچ کرے اور جھوٹ کو جھوٹا، پڑے (اگرچہ) برا مانیں مجرم"۔ (پ9، انفال:8)

مسلمانوں کے علاوہ دیگر تمام مذاہب کے لوگ اپنے جذبات اور اپنی خواہشات کی بناء پر کسی سے محبت اور کسی سے عداوت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے پیروکاروں پر یہ پابندی عائد کی ہے کہ وہ اپنی مرضی اور اپنی خواہش کے تحت دوستی یا دشمنی نہ کریں بلکہ ان کی محبت بھی اللہ تعالیٰ کے لیے ہونی چاہیے، اور ان کی عداوت بھی رب کریم کی رضا کی خاطر ہو، یہ کامل ایمان کا تقاضا ہے۔

نورِ مجسم ﷺ کا ارشاد ہے، جس نے اللہ ہی کے لیے محبت کی، اور اللہ ہی کے لیے دشمنی کی، اور کچھ دیا تو اللہ کے لیے، اور کچھ نہ دیا تو اللہ ہی کے لیے، اُس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔[252]

252...ترمذی، ابواب الزھد، حدیث:2333۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے تخلیق فرمایا ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ انسان کے لیے کیا اچھا ہے اور کیا بُرا۔ ہماری فلاح اور نجات اسی میں ہے کہ ہم اپنے مفادات کی خاطر یا اپنی خواہشات کی وجہ سے اپنے دوست یا دشمن کا تعین نہ کریں بلکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب ﷺ کے احکامات پر عمل پیرا ہوں۔ ان کا فرمان ہے کہ جو لوگ ایمان و انسانیت کے دشمن ہیں وہ کبھی مسلمانوں کے دوست اور خیر خواہ نہیں ہو سکتے۔ ارشاد ہوا:

{يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ
بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ}

"اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور تم میں جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا تو وہ انہیں میں سے ہے"۔ (پ6، مائدہ:51)

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِىَ دِيْنِ:

پھر ارشاد ہوا: "تمہیں تمہارا دین اور مجھے میرا دین"۔ یعنی تمہارے لیے تمہارا کفر اور میرے لیے میری توحید اور میرا اخلاص۔ (خزائن العرفان)[253]

اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے اور تمہارے دین میں کوئی قدر نہ ماضی میں مشترک تھی، نہ اب ہے اور نہ ہی مستقبل میں ہو گی۔ اگر دین کا معنی "جزا" لیا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ ملے گا اور مجھے میرے اعمال کی جزا ملے گی۔

اگر دین سے مراد اعمال ہوں تو مفہوم یہ ہو گا، اے کافرو! تمہارے اعمال شیطان کی اتباع پر مبنی ہیں جس کا انجام جہنم ہے۔ اور ہمارے اعمال وحی الٰہی کے مطابق ہیں اور ان کی جزا جنت ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں، یہ آیت ایسے ہی ہے جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

{وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ} (پ11، یونس:41)

253... خزائن العرفان، کافرون،، ص1123

"اور اگر وہ تمہیں جھٹلائیں تو فرما دو کہ میرے لیے میری کرنی (اعمال) اور تمہارے لیے تمہاری کرنی (اعمال) تمہیں میرے کام سے علاقہ (تعلق) نہیں اور مجھے تمہارے کام سے تعلق نہیں"۔

دوسری آیت میں فرمایا گیا، {لَنَآ اَعۡمَالُنَا وَلَكُمۡ اَعۡمَالُكُمۡ}

"ہمارے لیے ہمارا عمل اور تمہارے لیے تمہارا کِیا"۔ (پ25، شوریٰ:15)

اس آیت کی تفسیر میں امام رازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں، بعض لوگوں کا معمول ہے کہ وہ ترکِ معاملات اور ناراضگی کے وقت یہ آیت پڑھتے ہیں جو جائز نہیں کیونکہ قرآن کا نزول ان چیزوں کے لیے نہیں ہوا، بلکہ ضروری ہے کہ قرآن میں تدبر کر کے اس کے تقاضوں اور احکام پر عمل کیا جائے۔[254]

خلاصہ یہ ہے کہ اس سورت میں شرک اور جھوٹے معبودوں سے بیزاری کا اعلان کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو یہ نصیحت کی گئی ہے کہ حالات کیسے ہی ناموافق کیوں نہ ہو، باطل کی طرف سے ڈرانے کا معاملہ ہو یا لالچ کا، ایمان والوں کے لیے ہرگز جائز نہیں کہ وہ حق اور باطل کے درمیان کسی اور راہ کا شکار ہو جائیں اور مصنوعی مصالحت کی آڑ میں اپنے ایمان کی دولت سے دستبردار ہو جائیں۔ جب مسلمان شرک اور باطل نظریات سے پاک ہو کر دینِ حق پر استقامت کا دامن تھامے رکھیں تو پھر اللہ تعالیٰ انہیں فتح و نصرت عطا فرماتا ہے جیسا کہ اگلی سورت میں مذکور ہے۔

254... تفسیر کبیر، شوریٰ، تحت الآیۃ:15۔

تفسیر سورۃ النصر

سورۃ النصر مدنی سورت ہے، اس میں تین آیات ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق یہ سورت حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے، سورۃ النصر پڑھنے کا ثواب چوتھائی قرآن کریم کے برابر ہے۔ (ترمذی)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ ﴿۱﴾ وَ رَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ﴿۲﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ اسْتَغْفِرْهُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ﴿۳﴾

”اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا (ہے)“

”جب اللہ کی مدد اور فتح آئے اور لوگوں کو تم دیکھو کہ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہوتے ہیں، تو اپنے رب کی ثناء کرتے ہوئے اس کی پاکی بولو اور اس سے بخشش چاہو، بیشک وہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے“۔ (کنز الایمان از اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ)

لفظی ترجمہ:

اِذَا	جَآءَ	نَصْرُ	اللّٰهِ	وَ	الْفَتْحُ
جب	آئے	مدد	اللہ (کی)	اور	فتح

وَ	رَاَيْتَ	النَّاسَ	يَدْخُلُوْنَ	فِيْ	دِيْنِ	اللّٰهِ	اَفْوَاجًا
اور	دیکھ لیں آپ	لوگوں (کو)	داخل ہوتے ہیں وہ	میں	دین	اللہ (کے)	فوج در فوج

فَ	سَبِّحْ	بِ	حَمْدِ	رَبِّ	كَ	وَ	اسْتَغْفِرْ	هُ
پس	پاکی بیان کیجئے	ساتھ	تعریف	رب (کی)	اپنے	اور	بخشش مانگیے	اُس (سے)

تَوَّابًا	كَانَ	هٗ	اِنَّ
توبہ قبول کرنے والا	ہے	وہ	بیشک

ربط و مناسبت:

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سورۃ النصر نزول کے اعتبار سے قرآن پاک کی آخری سورت ہے یعنی اس کے بعد کوئی مکمل سورت نازل نہیں ہوئی۔ اگر ترتیب وار سورتوں کے مضامین کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ پہلے سورۃ الکوثر میں رسول کریم ﷺ کو کثیر نعمتیں اور بھلائیاں ملنے کی خوشخبری دی گئی اور آپ کے دشمنوں کے بے نام ونشان ہونے کا وعدہ سنایا گیا پھر سورۃ الکافرون میں کافروں سے دوٹوک انداز میں گفتگو کر کے ان سے بیزاری ظاہر کرنے کا حکم دیا گیا۔

اس وقت کسی کے وہم و گمان میں نہ ہو گا کہ یہ دین کس طرح پھیل سکتا ہے اور رسول کریم ﷺ کے دشمن کس طرح بے نشان ہو سکتے ہیں۔ پھر اس کے بعد سورۃ النصر میں اللہ تعالیٰ کی مدد اور فتح کی نوید سنائی گئی، گویا اسلام کے غلبے اور عرب کی فتح کا مژدہ سنا دیا گیا۔

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ:

اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی نبی سے یہ وعدہ نہیں فرمایا کہ وہ اسے اس کی ظاہری زندگی ہی میں غلبہ عطا فرمائے گا لیکن اپنے حبیب ﷺ سے یہ ارشاد فرمایا:

{كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِىۡ}

”اللہ لکھ چکا کہ ضرور میں غالب آؤں گا اور میرے رسول“۔(پ28، مجادلہ:21)

اس سورت میں ارشاد ہوا: ”جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہو جائے“۔

اس سے واضح ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر فتح نہیں مل سکتی۔ اس لیے راہِ خدا میں جہاد کرنے والوں اور دینِ حق کی تبلیغ و ترویج کا کام کرنے والوں کو یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ حکمت و دانائی، محنت و لگن، جدوجہد، وسائل اور اسباب سب چیزیں ضروری ہیں لیکن اس کے باوجود اگر فتح نصیب ہوتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال ہونے سے ہی ہوتی ہے۔

اس حوالے سے یہ آیاتِ قرآنیہ بھی ذہن نشین رہیں،

{وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ}

"اور نہ سستی کرو اور نہ غم کھاؤ، تم ہی غالب آؤ گے اگر ایمان رکھتے ہو"۔(پ4،ال عمران:139)

{يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ}

"اے ایمان والو! اگر تم دینِ خدا کی مدد کرو گے، اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جما دے گا"۔(پ26، محمد7)

ایک وقت وہ تھا کہ مدینہ منورہ پر ہزاروں کافروں کی فوج حملہ آور ہوئی تھی اور حضور ﷺ کے حکم پر ایک خندق کھود کر مسلمانوں کا دفاع کیا گیا تھا۔ غزوہ خندق کے دو سال بعد صلح حدیبیہ کا واقعہ ہوا جسے قرآن کریم نے فتحِ مبین قرار دیا پھر اس کے دو ہی سال بعد ۸ ھ میں حضور ﷺ دس ہزار صحابہ کرام کے ہمراہ فاتح کی حیثیت سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ یقیناً یہ رب تعالیٰ کی مدد اور فتح تھی۔

احادیث مبارکہ میں آیا ہے کہ اس سورت میں نبی کریم ﷺ کے وصال کا وقت قریب آجانے کی طرف اشارہ ہے کہ آپ کی بعثت کا مقصد پورا ہو گیا ہے، عنقریب لوگ فوج در فوج دین میں داخل ہونے لگیں گے لہٰذا اب آپ تسبیح و استغفار میں مشغول ہو جایئے۔ جب حضور ﷺ نے صحابہ کرام کے سامنے یہ سورت تلاوت فرمائی تو صحابہ کرام خوش ہوئے کہ اس میں فتحِ مکہ کی خوشخبری ہے۔ مگر حضرت عباس رضی اللہ عنہ رونے لگے۔ رونے کا سبب پوچھا تو انہوں نے عرض کی،

یارسول اللہ ﷺ! اس سورت میں تو آپ کے وصال کی خبر پوشیدہ ہے۔ آقا و مولیٰ ﷺ نے ان کی تصدیق فرمائی۔ (255)

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مجھے بدری صحابہ کے ہمراہ بٹھایا کرتے تھے۔ بعض حضرات نے اسے محسوس کیا کہ اتنے کم عمر نوجوان کو ہمارے ساتھ کیوں بٹھایا جاتا ہے۔ ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان اکابر صحابہ سے فرمایا: اس سورۂ مبارکہ (سورۃ النصر) کا کیا مطلب ہے؟

بعض نے کہا، اس میں ہمیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ جب وہ ہمیں فتح عطا کرے تو ہم اس کی حمد و ثناء کریں اور استغفار کریں۔ بعض بزرگ خاموش رہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا: تم

255... تفسیر قرطبی، نصر، تحت الآیۃ:1

کیا کہتے ہو؟

میں نے عرض کی، اس سورت میں حضورﷺ کے وصال کی طرف اشارہ ہے جس سے رب تعالیٰ نے اپنے رسولﷺ کو آگاہ فرما دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میری بھی یہی رائے ہے۔[256]

یہ سن کر تمام حضرات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی فضیلت کے قائل ہو گئے۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ:

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس سورت میں رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو تین انعامات دینے کا ذکر فرمایا ہے، آپ کی مدد فرمائی، فتحِ مکہ عطا فرمائی، اور آپ کے دین میں لوگوں کو فوج در فوج داخل فرمایا۔ پھر ارشاد ہوا: پہلی نعمت کا شکر ادا کرنے کے لیے اپنے رب کی پاکی بیان کیجئے۔ دوسری نعمت کے شکر کے لیے اپنے رب کی حمد کیجئے اور تیسری نعمت کے شکر کے لیے استغفار کیجئے۔

دنیا کے فاتح جب فتح پاتے ہیں تو جشن مناتے ہیں، رقص و سرود ہوتا ہے، مفتوحین پر ظلم کرتے ہیں لیکن فتح ملنے پر رسولِ معظم ﷺ کا طریقہ اخلاقِ عظیم کی بہترین مثال ہے۔ وہ طریقہ ہے، رب تعالیٰ کی تسبیح، حمد و ثناء اور دعاوِ استغفار۔ اس طریقہ کی خوبیاں سوچیے اور مانیے کہ دنیا کو اصلاحِ فکر و عمل کے لیے نورِ قرآن کی ضرورت ہے۔

تسبیح کے لغوی معنی "کسی کام میں مشغول ہونے" کے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوا:

{اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبۡحًا طَوِيۡلًا}

"بیشک دن میں تو تم کو بہت سے کام ہیں"۔ (پ29، مزمل:7)

گویا تسبیح سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مصروف رہنا ہے۔

تسبیح کا دوسرا معنی رب تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا ہے۔ حمد کے معنی ہیں کہ ہر خوبی اور تعریف اپنے درجہ کمال میں صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اگر حمد کے ساتھ تسبیح کو ملا دیا جائے تو نورٌ علیٰ نور ہے۔

حدیث شریف میں ارشاد ہوا: "اللہ تعالیٰ کی تسبیح میزان کا نصف جبکہ تحمید اسے مکمل کر دیتی ہے"۔ یہ بھی ارشاد ہوا: "سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر، یہ چار کلمے اللہ تعالیٰ کو بیحد محبوب

256... بخاری، کتاب التفسیر، حدیث: 4969

ہیں"۔[257]

چونکہ نعمت کا حق یہ ہے کہ نعمت عطا فرمانے والے یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جائے۔ اور "حمد بیان کرنا شکر کی اصل ہے"۔[258]

یہ بھی فرمانِ الٰہی ہے، {لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ}

"اگر احسان مانو گے تو میں تمہیں اور دوں گا"۔(پ13، ابراہیم:7)

اس لیے فتح ملنے اور لوگوں کے جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے کی عظیم نعمت کا شکر یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی حمد و تسبیح بیان کی جائے۔ پھر اِستغفار کا حکم دیا گیا۔

حدیث میں ہے کہ اس سورت کے نزول کے بعد آقا و مولیٰ ﷺ حمد و استغفار کے یہ کلمات زیادہ پڑھا کرتے: سُبۡحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمۡدِهٖ اَسۡتَغۡفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوۡبُ اِلَيۡهِ۔[259]

حضور ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے، میں دن میں ستر بار اِستغفار کرتا ہوں۔ ایک بار یہ بھی ارشاد فرمایا: میں دن میں سو بار استغفار کرتا ہوں۔[260]

حالانکہ تمام امت کا عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام ہر قسم کے گناہ سے معصوم ہوتے ہیں۔ پھر اس توبہ واِستغفار کا سبب کیا ہے؟

جواب یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کا توبہ واِستغفار فرمانا ازراہِ تواضع تھا یا بطور عبادت، یا اس عمل کے پسندیدہ ہونے کی وجہ سے رب تعالیٰ نے اپنے محبوب کو اس کا حکم دیا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو جس قدر نعمتیں عطا فرمائی تھیں آپ اپنی عبادات کو ان کے شکر کے اعتبار سے کم خیال کرتے اس لیے آپ استغفار فرماتے۔ درحقیقت یہ بارگاہِ الٰہی میں ایک کامل بندے کی طرف سے عجز و نیاز کا اظہار ہے۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ جب بندہ کسی گناہ پر اِستغفار کرتا ہے تو صحیح احادیث کے مطابق رب تعالیٰ کی رحمت اُس پر ناز کرتی ہے۔ تو جب محبوب کبریاء ﷺ اپنی بعثت کا عظیم مقصد پورا کرنے کے

257...مسلم، کتاب الادب،، حدیث:2137۔

258...ابن ماجہ، کتاب الادب، حدیث:3805

259...بخاری، کتاب الدعوات، حدیث:6307

260...مسلم، کتاب الذکر والدعاء، حدیث:2702۲

بعد اس اعلیٰ ترین نیکی پر اپنے رب کی بارگاہ میں اِستغفار کرتے ہونگے تو رب کریم کی رحمت کو ان پر کس قدر پیار آتا ہو گا!!۔

ایک قول یہ ہے کہ آپ کو بطور عبادت استغفار کا حکم دیا گیا، اِستغفار سے نیکوں کے درجات بلند ہوتے ہیں۔ نیز اس میں ایک حکمت یہ بھی تھی کہ توبہ واِستغفار کرنا امت کے لیے سنت بن جائے۔

مفسرین کرام نے آیت {وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ} یعنی "اے محبوب! اپنے خاصوں اور عام مسلمان مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی معافی مانگو"(پ26، محمد:19) سے استدلال کرتے ہوئے اس اِستغفار کا یہی مفہوم بیان کیا ہے کہ آپ اپنی امت کے گناہوں کی مغفرت مانگیے۔

وقیل استغفر لِاُمّتِک۔ اپنی امت کے لیے استغفار کیجیے۔(قرطبی)

والمعنی استغفر لِاُمّتِک۔ اس کا معنی یہ ہے کہ آپ اپنی امت کے لیے مغفرت مانگیے۔[261]

فتحِ مکہ کے دن آقا و مولیٰ ﷺ جب اپنی اونٹنی پر سوار مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو آپ کی مبارک گردن احساسِ تشکر سے اس قدر جھکی ہوئی تھی کہ آپ ﷺ کی داڑھی مبارک اونٹ کے کوہان سے لگ رہی تھی۔ سب سے پہلے آپ ﷺ نے حضرت اُمِّ ہانی رضی اللہ عنہا کے گھر جا کر آٹھ رکعت نوافل ادا کیے اور اپنے رب کا شکر ادا کیا۔

یہ سورت حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی، اس کے ۸۰ دن بعد حضور ﷺ کا وصال ہو گیا۔ اس عرصہ میں حضور ﷺ نے عبادت میں بہت مشقت کی۔[262]

قرآن مجید قیامت تک کے لیے راہبر وراہنما ہے۔ اس سورت کے مخاطب صرف آقا کریم ﷺ ہی نہیں بلکہ حضور ﷺ کے بعد امت کے تمام لوگ ہیں۔ لہٰذا راہِ حق میں کوشش کرنے والوں کو چاہیے کہ حمد وتسبیح اور توبہ واِستغفار کے ذریعے اپنے رب سے اپنا تعلق مضبوط کریں۔

دین کی تبلیغ وترویج اور سربلندی کی جدوجہد میں جو کامیابی ملے، اسے اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اور مدد ونصرت سمجھیں، اور اپنی تدبیر وعقل پر ناز نہ کریں نیز اپنے اعمال کا جائزہ لیتے رہیں تاکہ اپنی

261...قرطبی، محمد، تحت الایۃ:19
262...قرطبی، محمد، تحت الایۃ:19

غلطیوں اور خامیوں کی اصلاح کرنا آسان ہو۔

ارشادِ باری ہے، {فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصۡلِحُوۡا ذَاتَ بَيۡنِكُمۡ }

"تو اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس میں میل (صلح صفائی) رکھو"۔(پ9، انفال:1)

اقامتِ دین کے حوالے سے تبلیغی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے لغزشیں اور غلطیاں سرزد ہو جایا کرتی ہیں کہ انسان خطا کا پُتلا ہے اور صراطِ مستقیم پر شیطان گھات لگائے ہوئے ہے۔ کامیابی کی صورت میں جذبات اور خواہشات انسان پر غالب آجاتے ہیں اور وہ اپنی عقل و تدبیر پر ناز کرنے لگتا ہے یا آرام و آسائش کی صورت میں رب تعالیٰ سے اس کا تعلق کچھ کمزور پڑنے لگتا ہے۔

اپنا جائزہ لیتے رہنا اور غلطی کا احساس ہوتے ہی اس کا اعتراف کر لینا اور پھر فوراً ہی رب کریم سے توبہ و استغفار کرنا نیکوں کا طریقہ ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ دنیا میں انہی لوگوں نے ترقی و کامیابی حاصل کی جنہوں نے اپنی غلطیوں کو ضد اور انا کا مسئلہ نہیں بنایا بلکہ اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے اپنی اصلاح کی۔

قرآن کریم نے انبیاء کرام کے ساتھ مل کر کفار سے جہاد کرنے والے ایک گروہ کا ذکر کیا ہے اور ان کی تعریف کرتے ہوئے انہیں "اللہ والوں" کا خطاب دیا ہے۔ مذکور ہے کہ کامل طور پر جہاد کرنے کے باوجود ایسے متقی لوگوں کے ہونٹوں پر یہی دعا رہی،

{وَمَا كَانَ قَوۡلَهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡا رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَاِسۡرَافَنَا فِىۡۤ اَمۡرِنَا وَثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ}

"اور وہ کچھ بھی نہ کہتے تھے سوائے اس دعا کے کہ اے ہمارے رب! بخش دے ہمارے گناہ اور جو زیادتیاں ہم نے اپنے کام میں کیں، اور ہمارے قدم جما دے، اور ہمیں ان کافر لوگوں پر مدد دے"۔ (پ4، ال عمران:147،)

اس سورت میں تصوف و سلوک کی تین منزلیں بیان ہوئی ہیں۔ پہلی منزل تسبیح، دوسری حمد اور تیسری اِستغفار۔ جب بندہ صبح و شام زبان و دل سے ذکر کرتا ہے کہ "اللہ ہر عیب سے پاک ہے"، تو اس کے خیالات اور جذبات میں پاکیزگی پیدا ہونے لگتی ہے۔ جب وہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بار بار کرتا ہے، "سب خوبیاں اللہ کے لیے ہیں"، تو اسکی شخصیت میں خوبیاں پیدا ہونے لگتی ہیں اور جب وہ

اِستغفار کرتا ہے توصفاتِ الٰہی کے جلووں کے سبب اسکے کمالاتِ عبدیت میں ترقی ہوتی ہے۔

اس سورۂ مبارکہ میں یہی پیغام دیا گیا ہے کہ جو مومن بھی محض اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب رسول ﷺ کی رضا کی خاطر تن من دھن کے ساتھ دین کا کام کرے گا اور اپنے آپ پر ناز کرنے کی بجائے حمد واِستغفار کا دامن تھامے رہے گا، رب کریم اس کی خطاؤں کو معاف فرمادے گا، بیشک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

تفسیر سورۃ اللھب

سورۃ اللھب یا سورۃ المَسد مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں پانچ آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَہَبٍ وَّ تَبَّ ؕ﴿۱﴾ مَاۤ اَغۡنٰی عَنۡہُ مَالُہٗ وَ مَا کَسَبَ ؕ﴿۲﴾ سَیَصۡلٰی نَارًا ذَاتَ لَہَبٍ ۚ﴿۳﴾
وَّ امۡرَاَتُہٗ ؕ حَمَّالَۃَ الۡحَطَبِ ۚ﴿۴﴾ فِیۡ جِیۡدِہَا حَبۡلٌ مِّنۡ مَّسَدٍ ﴿۵﴾

"اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا (ہے)"

"تباہ ہو جائیں ابو لہب کے دونوں ہاتھ، اور وہ تباہ ہو ہی گیا۔ اسے کچھ کام نہ آیا اس کا مال اور نہ جو کمایا۔ اب دھنستا ہے لپٹ مارتی آگ میں وہ، اور اس کی جورو (بیوی) لکڑیوں کا گٹھا سر پر اٹھاتی، اس کے گلے میں کھجور کی چھال کا رسّا"۔ (کنز الایمان از اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی رحمہ اللہ)

لفظی ترجمہ:

تَبَّتۡ	یَدَاۤ	اَبِیۡ لَہَبٍ	وَّ	تَبَّ
تباہ ہو جائیں	دونوں ہاتھ	ابو لہب (کے)	اور	تباہ ہو گیا وہ

مَاۤ	اَغۡنٰی	عَنۡ	ہٗ	مَالُ	ہٗ	وَ	مَا	کَسَبَ
نہ	کام آیا	سے (کے)	اُس	مال	اُس (کا)	اور	جو	کمایا اُس نے

سَ	یَصۡلٰی	نَارًا	ذَاتَ	لَہَبٍ
عنقریب	پہنچے گا وہ	آگ (میں)	والی	شعلوں

وَّ	امۡرَاَتُ	ہٗ	حَمَّالَۃَ	الۡحَطَبِ
اور	بیوی	اس (کی)	اٹھانے والی	لکڑیوں کا گٹھا

فِيۡ	جِيۡدِ	هَا	حَبۡلٌ	مِّنۡ	مَّسَدٍ
میں	گلے	اُس (کے)	رسی	سے (کی)	کھجور کی چھال

ربط و مناسبت:

اس سے قبل سورۃ النصر میں رب تعالیٰ نے اپنے محبوب رسول ﷺ کو فتح و نصرت کی خوشخبری سنائی اور پھر اس سورت میں حضور ﷺ کے دشمنوں کے ہلاک و برباد ہونے کی بشارت دی۔ اس سورت میں اگرچہ ابولہب کی مذمت اور اس کے لیے عذاب کی وعید ہے لیکن در حقیقت یہ نبی کریم ﷺ کے تمام دشمنوں اور گستاخوں کے لیے ہلاکت و بربادی کی پیش گوئی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے،

{جَآءَ الۡحَقُّ وَزَهَقَ الۡبَاطِلُ اِنَّ الۡبَاطِلَ كَانَ زَهُوۡقًا}

"حق آیا اور باطل مٹ گیا، بیشک باطل کو مٹنا ہی تھا"۔ (پ15، بنی اسرائیل: 81)

یوں کہا جاسکتا ہے کہ "جاءَ الحق" کی تفسیر سورۃ النصر ہے اور "زَھقَ الباطل" کی تفسیر سورۃ اللھب ہے۔

سورۃ النصر میں بتایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانے اور ان کی اطاعت کرنے والوں کو فتح و نصرت نصیب ہوتی ہے، جبکہ سورۃ اللھب میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا انکار اور ان کی مخالفت کرنے والوں کا انجام تباہی و بربادی ہے۔

سابقہ سورت میں فتح مکہ کے بعد کا حال بیان ہوا ہے جو اسلام کی فتح و نصرت اور عروج کا دور ہے جبکہ سورۃ اللھب میں دینِ اسلام کی ابتدائی حالت کا ذکر ہے جب اسلام کا نام لینا بھی بڑا جرم سمجھا جاتا تھا اور چند گنے چُنے لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ اس ترتیب میں حکمت یہ ہے کہ فتح و عروج کے وقت بے کسی اور مشکل وقت کو یاد کرنے سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا جذبہ مزید قوی ہو جاتا ہے۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ سورۃ النصر مدینہ منورہ میں آخری دور میں نازل ہوئی جبکہ سورۃ اللھب مکہ مکرمہ میں شروع دور ہی میں نازل ہوگئی تھی۔ اس کے باوجود ان دونوں سورتوں میں اس قدر گہرا ربط و مناسبت اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآنی سورتوں کی ترتیب اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے ہے۔

شانِ نزول:

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی، { وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ }(پ19، شعراء:214)

"اور اے محبوب! اپنے قریب تر رشتہ داروں کو ڈراؤ"۔

تو رسول کریم ﷺ کوہِ صفا پر چڑھے اور آپ نے قریش کے مختلف خاندانوں کو پکارا۔ سب لوگ جمع ہو گئے۔ آپ نے فرمایا: اگر میں یہ بتاؤں کہ اس پہاڑ کے پیچھے سے ایک لشکر تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو کیا تم میری تصدیق کرو گے ؟ سب نے کہا، بیشک! کیونکہ آپ سے ہم نے ہمیشہ سچ ہی سنا ہے۔ آپ نے فرمایا:

میں تمہیں ڈراتا ہوں کہ اگر تم نے شرک نہ چھوڑا تو تم پر خدا کا عذاب آئے گا۔ اس پر آپ کے چچا ابو لہب نے کہا، تم تباہ ہو جاؤ، کیا تم نے ہمیں اس لیے جمع کیا تھا؟

اس کی گستاخی کے جواب میں حضور ﷺ تو خاموش رہے مگر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔[263]

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سورۃ الکافرون کا آغاز لفظ قُلۡ (اے نبی! تم فرماؤ) سے ہوا نیز اس سورت کے بعد والی تینوں سورتوں کے شروع میں لفظ قُلۡ موجود ہے، تو اس سورت کے آغاز میں لفظ قُلۡ کیوں نہیں؟

جواب یہ ہے کہ جب کفار نے رب تعالیٰ کی ذات پر طعن کیا تو رب کریم نے فرمایا: اے رسول! تم کافروں کو یہ جواب دو۔ لیکن جب کافروں نے رسول معظم ﷺ کی ذات پر طعنہ زنی کی تو رب تعالیٰ نے فرمایا: اے محبوب! تم خاموش رہو، تمہارے گستاخ کو میں خود جواب دوں گا، "تباہ ہو جائیں ابو لہب کے دونوں ہاتھ"۔

قرآنِ عظیم میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں۔ سورۃ القلم کی ابتدائی سولہ آیات ملاحظہ فرمایئے۔ جب کافر ولید بن مغیرہ نے حبیبِ کبریاء سیدِ عالم ﷺ کی شانِ اقدس میں گستاخی کا ایک جملہ کہا

263 ... بخاری، کتاب التفسیر، باب وانذر عشیر تک۔۔۔الخ، حدیث 4770

تو رب تعالیٰ نے قسم ارشاد فرما کر اپنے محبوب رسول ﷺ کی عظمت وشان بیان کی اور اُس ملعون کے دس عیب بیان فرمائے۔

تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَہَبٍ...:

ابو لہب کی اس کنیت کی وجہ یہ تھی کہ وہ بہت چمکدار سرخ رنگت والا تھا۔ چونکہ "لہب" شعلوں کو بھی کہتے ہیں اس لیے قرآن مجید نے اس کے انجام کے مطابق اس کنیت کا ذکر فرمایا ہے۔

عرب روایات کے مطابق ہر کوئی اپنے قریبی رشتہ دار کی حمایت کیا کرتا لیکن ابو لہب کو رشتے میں نبی کریم ﷺ کا سگا چچا ہونے کے باوجود آپ ﷺ سے شدید عداوت تھی۔ جب حضور ﷺ کے دوسری صاحبزادے کا وصال ہوا تو آپ سے بجائے غم یا افسوس کرنے کے ابو لہب خوشی خوشی دوڑتا ہوا کافروں کے پاس گیا اور اُن سے کہا، آج محمد (ﷺ) بے نام ونشان ہو گئے۔ (معاذ اللہ)

رسول کریم ﷺ اور ابو لہب کے گھر ساتھ ساتھ تھے۔ یہ ملعون اور اس کی بیوی حضور ﷺ کے گھر میں گندگی اور غلاظت پھینکا کرتے۔ اُس کی بیوی بھی اسلام دشمنی میں اس قدر آگے تھی کہ رات کو حضور ﷺ کے دروازے پر خاردار جھاڑیاں ڈال دیتی تاکہ آپ کے مبارک قدموں میں کانٹے چبھ جائیں۔

جب حضور ﷺ اور آپ کے خاندان کو شعبِ ابی طالب میں محصور کر دیا گیا اور تین سال تک ظلم وستم کا سامنا کرنا پڑا تو اس وقت بھی ابو لہب نے کافروں کا ساتھ دیا۔

نبی کریم ﷺ جب مختلف قبائل کو اسلام کی تبلیغ فرماتے تو ابو لہب لوگوں کو آپ کی بات سننے سے روکتا اور آپ کو پتھر مارتا۔ ایک صحابی کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ آقا ومولیٰ ﷺ لوگوں کو دینِ حق کی دعوت دے رہے تھے اور ابو لہب حضور کو پتھر مار رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ کے جسم اقدس سے خون بہہ کر ایڑیوں تک پہنچ رہا تھا۔

ابو لہب مکہ کے دولتمند ترین لوگوں میں سے تھا۔ اس کے پاس آٹھ سیر سے زیادہ سونے کی اینٹیں تھیں۔ اس سورت میں ایک پیش گوئی یہ کی گئی ہے کہ اس کے ہاتھ ٹوٹ گئے یعنی اس کے ہاتھ اس کے کام نہیں آئے۔

اگرچہ دیگر کافروں نے غزوۂ بدر میں حضور ﷺ کے خلاف تلوار اٹھائی مگر ابو لہب اتنا بزدل نکلا کہ اس نے اپنے ایک مقروض کو چار ہزار درہم معاف کرنے کے بدلے میں اپنی جگہ بدر میں لڑنے بھیج دیا۔ چونکہ ابو لہب حضورِ اکرم ﷺ کے خلاف تلوار نہیں اٹھا سکا اس لیے گویا اس کے ہاتھ ٹوٹ گئے۔

ہاتھ کا لفظ مددگار اور دوست کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اسی لیے قریبی دوست کو دستِ راست بھی کہتے ہیں۔ جب اس کے معاون و مددگار دوست مثلاً ابو جہل وغیرہ بدر میں قتل ہو گئے تو گویا اس کے وہ بازو بھی ٹوٹ گئے جو حضور ﷺ کی مخالفت میں اس کا ساتھ دیتے تھے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہوا، {وَّتَبَّ} ''اور وہ تباہ ہو ہی گیا''۔ عربی زبان کا اسلوب ہے کہ جو بات یقینی طور پر مستقبل میں ہونی ہو، اسے ماضی سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ چنانچہ مکہ کے بڑے سردار اور رئیس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا جو فرمان اس کے رسول ﷺ کی زبانِ حق ترجمان سے ادا ہوا، وہ کچھ ہی عرصہ میں لفظ بلفظ پورا ہوا۔

مَآ اَغۡنٰی عَنۡهُ مَالُهٗ...:

مفسرین نے لکھا ہے کہ غزوۂ بدر کے ساتویں روز اس کے جسم پر طاعون کی طرح کا پھوڑا نکلا جو چند دنوں میں سارے بدن پر پھیل گیا۔ اس کے جسم سے بدبودار پیپ بہنے لگی اور گوشت گلنے لگا۔ مرض لگ جانے کے خوف سے اس کے بیٹے بھی اس کے قریب نہ جاتے۔ یوں تڑپ تڑپ کر ذلت سے مر گیا۔

تین دن تک لاش پڑی رہی۔ پھر جب لوگ اسکے بیٹوں کو طعنے دینے لگے تو انہوں نے مزدوروں سے گڑھا کھدوا کر لکڑیوں سے لاش دھکیل کر اس گڑھے میں ڈلوا دی اور دور ہی سے پتھر مار مار کر اس گڑھے کو بھر دیا۔ کوئی اولاد اپنے باپ کو بیماری یا کسی مصیبت میں یوں نہیں چھوڑ سکتی مگر جب اللہ تعالیٰ کا عذاب آئے تو گستاخِ رسول کی اولاد کے بھی دل میں اس کے لیے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔

قرآنی پیش گوئی کی حقانیت دیکھیے کہ ابو لہب کے ہاتھ یعنی اس کی طاقت اس کے کام نہ آئی اور نہ ہی اس کے دوست۔ بلکہ اُسے ذلت کی موت ملی، اس کی لاش کو سنگسار کیا گیا اور رب تعالیٰ نے یوں بارگاہِ نبوت کے گستاخ کو نشانِ عبرت بنا دیا۔

اعلانِ نبوت سے قبل حضور ﷺ کی بیٹیاں حضرت اُمِّ کلثوم اور حضرت رقیّہ ابو لہب کے دو بیٹوں

کے نکاح میں تھیں۔ جب حضور ﷺ نے نبوت کا اعلان فرمایا تو اپنے باپ کے کہنے پر دونوں نے طلاق دیدی۔ اس کے بیٹے عتیبہ نے طلاق دیتے ہوئے بارگاہِ رسالت میں گستاخی کا ارتکاب بھی کیا۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: ”الٰہی! اس پر اپنے کتوں میں سے ایک کتا مسلط فرما“۔

ابو لہب اس بیٹے کی حفاظت کا بہت خیال رکھتا تھا۔ تجارتی قافلے کے ساتھ سفر میں ایک رات ملک شام میں پڑاؤ ڈالا تو اسکی حفاظت کے لیے چاروں طرف اونٹ بٹھا دیے گئے۔ غیب بتانے والے آقا کریم ﷺ کے ارشاد کے مطابق ایک شیر آیا اور سب لوگوں اور اونٹوں کو چھوڑ کر درمیان میں صرف عتیبہ پر حملہ آور ہوا اور اسے ہلاک کر ڈالا، اس طرح اس کی کمائی یعنی عتیبہ برباد ہو گیا۔[264]

اس سورت میں دوسری پیشگوئی یہ کی گئی ہے کہ اس کا مال اور اولاد بھی اس کے کام نہیں آئیں گے سو ایسا ہی ہوا۔ وہ کہا کرتا تھا، ”جو کچھ میرا بھتیجا کہتا ہے اگر وہ حق ہے تو میں اپنا مال و اولاد فدیہ دیکر اپنی جان بچا لوں گا“۔ جس دولت کی کثرت پر اسے ناز تھا اور جن بیٹوں پر وہ فخر کیا کرتا تھا، مصیبت کے وقت کوئی اس کے کام نہ آیا۔ بلکہ فکرِ ابولہبی کو مزید شکست اس طرح ہوئی کہ اس کی بیٹی اور بقیہ دو بیٹوں نے اُسی سچے نبی ﷺ کا کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کر لیا جس سے ساری عمر اُس نے دشمنی کی تھی۔

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ...:

ارشاد ہوا: ”اب دھنستا ہے لپٹ مارتی آگ میں وہ، اور اس کی جورو (بیوی)، لکڑیوں کا گٹھا سر پر اٹھاتی“۔

اس سورت میں تیسری پیش گوئی یہ کی گئی ہے کہ ابو لہب اور اس کی بیوی جہنم کی آگ میں ڈالے جائیں گے۔ یہ پیش گوئی بھی پوری ہوئی کیونکہ ابو لہب اور اس کی بیوی دونوں ہی ایمان نہیں لائے، کفر پر مرے، اس لیے دونوں جہنمی ہیں۔

جب یہ سورت نازل ہوئی تو ابولہب کی بیوی غصہ میں بھری اپنے ہاتھوں میں پتھر اٹھائے حضور ﷺ کی تلاش میں نکلی۔ حضور ﷺ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کعبہ شریف کے پاس تشریف فرما

264... تفسیر کبیر، لہب، تحت الآیۃ: 1

تھے۔وہ قریب پہنچی تو اسے حضور ﷺ نظر ہی نہ آئے۔ کہنے لگی، تمہارا ساتھی کہاں ہے ؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس نے میری ہجو کی ہے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "ربِ کعبہ کی قسم! وہ شعر کہتے ہیں نہ شعر پڑھتے ہیں"۔جب وہ چلی گئی تو حضور ﷺ نے فرمایا: ایک فرشتہ نے مجھے چھپالیا تھا اس لیے وہ مجھے نہ دیکھ سکی۔ (265)

حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کا ایک معنٰی یہ ہے کہ وہ خاردار لکڑیوں کو جنگل سے اُٹھا کر لاتی تاکہ حضور ﷺ کی راہ میں بچھا سکے۔ دوسرا معنٰی یہ ہے کہ وہ لوگوں کی چغلیاں کرتی تھی تاکہ مخالفت کی آگ کو اور بھڑکائے۔

فِیۡ جِیۡدِهَا حَبۡلٌ مِّنۡ مَّسَدٍ:

آخر میں ارشاد ہوا: "اس کے گلے میں کھجور کی چھال کا رسّا"۔

مَسَدٌ اُس رسی کو کہا جاتا ہے جو کسی بھی چیز سے خوب مضبوط بنائی گئی ہو خواہ کھجور یا ناریل کی چھال ہو یا لوہے کے تار۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت عروہ رضی اللہ عنہ وغیرہ نے اس کی تفسیر میں فرمایا، یہاں مراد لوہے کے تاروں سے بنا ہوا مضبوط رسا ہے جو کہ جہنم میں اس کے گلے میں ڈالا جائے گا۔

اس سورت میں چوتھی پیش گوئی یہ تھی کہ اس کی بیوی لکڑیوں کا گٹھا سر پر اٹھائے گی، اور اس کے گلے میں رسی کا پھندا ہو گا۔ حرف بحرف ایسا ہی ہوا۔ یہ سب پیش گوئیاں صحیح ثابت ہونا در حقیقت حضور ﷺ کے سچے نبی ہونے کی واضح دلیل ہیں۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ ایک دن وہ خاردار لکڑیوں کا گٹھا سر پر اٹھائے آرہی تھی جو مونج کی رسی میں بندھا ہوا تھا۔ رسی کا دوسرا سِرا اُس نے گردن کے گرد لپیٹا ہوا تھا کہ گٹھا پیچھے کو گرا اور وہ رسی اس کے گلے کا پھندا بن گئی۔ جنگل میں کوئی نہ تھا جو مدد کرتا۔ اُسی رَسی سے اُس کا گلا گُھٹ گیا اور وہ مر گئی۔

اس سورۃ مبارکہ میں مومنوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جو شخص بھی بارگاہِ رسالت میں گستاخی کرے، اُس ملعون کے ساتھ ہرگز نرمی نہ برتیں بلکہ اس سے نفرت کریں اور اسکے عیب بیان کریں

265... تفسیر کبیر، لہب، تحت الآیۃ: 1

تا کہ لوگ اس کے شر سے بچیں۔ نیز یہ سبق بھی ملتا ہے کہ حضور ﷺ کا گستاخ کتنا بڑا سردار ہی کیوں نہ ہو، ہلاک و برباد ہو جاتا ہے۔

حق کے منکر ہمیشہ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیاوی ساز و سامان اور ظاہری اسباب انہیں حق کے مقابلے میں مدد دیں گے اور یہ چیزیں ہی انسان کے مقام و مرتبے کے بلند ہونے کی دلیل ہوتی ہیں لیکن قرآن کریم اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ اصل محبت کے لائق اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی ذات پاک ہیں۔ ان کے مقابلے میں تمام دنیاوی اسباب، مال، اولاد، مقام و مرتبہ سب ناپائیدار اور بے فائدہ ہیں۔ اصل عزت تو اللہ عَزَّوَجَل اور رسول ﷺ کو ماننے اور راہِ حق اپنانے میں ہے۔

تفسیر سورۃ الاخلاص

سورۃ الاخلاص مکہ میں نازل ہوئی، اس میں چار آیات ہیں۔ بعض علماء کے بقول یہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی۔ محقق علماء کا قول ہے کہ یہ سورت دوبار نازل ہوئی، ایک بار مکہ میں اور دوسری بار مدینہ منورہ میں۔ آقا و مولیٰ ﷺ کا فرمانِ عالیشان ہے، یہ سورت اجر کے لحاظ سے ایک تہائی قرآن پاک کے برابر ہے۔(266)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (۱) اَللّٰهُ الصَّمَدُ (۲) لَمۡ يَلِدۡ ۙ وَلَمۡ يُوۡلَدۡ (۳) وَلَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (۴)

”اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا (ہے)“

”تم فرماؤ! وہ اللہ ہے، وہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ اس کی کوئی اولاد اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا، اور نہ اس کے جوڑ کا کوئی“۔ (کنزالایمان از اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ)

لفظی ترجمہ:

قُلۡ	هُوَ	اللّٰهُ	اَحَدٌ	اَللّٰهُ	الصَّمَدُ
تم فرماؤ	وہ	اللہ	ایک ہے	اللہ	بے نیاز

لَمۡ	يَلِدۡ	وَ	لَمۡ	يُوۡلَدۡ
نہ	اُس نے جَنا	اور	نہ	وہ جَنا گیا

وَ	لَمۡ	يَكُنۡ	لَّ	هٗ	كُفُوًا	اَحَدٌ
اور	نہیں	ہے	لیے	اس کے	برابر کا	کوئی

266...بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب فضل قل ھو اللہ احد، حدیث:5015

فضائلِ سورت:

ایک صحابی رضی اللہ عنہ جب بھی جماعت کراتے تو ہر رکعت کی قرأت کے اختتام پر سورۃ الاخلاص تلاوت کرتے۔ ان سے ایسا کرنے کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے جواب دیا، اس سورت میں رحمن کی صفت بیان ہوئی ہے اس لیے میں اس کی تلاوت کو محبوب رکھتا ہوں۔ یہ بات بارگاہِ نبوی میں بیان کی گئی تو آقا و مولیٰ ﷺ نے فرمایا: اسے بتادو کہ اللہ تعالیٰ بھی اس سے محبت رکھتا ہے۔ (بخاری، مسلم)[267]

ایک اور حدیث پاک میں ایک انصاری صحابی کا ذکر ہے کہ وہ ہر رکعت میں کوئی بھی سورت پڑھنے سے پہلے سورۃ الاخلاص پڑھا کرتے۔ دریافت فرمانے پر بارگاہِ نبوی میں عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! مجھے اس سورت سے بہت محبت ہے۔ آقا و مولیٰ ﷺ نے فرمایا: اس سورت کی محبت نے تجھے جنتی بنادیا ہے۔[268]

نورِ مجسم ﷺ نے فرمایا: کیا تم لوگ اس بات سے عاجز ہو کہ تم ہر رات تہائی قرآن پڑھو؟ صحابہ نے عرض کی، ہم ہر رات میں تہائی قرآن کیسے پڑھ سکتے ہیں؟ ارشاد فرمایا: سورۃ الاخلاص کی تلاوت تہائی قرآن کے برابر ہے۔[269]

ایک شخص نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر اپنی غربت اور تنگدستی کا ذکر کیا۔ رسولِ معظم ﷺ نے فرمایا: جب تم اپنے گھر میں داخل ہو تو وہاں جو موجود ہو اسے سلام کرو، اور اگر کوئی موجود نہ ہو تو مجھ پر سلام بھیجو، اور پھر ایک بار سورۃ الاخلاص پڑھو۔

اس شخص نے اس پر عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے اس قدر رزق عطا فرمایا کہ وہ اپنے پڑوسیوں کو بھی اس مال سے فائدہ پہنچانے لگا۔[270]

---

267 ... بخاری، کتاب التّوحید، باب ماجاء فی دعاء النّبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث:7375

268 ... ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فی سورۃ الاخلاص، حدیث:2910

269 ... مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین و قصرہا، باب فضل قراءۃ قل ھو اللہ، حدیث:811

270... تفسیر قرطبی، الاخلاص،

ربط و مناسبت:

اس سے قبل سورۃ الکافرون میں بار بار اللہ تعالیٰ کے معبود ہونے کا اعلان کیا گیا، اس لیے ضروری تھا کہ اُس سچے معبود کی معرفت سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے تاکہ حجت تمام ہو جائے اور جو پھر بھی نہ مانے، وہ ساقیٔ کوثر ﷺ کے جودو کرم اور رب تعالیٰ کی فتح و نصرت سے محروم ہو کر اَبْتَرْ (بے نام ونشان) ہو جائے اور شعلوں والی آگ میں ابولہب کا ساتھی قرار پائے۔

اس سورت کا سورۃ الکوثر کے ساتھ بھی ایک خاص تعلق نظر آتا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے دشمنوں کی خود مذمت فرمائی اور انہیں اَبْتَرْ فرمایا۔ اور اس سورت میں اپنے محبوب رسول ﷺ سے فرمایا: قُلْ یعنی اے حبیب! تم ان لوگوں کا رَد کرو جو میرا شریک ٹھہراتے ہیں، میرے لیے بیوی اور اولاد مانتے ہیں اور میرے متعلق غلط باتیں کہتے ہیں۔ گویا تمہاری شان مَیں بیان کرتا ہوں میری شان تم بیان کرو۔

سورۃ اللھب کے مضمون پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ابولہب اور اس کے ساتھیوں کو اللہ تعالیٰ کی معرفت نصیب نہ ہوئی اور انہوں نے عرفانِ ربانی کی ناطق دلیل یعنی حضور ﷺ کو جھٹلایا جس کی بناء پر وہ تباہ و برباد ہو گئے۔ اس سورۃ میں یہی بتایا گیا ہے کہ ہلاکت و بربادی سے بچنا ہے تو رب تعالیٰ کی معرفت حاصل کر لو اور معرفتِ الٰہی حاصل کرنی ہے تو رسول کریم ﷺ کے دامنِ رحمت سے وابستہ ہو جاؤ۔

شانِ نزول:

رسولِ معظم ﷺ نے جب کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا: **قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا۔** ’’کہہ دو! اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، تم فلاح پا جاؤ گے‘‘۔ اس پر مشرکینِ مکہ میں کھلبلی مچ گئی۔ ہر طرف سے سوالات کی بوچھاڑ ہونے لگی۔

کوئی کہتا، اللہ کا نسب کیا ہے؟ کوئی کہتا، تمہارا رب کس چیز کا بنا ہوا ہے؟ سونے کا ہے یا چاندی کا، لوہے کا ہے یا لکڑی کا۔ کوئی کہتا، وہ کیا کھاتا ہے کیا پیتا ہے؟ ربوبیت اس نے کس سے ورثہ میں پائی اور اس کا کون وارث ہو گا؟

ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی اور اپنی ذات وصفات کا بیان فرما کر معرفت کی راہ واضح کی۔(271)

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مشرکوں نے نبی کریم ﷺ سے کہا، آپ اپنے رب کا نسب بیان کیجیے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔ (ترمذی)

نبی کریم ﷺ کی بعثت سے قبل ہر طرف شرک کا دور دورہ تھا۔ بت پرست درجنوں خداؤں کی پوجا میں مبتلا تھے۔ خدا کو ایک ماننے کا دعویٰ کرنے کے باوجود عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا اور یہود حضرت عُزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ مجوس آگ کی پوجا کرتے اور صابی ستاروں کی۔ مشرکینِ مکہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہا کرتے جبکہ بعض خدا تعالیٰ کے وجود ہی کے منکر تھے۔

ان حالات میں خالق ومالکِ کائنات کی ذات وصفات کا صحیح تصور قائم کرنے اور ہر قسم کی گمراہی کا پردہ چاک کرنے کے لیے یہ سورت مبارکہ نازل ہوئی۔ اس سورت کو قرآن مجید کے آخر میں رکھنے کی ایک حکمت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ چونکہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا مختصر مگر جامع تعارف موجود ہے اور لفظ قُلْ سے نبی کریم ﷺ کی نبوت ورسالت کی طرف اشارہ ہے اس لیے اسے بنیادی عقائد کے خلاصے کے طور پر قرآن کریم کے آخر میں رکھا گیا۔

قُلْ اور عظمتِ مصطفیٰ:

رب تعالیٰ نے لفظ قُلْ سے سورت کا آغاز فرمایا۔ اس سے قبل ایسا ہو چکا تھا کہ لوگوں نے کسی نیک بندے میں کوئی خاص کمال دیکھا تو اسے خدا کا شریک بنا لیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب رسول ﷺ کو "الکوثر" یعنی بے شمار خوبیاں اور کمالات عطا فرما کر اپنی توحید بیان کرنے کا حکم دیا۔ یعنی اے محبوب رسول ﷺ! اے عبدِ کامل!

میری توحید اور عظمت تم ارشاد فرماؤ۔ کیونکہ میں نے تمہیں وہ طاقت عطا کی ہے کہ تم اشارہ کرتے ہو تو چاند دو ٹکڑے ہو جاتا ہے، تم چاہو تو ڈوبا ہوا سورج پلٹ آتا ہے، تم حکم دیتے ہو کنکر کلمہ پڑھنے لگتے ہیں، تمہاری مرضی ہو تو تمہاری انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری ہو جاتے ہیں، تم اپنا ہاتھ

271... خزائن العرفان، الاخلاص، تحت الایۃ: 1

بڑھاتے ہو تو جنت میں انگور کا خوشہ پکڑ لیتے ہو، تم زمین پر کھڑے ہو کر حوضِ کوثر کو بھی دیکھتے ہو اور قبروں کے اندر کا حال بھی جانتے ہو، تمہیں اس قدر علومِ غیبیہ عطا کیے ہیں کہ کائنات کی تخلیق سے لے کر جنتیوں کے جنت میں اور دوزخیوں کے دوزخ میں جانے تک کے تمام حالات تمہاری نگاہوں کے سامنے ہیں، تمہیں مَاکَانَ وَمَایَکُوْن (جو ہو چکا اور جو آئندہ ہو گا) کا علم عطا کیا، شاہد وشہید بنایا، رحمۃ للعالمین کا تاج تمہارے سر پر رکھا اور تمہیں سراجِ منیر بنایا، اس قدر کمالات اور عظمتوں کے باوجود جب تم کہو گے،

لا الٰہ الا اللہ، ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں'' تو پھر کسی کو جرأت نہ ہو سکے گی کہ وہ تمہیں خدا کا شریک ٹھہرائے یا اپنی خدائی کا دعویٰ کر سکے۔

محبت واطاعت میں اخلاص:

اس سورت کا مشہور نام سورۃ الاخلاص ہے۔ اخلاص کے معنی خالص کر دینے کے ہیں۔ یہاں اخلاص کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایک مانا جائے، صرف اسی کو عبادت کے لائق جانا جائے، اسی کی بندگی کی جائے اور سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب رسول ﷺ ہی سے محبت کی جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

{ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ط وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ٥ }

''تم فرماؤ! اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری عورتیں اور تمہارا کنبہ (خاندان) اور تمہاری کمائی کے مال اور وہ سودا جس کے نقصان کا تمہیں ڈر ہے اور تمہارے پسند کا مکان، یہ چیزیں اللہ اور اُس کے رسول اور اُس کی راہ میں لڑنے سے زیادہ پیاری ہوں تو راستہ دیکھو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم (یعنی عذاب) لائے، اور اللہ فاسقوں کو راہ نہیں دیتا''۔ (پ10، توبہ:24)

فطری بات ہے کہ آدمی جاننا چاہے گا کہ وہ جس سے محبت کرے اور جس کی بندگی کرے، وہ ہے کون؟ اس کی صفات کیا ہیں؟ جب اس کی ذات وصفات کے متعلق بندے کو صحیح علم ہی نہ ہو گا تو وہ اس

سے محبت اور اس کی بندگی کیسے کر سکے گا۔ یہ علم حاصل ہونا ہی ایمان کی بنیاد ہے۔

جب بندے کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو گی تو اسے اپنے رب سے محبت ہو گی اور جب اسے اپنے رب سے محبت ہو گی تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ رسول کریم ﷺ سے محبت کرے گا اور ان کی اطاعت کرنے لگ جائے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

{ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ }(پ3،ال عمران:31-32)

"اے محبوب! تم فرما دو کہ لوگو! اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میرے فرمانبر دار ہو جاؤ، اللہ تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ تم فرما دو کہ حکم مانو اللہ اور رسول کا"۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ کرنے والوں سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو نبی کریم ﷺ کی پیروی کرو۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ رب تعالیٰ کی معرفت و محبت حاصل ہونے کا لازمی نتیجہ رسول کریم ﷺ سے محبت و اطاعت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور آقا و مولیٰ ﷺ کی اطاعت ہی رب تعالیٰ کی بندگی کا سلیقہ اور شعور عطا کرتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

{مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ }(پ5،نساء:80)

"جس نے رسول کا حکم مانا بے شک اُس نے اللہ کا حکم مانا"۔

خود آقا و مولیٰ ﷺ نے سب لوگوں سے زیادہ اپنی محبت رکھنے کو ایمان کی بنیادی شرط قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ کا فرمانِ عالیشان ہے، لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ۔

"تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اُسے، اُس کے والدین، اُس کی اولاد اور سب لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں"۔ [272]

قرآن کریم میں بعض اعمالِ صالحہ کا سبب اللہ تعالیٰ کی محبت کو بتایا گیا ہے، مثلاً:

272...بخاری، کتاب الایمان،، حدیث:14

{وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ . . .}

”اور اللہ کی محبت میں اپنا عزیز مال دے رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں (کو)“۔(پ2،بقرہ:177)

{وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا}

”اور کھانا کھلاتے ہیں اس کی محبت پر مسکین اور یتیم اور اسیر کو“۔(پ29،دھر:8)

خلاصہ یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ سے محبت واطاعت اور اعمالِ صالحہ رب تعالیٰ سے محبت ہی کی نشانیاں ہیں۔

مشرکوں کے عقیدے:

قرآن کریم میں مذکور ہے کہ مشرکین بھی اللہ تعالیٰ کو مانتے تھے لیکن ان کے ذہنوں میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے متعلق صحیح تصور نہ تھا۔ارشادِ ربانی ہے،

{وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ}(پ21،عنکبوت:61)

”اور اگر تم ان سے پوچھو کس نے بنائے آسمان اور زمین، اور کام میں لگائے سورج اور چاند، تو ضرور کہیں گے اللہ نے، تو کہاں اوندھے جاتے ہیں“۔

{قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ}

”تم فرماؤ! تمھیں کون روزی دیتا ہے آسمان اور زمین سے، یا کون مالک ہے کان اور آنکھوں کا، اور کون نکالتا ہے زندہ کو مُردے سے، اور (کون) نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے، اور کون تمام کاموں کی تدبیر کرتا ہے؟ تو اب کہیں گے کہ اللہ۔ تو تم فرماؤ! تو کیوں نہیں (اللہ سے) ڈرتے؟“۔(پ11،یونس:31)

اللہ تعالیٰ کے متعلق اتنا کچھ جاننے کے باوجود ان کا شرک اور گمراہی یہ تھی کہ وہ اپنے بتوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر اور شریک ٹھہراتے نیز وہ اپنے بتوں کو بھی معبود سمجھتے تھے۔ قرآن حکیم میں ہے کہ قیامت میں مشرکین اپنے بتوں سے کہیں گے،

{تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍo اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ}

"اللہ کی قسم! بیشک ہم کھلی گمراہی میں تھے، جب کہ تمہیں رب العالمین کے برابر ٹھہراتے تھے"۔(پ19، شعراء:97-98،)

انہوں نے یہ بھی کہا کہ اتنی ساری مخلوق کے لیے ایک خدا کیسے کافی ہو سکتا ہے۔

{اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ}(پ23،ص:5)

"کیا اس نے بہت خداؤں کا ایک خدا کر دیا، بیشک یہ عجیب بات ہے"۔

قرآن عظیم نے ان کا یہ قول بھی بیان کیا ہے،

{مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى}

"ہم تو انہیں (یعنی بتوں کو) صرف اتنی بات کے لیے پوجتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے پاس نزدیک کر دیں"۔(پ23،زمر:3،)

وہ بتوں کو صرف سفارشی نہیں سمجھتے بلکہ ان کی عبادت کرتے اور انہیں اللہ تعالیٰ کا ہمسر اور شریک قرار دیتے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

{وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِیْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا}(پ8،انعام:136)

"اللہ نے جو کھیتی اور مویشی پیدا کیے ان میں اسے ایک حصہ دار ٹھہرایا، تو بولے، یہ اللہ کا ہے ان کے خیال میں اور یہ ہمارے شریکوں (یعنی بتوں) کا"۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ مشرکین اللہ تعالیٰ کو وحدہٗ لاشریک ماننے کے لیے تیار نہیں تھے اس لیے وہ بتوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں شریک ٹھہراتے اور ان کی عبادت کیا کرتے تھے۔ ایک اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ مشرکین بتوں کو رب کا محض شریک نہ سمجھتے بلکہ رب کے مقابل ٹھہراتے اور ان کی خاطر رب تعالیٰ کو گالیاں دینے میں بھی عار محسوس نہ کرتے۔ اسی لیے مسلمانوں کو حکم دیا گیا،

{وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَیْرِ عِلْمٍ}

"اور انہیں (یعنی بتوں کو) گالی نہ دو جن کو وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں کہ وہ (مشرک) اللہ کی شان میں بے ادبی کریں گے زیادتی اور جہالت سے"۔(پ7،انعام:108)

هُوَاللّٰہُ اَحَدٌ:

قرآن کریم نے مشرکین اور دیگر تمام باطل ادیان کے غلط نظریات کی نفی کی اور جگہ جگہ رب تعالیٰ کی ذات وصفات کا مختلف پہلوؤں سے تعارف کرایا۔ کہیں فرمایا،

{اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ج اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّ لَانَوْمٌ ط لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط مَنْ ذَاالَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ط یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖٓ اِلَّا بِمَاشَآءَ وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَ لَا یَءُوْدُہٗ حِفْظُھُمَا وَھُوَالْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ}

"اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ آپ زندہ اور اوروں کا قائم رکھنے والا ہے، اُسے نہ اونگھ آئے نہ نیند، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں، وہ کون ہے جو اُس کے یہاں سفارش کرے بغیر اس کے حکم کے، جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے، اور وہ نہیں پاتے اُس کے علم میں سے مگر جتنا وہ چاہے، اُس کی کرسی میں سمائے ہوئے ہیں آسمان اور زمین، اور اُسے بھاری نہیں ان کی نگہبانی، اور وہی ہے بلند بڑائی والا"۔(پ3،بقرہ:255)

کہیں فرمایا،{اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ ثُمَّ رَزَقَکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ ھَلْ مِنْ شُرَکَآئِکُمْ مَّنْ یَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِکُمْ مِّنْ شَیْءٍ سُبْحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ}

"اللہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا پھر تمہیں روزی دی، پھر تمہیں مارے گا پھر تمہیں جِلائے (زندہ کرے) گا، کیا تمہارے شریکوں میں بھی کوئی ایسا ہے جو ان کاموں میں سے کچھ کرے، پاکی اور برتری ہے اسے اُن کے شرک سے"۔(پ21،روم:40)

{اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْبَتْنَا بِہٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَھْجَۃٍ مَّا کَانَ لَکُمْ اَنْ تُنْبِتُوْا شَجَرَھَا ءَاِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ ط بَلْ ھُمْ قَوْمٌ یَّعْدِلُوْنَ}(پ20، نمل:60،)

"یا وہ جس نے آسمان وزمین بنائے، اور تمہارے لیے آسمان سے پانی اتارا، تو ہم نے اس سے باغ اُگائے رونق والے، تمہاری طاقت نہ تھی کہ ان کے پیڑ اُگاتے، کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا ہے؟ بلکہ وہ (مشرک) لوگ راہ سے کتراتے ہیں"۔

{ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ}

”وہ ہے اللہ تمہارا رب! ہر چیز کا بنانے والا، اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں، تو کہاں اوندھے جاتے ہو“۔(پ24، مومن:62)

سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ سے کسی دہریے نے پوچھا، اللہ کے وجود پر کیا دلیل ہے؟ آپ نے فرمایا: اگر میں کہوں کہ ایک درخت خود بخود کٹا، خود بخود اس کی لکڑی کے تختے بنے، پھر خود بخود وہ جُڑ کر کشتی بنی اور وہ سمندر میں چلنے لگی اور پھر بغیر کسی چلانے والے وہ کشتی خود بخود سمندری طوفانوں کے باوجود منزلِ مقصود پر پہنچ گئی۔

وہ بولا، یہ کیسے ممکن ہے کہ خود بخود درخت کٹے، خود بخود تختے بنیں، خود بخود جُڑ کر کشتی بن جائے اور پھر بغیر چلانے والے کے وہ خود بخود منزل پر پہنچ جائے؟ آپ نے فرمایا: جب ایک چھوٹی سی کشتی بغیر بنانے والے کے بن نہیں سکتی اور بغیر چلانے والے کے چل نہیں سکتی تو پھر اتنی بڑی کائنات خود بخود کیسے بن سکتی ہے اور اس کا نظام کسی چلانے والے کے بغیر کیونکر چل سکتا ہے!!!

رب تعالیٰ کا ذاتی نام ”اللہ“ ہے۔ اس لیے جب اللہ کہا جاتا ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ کی تمام صفات آجاتی ہیں۔ یہ سورت عقیدۂ توحید کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہے اس لیے رب تعالیٰ کی معرفت کا سمندر صرف ان چار آیات کے کُوزے میں سمو دیا گیا۔ ارشاد ہوا: قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔ ”تم فرماؤ! وہ اللہ ہے وہ ایک ہے“۔

اَحَدٌ کے معنی ہیں یکتا، اکیلا، بے مثل، منفرد۔ اَحَدٌ اس ایک کو کہتے ہیں جس کی مثل کوئی دوسرا نہ ہو۔ یعنی جو اپنی ذات اور صفات و کمالات میں بالکل منفرد اور یکتا ہو۔ اکیلا اور یکتا ہونے کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیشہ سے ہے اس لیے جب کوئی نہیں تھا تو وہ موجود تھا۔ اگر اللہ بھی ہمیشہ سے ہو اور کوئی دوسرا بھی ہمیشہ سے ہو تو یہ ممکن نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات اور صفات دونوں میں یکتا اور بے مثل ہے۔ اگر کوئی دوسری ہستی اس کی کسی صفت میں بعینہٖ شریک مان لی جائے تو پھر اس کا یکتا ہونا، ممکن نہ رہے گا جو کہ محال ہے۔

اَللّٰهُ الصَّمَدُ:

صمد کے معنی اُس ذات کے ہیں جو کسی کی محتاج نہ ہو اور سب اُس کے محتاج ہوں۔ وہ ہستی سب کی

خالق ومالک اور حاجت روا اور مشکل کشا ہو۔ اس کے صمد ہونے کا تقاضا ہے کہ وہی معبود ہو کیونکہ انسان بندگی اسی کی کرتا ہے جس کا وہ ہر لمحہ محتاج ہو، اور جو خود کسی کا محتاج ہو وہ معبود نہیں ہو سکتا۔

قرآن کریم کا مطالعہ کرنے والوں کے اذہان میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بعض صفات بندوں کی طرف منسوب فرمائی ہیں مثلاً انسان کے لیے سمیع و بصیر ہونا(پ29، دھر:2)، زندہ ہونا(پ17،انبیاء:30)، مومن ہونا(26 الحجرات:10)، حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے حفیظ و علیم ہونا(پ12،یوسف:55)، حضرت جبریل علیہ السلام کے لیے بیٹا دینا(پ16،مریم:19) ،فرشتوں اور مومنوں کے لیے مددگار ہونا(پ28، تحریم:4)، نبی کریم ﷺ کے لیے رؤف ورحیم (پ11،توبہ:128)، شہید بمعنی گواہ(پ2،بقرہ:143)شاھد بمعنی حاضر وناظر (پ22،احزاب:45)، مددگار(پ6،المائدہ:55)، غنی کرنا(پ10،توبہ:74) بیان ہوا ہے، یہ شرک کیوں نہیں؟ نیز انبیاء و اولیاء سے مدد مانگنا شرعاً کیسا ہے؟

پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ شرک کیا ہے؟ شرح عقائد ص ۱۶ پر تحریر ہے،

اَلْاِشْرَاکُ ھُوَ اِثْبَاتُ الشَّرِیْکِ فِی الْاُلُوْھِیَّۃِ بِمَعْنٰی وُجُوْبِ الْوُجُوْدِ کَمَا لِلْمَجُوْسِ اَوْ بِمَعْنٰی اسْتِحْقَاقِ الْعِبَادَۃِ کَمَا لِعَبَدَۃِ الْاَصْنَامِ۔(273)

یعنی شرک یہ ہے کہ کوئی اُلوہیت میں کسی کو شریک کرے بمعنی وجوبِ وجود میں جیسا کہ مجوسی کرتے ہیں یا بمعنی عبادت کا مستحق ہونے میں جیسا کہ بت پرست کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ شرک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو واجبُ الوجود (جس کا وجود ہر حال میں ضروری ہو، جو ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہے) یا عبادت کا مستحق سمجھا جائے۔

قرآنی تعلیم یہ ہے کہ مذکورہ صفات اللہ تعالیٰ کے لیے ذاتی ، واجب،ازلی، ابدی، لامحدود ولامتناہی شان کی حامل ہیں جبکہ انبیاء واولیاء کو یہ صفات اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہیں اس لیے ان کی یہ صفات عطائی، ممکن، حادث،عارضی، محدود ومتناہی شان کی حامل ہیں۔ اتنے فرق ہوتے ہوئے شرک کا شبہ کرنا بھی جہالت ہے۔

273...شرح عقائد، ص25

عموماً محبوبانِ خدا سے مدد مانگنے میں زیادہ اختلاف کیا جاتا ہے۔ ضد اور تعصب سے ہٹ کر اس مسئلہ کو قرآن کریم کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

استعانت دو قسم کی ہے۔ حقیقی اور مجازی۔

حقیقی استعانت یہ ہے کہ کسی کو قادر بالذات، مالک مستقل اور حقیقی مددگار سمجھ کر اس سے مدد مانگی جائے یعنی اسکے متعلق یہ عقیدہ ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کے بغیر خود اپنی ذات سے مدد کرنے کی قدرت رکھتا ہے، غیر خدا کے لیے ایسا عقیدہ رکھنا شرک ہے اور کوئی مسلمان بھی انبیاء علیہم السلام اور اولیاء عظام کے متعلق ایسا عقیدہ نہیں رکھتا۔

مجازی استعانت یہ ہے کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کی مدد کا مظہر، حصولِ فیض کا ذریعہ اور قضائے حاجات کا وسیلہ جان کر اُس سے مدد مانگی جائے یعنی اس کے متعلق یہ عقیدہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کا یہ بندہ اللہ تعالیٰ کی عطا اور رضا سے مدد کر سکتا ہے۔ یہ قطعاً حق ہے اور قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ قرآن کریم سے چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو مددگار بنانے کی دعا کی جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔ (پ16، طٰہٰ:36)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں سے مدد مانگی۔ (پ3، ال عمران:52، پ28، صف:۱۴)

ایمان والوں کو صبر اور نماز سے مدد مانگنے کا حکم دیا گیا۔ (پ2، بقرہ:153)

حضرت ذوالقرنین نے لوگوں سے مدد مانگی۔ (پ16، کہف:95)

نیک کاموں میں مسلمانوں کو مددگار بننے کا حکم دیا گیا۔ (پ6، مائدہ:2)

ایک مقام پر صالحین اور فرشتوں کا مددگار ہونا یوں بیان فرمایا گیا،

{فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ}

"تو بیشک اللہ ان کا مددگار ہے اور جبریل اور نیک ایمان والے، اور اس کے بعد فرشتے مددگار ہیں"۔ (پ28، تحریم:4،)

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ، حضور ﷺ اور صالحین کا مددگار ہونا یوں بیان ہوا،

{اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ

رٰکِعُوْنَ} (پ6،مائدہ:55)

''بیشک تمہارے مددگار تو صرف اللہ تعالیٰ اوراس کا رسول اور ایمان والے ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اورزکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے حضور جھکے ہوئے ہیں''۔

ان دلائل سے ثابت ہوا کہ حقیقی مددگار ومشکل کشا اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اُس کی عطا سے اُسکے محبوب بندے بھی مددگار ہوتے ہیں۔پس اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کو اللہ کی مدد کامظہر جان کر اُن سے مدد مانگنا شرک نہیں۔(274)

یہ عقیدہ ذہن نشین رہے کہ ہر مخلوق اپنی ہر خوبی اور ہر قدرت کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کی محتاج ہے۔مجدد ِبر حق اعلیٰ حضرت امام الشاہ احمد رضا محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تصنیف ''برکاتُ الامداد لِاھلِ الاستمداد''میں فرماتے ہیں:

''اس استعانت ہی کو دیکھیے کہ جس معنی پر غیر خدا سے شرک ہے یعنی قادر بالذات و مالک مستقل جان کر مدد مانگنا،ان معنوں میں ہی اگر بیماری کے علاج میں طبیب یا دوا سے استمداد کرے یا فقیری کی حاجت میں امیر یا بادشاہ کے پاس جائے یا انصاف کرانے کو کسی کچہری میں مقدمہ لڑائے بلکہ کسی سے روزمرہ کے معمولی کاموں میں مدد لے جو یقیناً تمام منکر حضرات روزانہ اپنی عورتوں،بچوں، نوکروں سے کرتے کراتے رہتے ہیں مثلاً یہ کہنا کہ فلاں چیز اٹھادے یا کھانا پکادے،سب قطعی شرک ہے جب کہ یہ جانا کہ اس کام کے کر دینے پر خود انہیں اپنی ذات سے بے عطائے الٰہی قدرت ہے تو صریح کفر وشرک میں کیا شبہ رہا؟

اور جس معنی پر ان سب سے استعانت شرک نہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی مدد کا مظہر،واسطہ،وسیلہ اور سبب جان کر؛تو انہی معنوں میں انبیاء کرام واولیاء عظام سے مدد مانگنا شرک کیونکر ہوگا؟''۔

جب ہم آقا ومولیٰ ﷺ یا کسی صحابی (رضی اللہ عنہ) یا اللہ تعالیٰ کے کسی ولی سے مدد مانگتے ہیں تو ہمارا یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مدد کرنے کی قدرت عطا فرمائی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قدرت اور اسکی مرضی سے ہماری مدد کریں گے،اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہے تو یہ ہماری مدد نہیں کر سکتے۔پس

274...اسلامی عقائد:۱۵،ملخصًا

محبوبانِ خدا کو مدد گار و متصرف سمجھنا اور ان سے مدد مانگنا ہر گز شرک نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا مدد گار و مشکل کشا ہونا بالذات اور مخلوق سے بے نیاز و غنی ہو کر ہے جبکہ انبیاء کرام، اولیاء عظام اور مومنوں کا مدد گار و مشکل کشا ہونا اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہے اور یہ سب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے محتاج ہیں نیز ان کا تصرف واختیار اور انکی طاقت وقدرت اِذنِ الٰہی کے تابع ہے۔

لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے، {وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا}

"اور کافر بولے، رحمٰن نے اولاد اختیار کی"۔(پ16، مریم:88)

مشرکین فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دیا۔ ان تمام گمراہ باتوں کا جواب سورۃ الاخلاص میں دیا گیا۔

پہلے فرمایا، اللہ تعالیٰ ایک اور یکتا ہے، اللہ بے نیاز ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ واجبُ الوجود ہے یعنی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ چونکہ اولاد باپ کی جنس سے ہوتی ہے اس لیے رب تعالیٰ کی اگر اولاد ہوتی تو وہ بھی واجب اور قدیم ہوتی، اور جو پیدا ہو وہ واجب اور قدیم نہیں ہو سکتا کہ پیدا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ پہلے نہیں تھا۔ لہٰذا رب تعالیٰ اولاد سے پاک ہے۔

عقلی طور پر دیکھا جائے تو اولاد کی ضرورت کبھی اس لیے ہوتی ہے کہ وہ باپ کی معاون و مدد گار ہو اور کبھی اس لیے کہ وہ اس کے مرنے کے بعد اس کی جانشین ہو۔ اللہ تعالیٰ فنا ہونے سے پاک اور ہمیشہ رہنے والا ہے اس لیے وہ ان میں سے کسی شے کا محتاج نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے اور پاک رہے گا۔

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ:

اس سورت مبارکہ میں شرک کی تمام اقسام کی نفی کر دی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات کا خلاصہ بیان فرما دیا گیا ہے۔ "کُفُواً" کا مطلب ہے، مثل، ہمسر، ہم پلہ، برابری کرنے والا، جوڑ کا۔ جب اللہ تعالیٰ یکتا، بے مثل، بے نیاز اور اولاد سے پاک ہے تو اس کے جوڑ کا کوئی کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس آیت

کریمہ میں اُن کافروں کا رَدّ موجود ہے جو بتوں کو رب تعالیٰ کا ہمسر جان کر اُنہیں پوجتے تھے۔

علماء فرماتے ہیں کہ شرک کبھی عدد میں ہوتا ہے، "اَحَدٌ" فرما کر اس کی نفی کر دی گئی، شرک کبھی منصب و مرتبہ میں کیا جاتا ہے، "اَلصَّمَدُ" فرما کر اس کا رَدّ فرما دیا گیا، شرک کبھی نسب میں ہوتا ہے، "لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ" فرما کر اس کی تردید کر دی گئی، اور شرک کبھی کوئی کام کرنے اور اثر اندازی میں کیا جاتا ہے، "وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ" فرما کر اس کی بھی نفی کر دی گئی۔ عقیدۂ توحید کے اس جامع بیان کی وجہ سے اسے سورۃ الاخلاص کہتے ہیں۔[275]

اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد یا کوئی ہمسر قرار دینا رب تعالیٰ کو گالی دینے کی مثل ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، بنی آدم نے مجھے جھٹلایا اور یہ اسے مناسب نہ تھا، اور اس نے مجھے گالی دی اور یہ اسے مناسب نہ تھا۔ اس کا مجھے جھٹلانا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے، میں اسے دوبارہ پیدا نہیں کر سکوں گا حالانکہ دوبارہ پیدا کرنا پہلی بار پیدا کرنے سے زیادہ مشکل نہیں ہے۔ اس کا مجھے گالی دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کہتا ہے، 'اللہ کی اولاد ہے' حالانکہ میں اکیلا ہوں، بے نیاز ہوں، نہ میری کوئی اولاد ہے اور نہ میں کسی کی اولاد ہوں، اور میرے جوڑ کا تو کوئی ہے ہی نہیں۔[276]

275... تفسیر عزیزی، اخلاص، تحت الآیۃ: 3

276... بخاری، کتاب التفسیر، حدیث: 4974

تفسیر سورۃ الفلق

سورۃ الفلق صحیح قول کے مطابق مدینہ میں نازل ہوئی۔ اس میں پانچ آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ ﴿۱﴾ مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ ﴿۲﴾ وَ مِنۡ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ﴿۳﴾ وَ مِنۡ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الۡعُقَدِ ﴿۴﴾ وَ مِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ﴿۵﴾

”تم فرماؤ! میں اُس کی پناہ لیتا ہوں جو صبح کا پیدا کرنے والا ہے، اُس کی سب مخلوق کے شر سے، اور اندھیری ڈالنے والے کے شر سے جب وہ ڈوبے، اور ان عورتوں کے شر سے جو گرہوں میں پھونکتی ہیں، اور حسد والے کے شر سے جب وہ مجھ سے جلے“۔

(کنز الایمان از اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ)

لفظی ترجمہ:

قُلۡ	اَعُوۡذُ	بِ	رَبِّ	الۡفَلَقِ
کہہ دو	میں پناہ لیتا ہوں	کی	رب	صبح (کے)

مِنۡ	شَرِّ	مَا	خَلَقَ
سے	برائی	جو	پیدا کیا اس نے

وَ	مِنۡ	شَرِّ	غَاسِقٍ	اِذَا	وَقَبَ
اور	سے	برائی	اندھیرا کرنے والے (کی)	جب	چھا جائے وہ

وَ	مِنۡ	شَرِّ	النَّفّٰثٰتِ	فِی	الۡعُقَدِ
اور	سے	برائی	پھونکیں مارنے والی عورتوں (کی)	میں	گرہوں

وَ	مِنۡ	شَرِّ	حَاسِدٍ	اِذَا	حَسَدَ
اور	سے	برائی	حسد کرنے والے (کی)	جب	وہ حسد کرے

ربط و مناسبت:

قرآن مجید کا آغاز سورۃ الفاتحہ سے ہوا جو کہ ایک ایمان افروز دعا ہے۔ اس میں صراطِ مستقیم کی ہدایت طلب کی گئی تھی جس کے جواب میں قرآن کریم کی تمام سورتیں مومن کے لیے مشعلِ راہ بنیں یہاں تک کہ سورۃ اخلاص میں عقیدۂ توحید کا خلاصہ بیان فرما دیا گیا۔ اب ضرورت تھی کہ صراطِ مستقیم پر گامزن رہنے کے لیے اور توحید و رسالت کے خزانوں کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طاقتور پناہ طلب کی جائے۔

گویا سورۃ اخلاص میں ایمان کی دولت عطا ہوئی تھی، اب اس دولت کی حفاظت کا طریقہ بتایا جا رہا ہے۔ رب تعالیٰ نے کتابِ مبین کے آخر میں یہ دو سورتیں نازل فرمائیں جنہیں معوذتَین یعنی پناہ میں لانے والی سورتیں بھی کہا جاتا ہے۔

عام مشاہدہ ہے کہ بندہ ہر اُس چیز سے پناہ چاہتا ہے جسے وہ اپنے لیے نقصان دہ سمجھتا ہے اور ہر اُس ذات کی پناہ لیتا ہے جس کے متعلق اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ اس کی مدد کرنے اور اسے پناہ دینے پر قدرت رکھتا ہے۔ اگر باہر کوئی خطرہ ہو تو ہم گھر میں داخل ہو جاتے ہیں، اگر بیماری سے نقصان کا خوف ہو تو اچھے ڈاکٹر سے مدد لیتے ہیں، اسی طرح جس قسم کی مصیبت کا سامنا ہو، اُسی طرح کا سہارا اختیار کرتے ہیں۔

باری تعالیٰ نے جب ابلیس کو اپنی بارگاہ سے مردود قرار دیکر نکال دیا تو اس نے کہا،

"میں ضرور تیرے سیدھے راستے پر ان کی تاک میں بیٹھوں گا، پھر ضرور میں ان کے پاس آؤں گا، ان کے آگے اور ان کے پیچھے اور ان کے دائیں اور ان کے بائیں سے، اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا"۔ (پ8، اعراف:17)

اولیاء کرام فرماتے ہیں، جب تمہارا مقابلہ ایک ایسے دشمن سے ہے جو تمہیں دیکھتا ہے اور تم اُسے نہیں دیکھ سکتے تو پھر تمہیں چاہیے کہ تم اُس طاقتور رب تعالیٰ کی پناہ میں آجاؤ جو تمہارے دشمن کو دیکھتا ہے مگر وہ تمہارے رب کو نہیں دیکھ سکتا۔ تمہارا رب تمہیں اس دشمن سے بچانے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔

سورۃ الفلق اور سورۃ الناس میں سب سے پہلے بندہ اپنے محتاج ہونے کا اقرار کرتا ہے کہ ''اے اللہ! اے میرے رب! میں شیطان کا مقابلہ کرنے اور اُسکے شر سے اپنے آپ کو بچانے کی طاقت نہیں رکھتا، اس لیے میں تیری طاقتور پناہ چاہتا ہوں''۔

بندے اور رب کے درمیان یہ تعلق ہی بندگی کی اساس اور اصل ہے۔ سورۃ الاخلاص میں صَمَدُ کے معنی یہی بیان ہوئے کہ وہ ذات جو سب سے بے نیاز ہو اور جس کے سب ہی محتاج ہوں۔

اس سے یہ ربط بھی واضح ہو گیا کہ سابقہ سورت میں شانِ صمدیت بیان ہوئی تھی اب اسے عملی طور پر ظاہر کرنے کے لیے بندے کو حاجتمند ہونے کا سلیقہ سکھایا جا رہا ہے۔ اگر بندہ رب تعالیٰ کی بارگاہ میں خود کو حقیر و محتاج نہ سمجھے تو وہ پناہ کا طلبگار نہ ہو گا اور نہ ہی صرف زبان سے یہ کلمات ادا کرنے پر اُسے پناہ مل سکے گی۔

شانِ نزول:

سورۃ الفلق اور سورۃ الناس ایک ساتھ اُس وقت نازل ہوئیں جب لَبید بن اعصم یہودی اور اس کی بیٹیوں نے حضور سیدِ عالم ﷺ پر جادو کیا اور حضور کے جسم مبارک اور ظاہری اعضاء پر اس کا اثر ہوا (کمزوری ظاہر ہونے لگی) لیکن قلب و عقل و اعتقاد پر کچھ اثر نہ ہوا۔ چند روز بعد جبریل علیہ السلام آئے اور عرض کیا، ایک یہودی نے آپ پر جادو کیا ہے اور جادو کا سامان فلاں کنوئیں میں ایک پتھر کے نیچے دبا دیا ہے۔

حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ انہوں نے پانی نکالنے کے بعد پتھر اٹھایا تو اس کے نیچے سے جادو کا سامان نکلا جس میں ایک ڈورا بھی تھا جس میں گیارہ گرہیں لگی ہوئی تھیں۔ وہ بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سورتیں نازل فرمائیں۔ ان دونوں سورتوں میں گیارہ آیتیں ہیں۔ ہر ایک آیت پڑھنے کے ساتھ ایک گرہ کھولتے رہے، اس طرح سب گرہیں کھل گئیں اور حضور ﷺ بالکل تندرست ہو گئے۔

احادیث مبارکہ میں ان دو سورتوں کے کثیر فضائل بیان ہوئے ہیں۔ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں آقا کریم ﷺ کے ساتھ سفر میں تھا کہ اچانک تاریکی اور آندھی نے ہمیں گھیر لیا۔

حضور ﷺ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کے ذریعے پناہ مانگنے لگے اور فرمایا، اے عقبہ! ان دونوں سورتوں کے ذریعے پناہ لو کیونکہ کوئی پناہ لینے والا ان دو سورتوں کی مثل کسی اور چیز سے پناہ نہیں لے سکتا۔ (ابو داوٗد)

قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ:

رب کے معنی ہیں پالنے والا، تربیت واحسان کرنے والا، خالق و مالک۔ فَلَق کے لغوی معنی 'پھاڑنے' کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد صبح ہے جو رات کی تاریکی کو پھاڑ کر باہر نکلتی ہے۔ رب تعالیٰ کی صفت {فَالِقُ الۡاِصۡبَاحِ} بھی بیان ہوئی ہے۔

ایک تفسیر یہ ہے کہ فَلَق سے مراد تمام مخلوق کو وجود میں لانا ہے۔ علامہ آلوسی رقمطراز ہیں، "فَلَق کا معنی عام ہے، اس میں تمام ممکن موجودات آگئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نورِ ایجاد سے ان کا پردۂ عدم چاک کرکے انہیں نکالا ہے"۔[277]

اس صفت کے ساتھ رب تعالیٰ سے پناہ مانگنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ بندہ یہ عقیدہ رکھے کہ جو رَب رات کے اندھیرے کو دنیا سے دور کر دینے پر قادر ہے وہ میری مشکل و پریشانی دور کرنے پر بھی قادر ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ رات کا اندھیرا اکثر جرائم و شرور کا سبب بنتا ہے اور صبح کا طلوع ہونا ان خطرات کو دور کرتا ہے۔ گویا اس میں اشارہ ہے کہ رب سے پناہ مانگو وہ تمام خطرات کو دور فرمائے گا۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ یہ صالحین کے دعا مانگنے اور اِستغفار کرنے کا وقت ہے اس لیے اس وقت اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگنے پر قبولیت کی قوی امید ہے۔ قرآن مجید میں متقین کی ایک صفت یہ بیان ہوئی: {وَبِالۡاَسۡحَارِ هُمۡ يَسۡتَغۡفِرُوۡنَ}

"وہ سحر کے وقت اِستغفار کرتے ہیں"۔ (پ26، ذاریات:18)

چوتھا سبب یہ ہے کہ فجر کا وقت رات اور دن کے فرشتوں کے جمع ہونے کا ہے۔ ارشاد ہوا: {اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ كَانَ مَشۡهُوۡدًا}

277...روح المعانی، فلق، تحت الآیۃ:1

"بیشک صبح کے قرآن میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں"۔(پ15،بنی اسرائیل:78)

صبح کے وقت سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کے ذریعے رب تعالیٰ سے پناہ مانگنے کا حکم اس حدیث پاک میں مذکور ہے۔

حضرت معاذ بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم صبح کی نماز کے وقت حضور ﷺ کا انتظار کر رہے تھے کہ آقا و مولیٰ ﷺ تشریف لائے اور فرمایا، سورۃ الاخلاص، سورۃ الفلق اور سورۃ الناس روزانہ صبح وشام تین تین بار پڑھا کرو، یہ تمہیں ہر چیز (مصیبت و پریشانی) سے کفایت کریں گی۔[278]

مُعَوِّذَتَین میں ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ سورۃ الفلق میں ایک ہی صفت یعنی "رب الفلق" کے ذریعے تین چیزوں یعنی تاریکی، جادو اور حاسد کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے جبکہ سورۃ الناس میں ایک چیز یعنی شیطان کے وسوسوں کے شر سے اللہ تعالیٰ کی تین صفات کے ذریعے پناہ مانگی گئی ہے، وہ صفات رب الناس، ملک الناس اور الٰہ الناس ہیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ دین وایمان کی حفاظت جسم وجان کی حفاظت سے مقدم ہے۔ شیطانی وسوسے دین کو نقصان پہنچاتے ہیں جبکہ تاریکی، جادو اور حسد جسم کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ:

اللہ تعالیٰ ساری کائنات کا خالق ومالک ہے اور اس کے سوا ہر چیز مخلوق ہے۔ مخلوق میں وہ چیزیں بھی ہیں جن کے شر اور نقصان دینے والا پہلو ہمارے علم میں ہے اور مخلوق میں وہ چیزیں بھی ہیں جن کے شر اور نقصان کے پہلو ہم نہیں جانتے۔

مخلوق میں مادّی چیزیں بھی شامل ہیں مثلاً دشمن، بیماری، موذی جانور وغیرہ، اور غیر مادّی یعنی روحانی چیزیں بھی داخل ہیں جو انسان کو رنج ومصیبت اور گناہ ومعصیت میں مبتلا کرتی ہیں لہٰذا انکے شر سے بچاؤ کے لیے رب تعالیٰ کی پناہ لینا ضروری ہے۔

ہمیں یہ تعلیم دی جارہی ہے کہ اس خالق ومالک کی پناہ میں آجائیں جو ہر چیز پر قدرت اور غلبہ رکھتا ہے اور وہی انسان کو ہر مخلوق کے شر اور ضرر سے بچا سکتا ہے۔

278...نسائی، کتاب الاستعاذۃ، حدیث:5438۔

جب بندہ اپنے رب کی پناہ میں آجائے تو وہ بندے کے ایمان کو مضبوطی عطا کرتا ہے اور پھر بندہ اگر اسباب کے لحاظ سے کسی بندے سے مدد مانگے یا کسی کے شر سے بچنے کے لیے حفاظتی تدابیر اختیار کرے تو اس میں اپنی رحمت شامل فرماتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارا بھروسہ ظاہری اسباب کے بجائے مسببُ الاسباب پر ہونا چاہیے۔

حضور ﷺ نے رب تعالیٰ پر کامل بھروسہ کرنے کی یہ دعا بھی تعلیم فرمائی، **اَللّٰھُمَّ لَامَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلَامُعْطِیَ لِمَامَنَعْتَ وَلَایَنْفَعُ ذَاالْجَدِّ مِنْکَ الْجَدُّ۔**

"اے اللہ! جو تو عطا فرمائے وہ کوئی روک نہیں سکتا، اور جو تو روک دے وہ کوئی دے نہیں سکتا، اور تیرے مقابل کسی کی بڑائی اس کو نفع نہیں دے سکتی"۔(279)

سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کی دعائیں اتنی جامع ہیں کہ بندہ ہر مخلوق سے رب کی پناہ میں آجاتا ہے۔ لیکن چار چیزوں کے شر سے خاص طور پر رب تعالیٰ نے پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی جن میں سے ایک کا ذکر سورۃ الناس میں آئے گا اور تین کا ذکر اسی سورت میں کیا گیا ہے۔ وہ تین چیزیں ہیں، اندھیری رات، جادوگر اور حاسد۔

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "اور اندھیری ڈالنے والے کے شر سے جب وہ ڈوبے، اور ان عورتوں کے شر سے جو گرہوں میں پھونکتی ہیں، اور حسد والے کے شر سے جب وہ مجھ سے جلے"۔

پہلے رات کے اندھیرے کا ذکر ہوا۔ رات میں کئی چیزوں کے شر اور خطرات پوشیدہ ہوتے ہیں۔ چور، ڈاکو، دشمن، جرائم پیشہ، زہریلے جانور، شہوانی جذبات، برے خیالات وغیرہ۔ گویا جب اندھیری رات چھا جائے تو کئی قسم کے ظاہر و پوشیدہ شر بندے پر حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ اس لیے رات کے اندھیرے کے شر سے رب تعالیٰ کی پناہ مانگنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اگر بندہ اپنے باطن پر غور کرے تو اس تاریکی سے گمراہی کا اندھیرا بھی مراد لیا جا سکتا ہے اور وہ تاریکی بھی جو گناہوں کی کثرت کی وجہ سے دل پر سیاہ داغ لگنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ان چیزوں سے بھی رب تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہیے۔

279...بخاری، کتاب الاذان، حدیث:844

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے چاند کی طرف نظر کر کے فرمایا، اے عائشہ ! اللہ کی پناہ مانگو اس کے شر سے، یہ اندھیری ڈالنے والا ہے جب ڈوبے۔ (ترمذی) یعنی قمری ماہ کے آخر میں جب چاند چھپ جائے تو جادو کے وہ عمل جو بیمار کرنے کے لیے ہیں، اسی وقت میں کیے جاتے ہیں۔[280]

النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ:

گرہوں میں پھونکنے والی عورتوں سے مراد جادو کرنے والی عورتیں ہیں۔ چونکہ لَبید یہودی کی بیٹیاں اپنے باپ کے ساتھ حضور ﷺ پر جادو کرنے میں شریک ہوئیں اس لیے جادو کی نسبت عورتوں کی طرف کی گئی اور بعض کے نزدیک اس لیے کہ جادوگری کا پیشہ عموماً عورتیں ہی کرتی تھیں۔

بعض کے نزدیک {النَّفّٰثٰت} میں وہ مرد و عورت دونوں داخل ہیں جو جادو کے کلمات پڑھ کر پھونکتے ہیں۔ جادو کے شر سے پناہ مانگنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ انسان اسے عام بیماری سمجھ کر دوا لیتا ہے اور تکلیف بڑھتی جاتی ہے۔ ڈاکٹری تدابیر اور قیمتی ادویات کسی کام نہیں آتیں اور انسان بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کا علاج معوذتین کے ذریعے رب تعالیٰ کی پناہ لینا ہے۔

حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ:

حسَد سے مراد ہے کسی کی نعمت وخوبی کو دیکھ کر جلنا اور یہ خواہش کرنا کہ یہ نعمت وراحت اُس سے چھِن جائے، خواہ مجھے ملے یا نہیں۔ جبکہ غبطہ یعنی رشک جائز ہے اس کے معنی ہیں، کسی کی نعمت کو دیکھ کر یہ آرزو کرنا کہ یہ نعمت مجھے بھی مل جائے۔

حسد گناہِ کبیرہ اور حرام ہے۔ یہی سب سے پہلا گناہ ہے جو آسمان میں ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام سے اور زمین میں قابیل نے اپنے بھائی سے کیا۔[281]

حسد اگر دل تک محدود رہے تو بھی اس کا ضرر نظرِ بد کی صورت میں پہنچ سکتا ہے اسی لیے حدیث شریف میں ارشاد ہوا: "نظر کا لگ جانا حق ہے" یعنی بُری نظر کے اثر سے نقصان پہنچتا ہے۔ حسد کرنے والا اپنی خباثت اور کمینگی کی وجہ سے ایسی تدبیریں سوچتا ہے جس کی وجہ سے اس کی ناپاک آرزو پوری

280... خزائن العرفان، فلق، تحت الآیۃ:2، ص1125

281... تفسیر قرطبی، فلق، تحت الآیۃ:5

ہو سکے۔

انسان نہ تو اپنے حاسدوں کو پہچان سکتا ہے اور نہ ہی ان کی خبیث تدبیروں سے آگاہ ہو سکتا ہے، اور اگر بالفرض آگاہ ہو بھی جائے تو ان کا مناسب تدارک نہیں کر سکتا۔ اس لیے اسے چاہیے کہ رب تعالیٰ کی طاقتور پناہ میں آجائے، کیونکہ وہی زبردست، قوت والا، ہر چیز پر قدرت رکھنے والا اور پناہ دینے والا ہے۔

تعویذ اور دَم جائز ہیں:

جن احادیث میں تعویذ یا دَم کرنے کی ممانعت آئی ہے اس سے وہ کلمات مراد ہیں جن میں کوئی شرکیہ بات ہو۔ قرآنی آیات، اسمائے حسنیٰ یا نبی کریم ﷺ کی زبانِ اقدس سے نکلے ہوئے دعائیہ کلمات میں سے کچھ لکھ کر تعویذ بنانا اور ایسے ہی آیات و احادیثِ مبارکہ کے کلمات پڑھ کر کسی پر دَم کرنا بالکل جائز ہے۔

علامہ خازن رحمہ اللہ نے لکھا ہے، بُرے اثر کو اتارنے کے لیے دَم کرنا اور اسی طرح شرعی مستحب تعویذوں میں دَم کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس میں بعض لوگوں کا اختلاف ہے۔ صحابہ کرام، تابعین اور بعد والوں میں سے جمہور نے اس کو جائز کہا ہے اور اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث بھی دلیل ہے۔

آپ فرماتی ہیں کہ رسولُ اللہ ﷺ کے گھر والوں میں سے کوئی بیمار ہوتا تو حضور ﷺ اس پر معوذات پڑھ کر دَم کرتے تھے۔[282]

آقا و مولیٰ ﷺ کا معمول تھا کہ آپ روز سونے سے قبل سورۃ الاخلاص، سورۃ الفلق اور سورۃ الناس پڑھ کر اپنے مبارک ہاتھوں پر دَم فرماتے اور انہیں اپنے جسمِ اقدس پر پھیر لیتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، جب حضور ﷺ بیمار ہو گئے تو آپ مجھے حکم دیتے کہ میں اسی طرح آپ کو دَم کروں۔[283]

---

282 ... مسلم، کتاب السلام، باب رقیۃ المریض بالمعوّذات والنّفث، حدیث:2192

283 ... بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب فضل المعوّذات، حدیث:5017

اس سے معلوم ہوا کہ رسولِ معظم ﷺ خود اپنے آپ کو دَم فرمایا کرتے تھے۔ آپ صحابہ کرام پر بھی دَم فرماتے تھے۔

حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک بار مجھے بچھو نے ڈنگ مارا۔ تو آقا و مولیٰ ﷺ نے مجھے دَم فرمایا اور دستِ اقدس پھیرا۔[284]

حضور ﷺ سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ و امام حسین رضی اللہ عنہ کو یہ کلمات پڑھ کر دَم کرتے تھے۔ اُعِیۡذُ کُمَا بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّآمَّۃِ مِنۡ کُلِّ شَیۡطَانٍ وَّ ھَآمَّۃٍ وَمِنۡ کُلِّ عَیۡنٍ لَّآمَّۃٍ۔[285]

”میں تم دونوں کے لیے اللہ کے پورے کلمات کے ذریعے پناہ چاہتا ہوں ہر شیطان کے شر سے، اور ایذا دینے والے جانور اور تکلیف پہنچانے والی آنکھ سے“۔

حضرت ابو سعید خُدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بار آقا و مولیٰ ﷺ بیمار ہو گئے تو جبریل علیہ السلام حاضر ہوئے اور انہوں نے حضور ﷺ کو دَم کیا۔ (صحیح مسلم)

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے بارگاہ نبوی میں عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! ہم جاہلیت میں جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے اب آپ کا کیا ارشاد ہے؟ فرمایا، جو الفاظ پڑھ کر تم دَم کرتے تھے وہ مجھے سناؤ، اگر اس میں کوئی شرکیہ بات نہیں تو جھاڑ پھونک میں کوئی حرج نہیں۔[286]

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جھاڑ پھونک سے منع فرما دیا۔ تو حضرت عمرو ابن حزم رضی اللہ عنہ کے خاندان والے آئے اور عرض کی، ہمارے پاس ایک عمل تھا جس سے ہم سانپ بچھو کے کاٹے ہوئے کو دَم کیا کرتے تھے۔ پھر انہوں نے وہ دَم پڑھ کر سنایا۔ نورِ مجسم ﷺ نے فرمایا: اس میں تو کوئی حرج نہیں ہے، پس تم میں سے جو اپنے کسی بھائی کو فائدہ پہنچا سکے تو ضرور پہنچائے۔[287]

284... مسند امام احمد بن حنبل، حدیث: 13278

285... بخاری، کتاب احادیث الانبیا، باب حدثنا موسیٰ بن اسماعیل، حدیث: 3371

286... مسلم، کتاب السلام، باب لا باس بالرقی... الخ، حدیث: 2200

287... مسلم، کتاب السلام، باب استحباب الرقیۃ من العین... الخ، حدیث: 2199

اُمُ المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک دن حضور ﷺ میرے پاس تشریف لائے۔ وہاں شفاء نامی ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی جو پھوڑے کا دَم کیا کرتی تھی۔ نورِ مجسم ﷺ نے فرمایا: تم یہ دَم حفصہ کو بھی سکھا دو۔[288]

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم سفر میں تھے کہ ہمارے پاس ایک لڑکی آئی اور اس نے کہا، ہمارے سردار کو بچھو نے ڈس لیا ہے۔ کیا تم میں کوئی اسے دَم کر سکتا ہے؟ ہم میں سے ایک شخص گیا اور اس نے سورۃ فاتحہ پڑھ کر اسے دَم کیا تو وہ ٹھیک ہو گیا۔[289]

صحابہ کرام کے زمانے میں بھی گلے میں تعویذ ڈالنے کا رواج تھا۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سمجھدار بچوں کو یہ دعا یاد کرا دیتے اور چھوٹے بچوں کے گلے میں اس کا تعویذ لکھ کر ڈال دیتے۔

اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّآمَّةِ مِنْ غَضَبِهٖ وَعِقَابِهٖ وَشَرِّ عِبَادِهٖ وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ وَاَنْ يَّحْضُرُوْنِ۔

"میں اللہ تعالیٰ کے پورے کلمات کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں اُس کے غضب اور عتاب سے، اور اس کے بندوں کے شر سے، اور شیاطین کے وسوسوں سے اور ان کے میرے پاس آنے سے (پناہ چاہتا ہوں)"۔[290]

---

288 ... ابو داود، کتاب الطب، باب فی الرقی، حدیث:3897

289 ... بخاری، کتاب الاجارۃ، باب مایعطی فی الرقیۃ علی احیاء العرب بفاتحۃ الکتاب، حدیث:2276

290 ... ترمذی، کتاب الدعوات، حدیث:3528

تفسیر سورۃ الناس

سورۃ الناس صحیح قول کے مطابق مدینہ میں نازل ہوئی۔ اس میں چھ آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ ﴿۱﴾ مَلِکِ النَّاسِ ﴿۲﴾ اِلٰہِ النَّاسِ ﴿۳﴾ مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ ۬ۙ الۡخَنَّاسِ ﴿۴﴾
الَّذِیۡ یُوَسۡوِسُ فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ ﴿۵﴾ مِنَ الۡجِنَّۃِ وَ النَّاسِ ﴿۶﴾

''اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا (ہے)''

''تم کہو! میں اُس کی پناہ میں آیا جو سب لوگوں کا رب، سب لوگوں کا بادشاہ، سب لوگوں کا خدا، اس کے شر سے جو دل میں بُرے خطرے ڈالے اور دُبک رہے، وہ جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں، جن اور آدمی''۔

لفظی ترجمہ:

قُلۡ	اَعُوۡذُ	بِ	رَبِّ	النَّاسِ
تم کہو	میں پناہ میں آیا	کی	رب	سب لوگوں (کے)

مَلِکِ	النّاسِ	اِلٰہِ	النَّاسِ
(جو) بادشاہ	سب لوگوں کا	معبود، خدا	سب لوگوں کا

مِنۡ	شَرِّ	الۡوَسۡوَاسِ	الۡخَنَّاسِ
سے	برائی	وسوسہ ڈالنے والے	دبک جانے والے (کی)

الَّذِیۡ	یُوَسۡوِسُ	فِیۡ	صُدُوۡرِ	النَّاسِ
جو	وسوسے ڈالتا ہے	میں	دلوں	لوگوں (کے)

مِنَ	الۡجِنَّۃِ	وَ	النَّاسِ
(میں) سے	جنوّں	اور	انسانوں

ربط و مناسبت:

یہ قرآن کریم کی آخری سورت ہے۔ سورۃ الفلق کے آخر میں حاسد کے حسد سے پناہ مانگنے کی تلقین کی گئی۔ مسلمان کا سب سے بڑا حاسد شیطان ہے جو اس کو ایمان اور نیکیوں سے محروم کرنے کی کوششوں میں ہمیشہ مصروف رہتا ہے۔ اس لیے اس سورت میں شیطان اور اس کے چیلے جنات اور انسان نما شیاطین کے وسوسوں کے شر سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی جا رہی ہے تاکہ ہمارا ایمان محفوظ رہے۔

سورۃ الفلق میں دنیاوی آفات و مصائب سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی گئی ہے اور سورۃ الناس میں اُخروی آفات و خطرات کا سبب بننے والی چیزوں یعنی بُرے خیالات سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

سورۃ الفلق میں ان آفات و مصائب سے پناہ مانگی گئی ہے جو جسم و جان کو نقصان پہنچا سکتے ہیں جبکہ اس سورت میں شیطانی وسوسوں کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے جو مومن کے دین و ایمان کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سورۃ الفلق کے ذریعے انسان ہر قسم کے بیرونی شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آجاتا ہے اور سورۃ الناس کے ذریعے ہر قسم کے اندرونی شر سے رب تعالیٰ کی پناہ ملتی ہے۔

قُلْ اَعُوْذُ:

انسان کو اپنے ایمان کی حفاظت اور آقا و مولیٰ ﷺ کی اطاعت میں صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رہنے کے لیے شیطان کے شر کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے جو کہ اس کا ازلی دشمن ہے۔ اس لیے انسان کو کسی ایسی ہستی کے دامنِ کرم میں پناہ لینی ہو گی جو ہر شے پر قادر ہو اور جس کی ہدایت عطا کرنے کی قوت تمام گمراہیوں پر حاوی ہو۔

چنانچہ حکم دیا گیا کہ شیطان کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرو اور اپنے ایمان کی دولت کی حفاظت کرو۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کی پناہ لیتے ہوئے اُسکی اور اس کے حبیب ﷺ کی محبت و اطاعت میں زندگی گزارو گے تو شیطان تمہیں ہرگز گمراہ نہ کر سکے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار بندوں کے متعلق وہ بے بسی سے اعتراف کر چکا ہے کہ ان پر میرا کوئی قابو نہیں۔ رب تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے،

{اِنَّهٗ لَیۡسَ لَهٗ سُلۡطٰنٌ عَلَی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَلٰی رَبِّهِمۡ یَتَوَکَّلُوۡنَ}

”بیشک اس کا کوئی قابو ان پر نہیں جو ایمان لائے اور اپنے رب ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں“۔

(پ14، نحل:99)

بِرَبِّ النَّاسِ۔۔۔۔اِلٰهِ النَّاسِ:

شیاطین کے وسوسوں کے شر سے حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ کی ان تین صفات یعنی رب، بادشاہ اور معبود ہونے کا خاص تعلق ہے۔ رب کے معنی پالنے والے، تربیت کرنے والے اور اپنی نگرانی میں ابتدائی حال سے ترقی دیکر انتہائی حال یعنی درجہ کمال تک پہنچانے والے کے ہیں۔

اسی شانِ ربوبیت کا تقاضا ہے کہ بندوں کو نقصان دہ چیزوں اور گمراہی سے بچایا جائے اور ان کی روحانی نشوونما کے لیے انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث کیا جائے۔ جب ہم یہ تصور مضبوط کریں گے کہ اللہ تعالیٰ جو ہم انسانوں کا رب ہے، ہر لمحہ ہماری تربیت فرماتا ہے اور ہمیں شیاطین کے مقابل اسی کی پناہ چاہیے، اس ایمانی شعور کی بناء پر بندے کا تعلق اللہ تعالیٰ سے پختہ ہو جاتا ہے اور وسوسوں کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

پچھلی سورت میں رب کی نسبت فَلَق کی طرف کی گئی تھی اور یہاں انسانوں کی طرف کی گئی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہاں جسمانی آفات کا ذکر تھا جو کہ انسانوں کے علاوہ حیوانات کو بھی پہنچتی ہیں جبکہ یہاں شیطانی وسوسوں کی آفات کا ذکر ہے جس کا اصل نشانہ انسان ہیں اس لیے رب کی نسبت الناس کی طرف کی گئی ہے۔

بادشاہ یا مالک وہ ہوتا ہے جو اختیار اور قدرت رکھتا ہے اور اپنی رعایا کی حفاظت کے لیے تدبیر کرتا ہے۔ ہمارا حقیقی بادشاہ وہ ہے جو پوری کائنات کا خالق و مالک اور قادرِ مطلق ہے، اور وہ جس کام کا ارادہ فرمائے وہ فوراً ہو جاتا ہے۔ ایسا عظیم بادشاہ ہے کہ نہ اسے نیند آتی ہے نہ اونگھ۔ ایسی بلند شان والا ہے کہ زمین و آسمان کی کوئی چیز اس کے علم سے چھپ نہیں سکتی۔ ایسے علم و قدرت والے بادشاہ سے بڑھ کر کون شیطانی وسوسوں سے ہماری حفاظت کر سکتا ہے۔

اس کے بعد تیسری صفت بیان ہوئی، اِلٰهِ النَّاس۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہی سب لوگوں کا معبود ہے، اس

کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ معبود وہی ہوتا ہے جو خالق ورازق ہو، سب سے بلند وبرتر اور سب پر غالب ہو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا،

{قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ٥ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ}(پ18، مومنون:88-89)

"تم فرماؤ! کس کے ہاتھ ہے ہر چیز کا قابو؟ اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے خلاف کوئی پناہ نہیں دے سکتا، اگر تمہیں علم ہو۔ اب کہیں گے، یہ اللہ ہی کی شان ہے، تم فرماؤ! پھر کس جادو کے فریب میں پڑے ہو؟"۔

یعنی جب تم اقرار کرتے ہو کہ ہر چیز پر حقیقی قدرت واختیار اللہ تعالیٰ کا ہے اور اس کے خلاف کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا تو پھر شیطان کے دھوکے میں کیوں آتے ہو؟ شیطانی وسوسوں کی طرف مائل نہ ہونا کیونکہ بندوں کو اپنے معبود ہی کی اطاعت کرنی چاہیے۔ اپنے رحمان ورحیم رَب، اپنے حقیقی بادشاہ اور اپنے پیارے معبود کی پناہ میں آجاؤ جس کا حکم ہر وقت، ہر جگہ، ہر چیز پر نافذ ہے۔

الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاس...:

{وَسْوَسَه} سے مراد ہے ایسا خیال جس سے بندہ نیکی سے دور اور گناہ کی طرف مائل ہو۔{وَسْوَاس} دل میں بُرے خیالات ڈالنے والے کو کہتے ہیں اور بہت ہلکی آواز یا شکاری کے چلنے کی مخفی آواز کو بھی کہا جاتا ہے۔

شیطان کو اس لیے "وسواس" کہا گیا کیونکہ وہ مخفی کلام کے ذریعے لوگوں کو برائی کی طرف بلاتا ہے اور وہ مخفی کلام ایسا ہوتا ہے کہ اس کا مفہوم انسان کے دل ودماغ میں پہنچ جاتا ہے مگر اس کی آواز محسوس نہیں ہوتی۔

{الْخَنَّاس} کا معنی ہے پیچھے ہٹ جانے والا، دبک جانے والا، چھپ جانے والا۔ شیطان کو "خَنّاس" اسی لیے کہتے ہیں کیونکہ وہ انسان کے دل میں وسوسہ ڈال کر پیچھے ہٹ جاتا ہے تاکہ اسے محسوس نہ ہو کہ کوئی اسے بہکا رہا ہے۔

شیطانی وسوسہ انسان کے ذہن پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے

رسول ﷺ کی محبت و اطاعت سے غافل لوگوں کو تو فوراً ہی گناہ کی طرف مائل کرلیتا ہے جبکہ نیکی کی راہ پر چلنے والوں سے اس کی لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔

ہر چیز کی کوئی نہ کوئی غذا ہوتی ہے اور وسوسے کی غذا اس کی طرف توجہ دینا ہے۔ جس قدر وسوسے پر توجہ دی جائے اور اس کے متعلق سوچا جائے، اُسی قدر یہ طاقتور ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور اگر برائی کا خیال آتے ہی{ **اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم**} یا { **لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم** }پڑھ لیا جائے، یااپنی توجہ کسی اور نیکی کی طرف کرلی جائے تو وسوسہ بھی ذہن سے ہٹ جاتا ہے۔

جیسے حدیث شریف میں آیاہے کہ غصہ شیطان کی طرف سے ہے،اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا، اور آگ پانی سے بجھائی جاتی ہے ۔ اس لیے اگر کسی کو غصہ آئے تو اسے چاہیے کہ وہ وضو کرے۔ (291) دوسری حدیث پاک میں فرمایا گیا، جسے غصہ آئے وہ اگر کھڑا ہو تو بیٹھ جائے ورنہ لیٹ جائے۔ (292)

ان احادیث میں شیطانی اثر ”غصہ“ کے علاج میں ایک حکمت یہی سمجھ میں آتی ہے کہ بندے کو پوری کوشش سے شیطانی وسوسے کی طرف سے توجہ ہٹا لینی چاہیے تاکہ گناہ کے ارادے اور پھر اس پر عمل کی نوبت ہی نہ آسکے۔

شیطانی وسوسوں کا علاج تین چیزیں ہیں۔ اول: شیاطین کے مکر اور حیلوں کو پہچاننا جیسے کسی مکار فریبی کو یہ علم ہو کہ یہ میرے مکر وفریب کو جانتا ہے تو وہ اس سے نااُمید ہوتا ہے۔ دوم: اس کے وسوسوں کی طرف توجہ نہ کرنا، جیسے کتا بھونکتا ہو تو جس قدر اس کی طرف توجہ کریں وہ اور زیادہ بھونکتا ہے اور اگر توجہ نہ کریں تو کچھ دیر میں چپ ہو جاتا ہے۔ سوم: دل میں اور زبان سے اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ یاد کرنا، نیز ناجائز خواہشات اور غصہ سے دل کو پاک رکھنا۔ (293)

291... ابو داؤد، کتاب الادب، باب مایقال عند الغضب، حدیث:4784

292... ابو داؤد، کتاب الادب، باب مایقال عند الغضب، حدیث:4782

293... تفسیر عزیزی، الناس، تحت الایۃ:5

{خنّاس} کے مفہوم سے واضح ہے کہ شیطان کے وسوسوں کے مقابل خدا کے بندوں کی جنگ آخری سانس تک جاری رہتی ہے۔ کوئی انسان یہ نہ سمجھے کہ میں نمازی یا حاجی ہو گیا ہوں اس لیے اب شیطان مجھے وسوسہ اندازی نہیں کرے گا۔ شیطان اور اس کے چیلے یہ سلسلہ ختم نہیں ہونے دیتے۔ انسان کی یہ آزمائش اور نیکی و بدی کی یہ کشمکش عمر بھر جاری رہتی ہے۔

شیطان کی وسوسہ اندازی کے تین طریقے ہیں۔ یا وہ خود دل میں وسوسہ ڈالتا ہے یا اس کے چیلے جن اور انسان وسوسہ ڈالتے ہیں اور یا پھر انسان کا اپنا نفس وسوسہ ڈالتا ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ کے مشہور خطبہ میں یہ الفاظ بھی ہیں، وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا۔ ”ہم اپنے نفوس کی شرارتوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں“۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیطان انسان کا بہت طاقتور دشمن ہے اور اس کے شر اور فریب سے بچنا بہت مشکل بات ہے۔ ایسا ہرگز نہیں۔ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے،

{اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطٰنِ کَانَ ضَعِیْفًا}

”بیشک شیطان کا داؤ کمزور ہے“۔(پ5، نساء:76)

خَنَّاس کے مفہوم سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے کہ وہ وسوسہ ڈال کر فوراً چھپ جاتا ہے کیونکہ وہ حق اور نیکی کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتا۔ وہ تو برائی کا خیال دل میں ڈال کر دیکھتا ہے کہ بندہ اس کی طرف مائل ہوا یا نہیں۔ اگر بندہ برائی کی طرف مائل ہونے لگے تو وہ اس پر مزید برائیاں اور گناہ مسلط کرنے لگتا ہے حتیٰ کہ اس بندے کا دل گناہوں کی کثرت کی وجہ سے سیاہ ہو جاتا ہے۔

اگر بندہ شیطانی وسوسوں کے مقابل اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگنے کا قرآنی ہتھیار تھام لے تو شیطان اس سے کوسوں دور بھاگ جاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

{وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ اِنَّہٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ o اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا ھُمْ مُّبْصِرُوْنَ}

”اور اے سننے والے اگر شیطان تجھے کوئی کونچا دے (کسی برے کام پر اکسائے) تو اللہ کی پناہ مانگو، بیشک وہی سنتا جانتا ہے۔ بیشک وہ جو ڈر والے ہیں، جب انہیں کسی شیطانی خیال کی ٹھیس لگتی ہے،

ہوشیار ہو جاتے ہیں، اُسی وقت اُن کی آنکھیں کھل جاتی ہیں"۔(پ9،اعراف:200-201)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے کہ شیطان آدمی کے دل پر بیٹھا رہتا ہے اور جب یہ اس کو غافل دیکھتا ہے تو وسوسہ ڈالتا ہے۔ اور جب وہ اللہ کا ذکر کرے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے۔(294)

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرنا شیطان کے وسوسوں سے بچنے کا اہم ہتھیار ہے۔ اسی لیے رب کریم نے کثرتِ ذکر کا حکم دیا ہے:

{یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًاۙ o وَّ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِیْلًا}

"اے ایمان والو! اللہ کو بہت یاد کرو اور صبح و شام اس کی پاکی بولو"۔(پ22،احزاب:41-42)

چونکہ شیطان بار بار وسوسے ڈالتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی بار بار ہونا چاہیے۔ قرآن مجید میں عقل مند مومنوں کی تعریف میں فرمایا گیا،

{اَلَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ}(پ4،ال عمران:191)

"جو اللہ کی یاد کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے"۔

شیطان اور اس کے چیلوں کے شر اور مکر سے کسی وقت بھی غافل نہیں رہنا چاہیے۔

ارشادِ ربانی ہے،{اِنَّهٗ یَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِیْلُهٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ}

"بیشک وہ(شیطان) اور اس کا کنبہ تمہیں وہاں سے دیکھتے ہیں کہ تم انہیں نہیں دیکھتے"۔(پ8،اعراف:27)

حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آقا و مولیٰ ﷺ نے فرمایا: بیشک شیطان انسان کے جسم میں خون کی طرح گردش کرتا ہے۔(295)

لہٰذا نظر نہ آنے والے دشمن کے مقابلے کے لیے ضروری ہے کہ ربِ کریم، حقیقی بادشاہ اور اپنے محبوب معبود، اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کیا جائے اور اُس قادرِ مطلق سے اُس کی طاقتور پناہ مانگی

294...مصنف ابن ابی شیبة، کتاب الزھد، حدیث:5

295 ...بخاری، کتاب بدء الخلق، باب صفة ابلیس وجنودہ، حدیث:3281

جائے۔

مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ:

یہ بات پہلے مذکور ہوئی کہ شیطان چھپ کر لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے یعنی وہ خود کو ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ اب اس سورت مبارکہ کے آخر میں یہ بیان ہوا کہ شیطان کے چیلے اور ایجنٹ صرف جنات ہی میں نہیں ہیں بلکہ بہت سے انسان بھی شیطان کے مشن پر عمل پیرا رہتے ہیں۔

سورۃ الانعام میں بھی جناتی شیطانوں کے ساتھ انسانی شیطانوں کا ذکر آیا ہے۔

ارشاد ہوا: {شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ} ”آدمیوں اور جِنوں میں کے شیطان“۔ (پ8، انعام:112)

اس سورت میں پانچ جگہ ”ناس“ کا لفظ آیا ہے۔ پہلی جگہ ”ناس“ سے مراد لڑکے ہیں کیونکہ تربیت وپرورش کا ذکر ان کے حال کے مناسب ہے۔

دوسری جگہ ”ناس“ سے مراد جوان مرد ہیں کیونکہ بادشاہ کا لفظ قہر و جلال اور نظم و نسق کی طرف اشارہ کرتا ہے اور یہ جوانوں کے حال کے شایان ہے۔

تیسری جگہ ”ناس“ سے مراد بوڑھے ہیں کیونکہ معبود کا لفظ عبادت اور اطاعت پر مبنی ہے اور یہ بوڑھوں کے حال سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ چوتھی جگہ ”ناس“ کے لفظ سے صالحین مراد ہیں کیونکہ شیطان اکثر نیک لوگوں کو بہکانے کی کوشش کرتا ہے اور ان کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔ پانچویں جگہ ”ناس“ سے مراد مفسد اور شیاطین ہیں جن کا کام ہی مسلمانوں کو بہکانا اور وسوسے ڈالنا ہے۔[(296)]

بعض انسانوں کی وسوسہ اندازی کو محسوس کیا جاسکتا ہے مثلاً غیبت کرنے والے، چغل خور، جھوٹے، برے دوست، خوشامدی مشیر، بے حیائی کی چیزیں پھیلانے والے، حرام خور لوگ وغیرہ۔ لیکن ایک طبقہ جسے قرآن کی اصطلاح میں منافقین کہا گیا، وہ عقائد و اعمال کی اصلاح اور دین کے نام پر گمراہی کی طرف لیجاتے ہیں اور خود ساختہ تاویلوں کی بنیاد پر مسلمانوں کو مشرک اور بدعتی قرار دے کر صراطِ مستقیم سے دور کرنے کی سعیٔ مذموم کرتے ہیں اور فرقہ واریت پھیلاتے ہیں۔ ارشاد ہوا:

{يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ○ فِيْ قُلُوْبِهِمْ

296... تفسیر عزیزی، الناس، تحت الآیۃ:5

مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ○ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَاتُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ○ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ}

”فریب دیا چاہتے ہیں اللہ اور ایمان والوں کو، اور حقیقت میں فریب نہیں دیتے مگر اپنی جانوں کو اور انہیں شعور نہیں۔ ان کے دلوں میں بیماری ہے تو اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھائی، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، بدلہ ان کے جھوٹ کا۔ اور جب ان سے کہا جائے، زمین میں فساد نہ کرو، تو کہتے ہیں، ہم تو سنوارنے والے ہیں۔ سنتا ہے! وہی فسادی ہیں مگر انہیں شعور نہیں“۔(پ1،بقرہ:9-12)

قرآن کریم نے ان منافقوں کی ایک اہم نشانی یہ بتائی ہے کہ جب اُنہیں قرآن اور رسول کی طرف بلایا جائے تو وہ قرآن سے منہ نہیں موڑتے مگر رسول کریم ﷺ سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ گویا رسولِ معظم ﷺ کی عظمت کو ماننا ان پر گراں ہوتا ہے۔

{وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا}(پ5،نساء:61)

”اور جب اُن سے کہا جائے کہ اللہ کی اُتاری ہوئی کتاب اور رسول کی طرف آؤ تو تم دیکھو گے کہ منافق تم سے منہ موڑ کر پھر جاتے ہیں“۔

یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جو شخص دین کی آڑ میں مسلمانوں کو گمراہی والے عقائد کی طرف بلائے وہ شیطان ہے اور جو کوئی مسلمانوں کو ماڈرن ازم، روشن خیالی یا ثقافت کی آڑ میں بے حیائی اور برے اعمال کی طرف مائل کرے وہ بھی شیطان ہے۔ ان تمام شیاطین کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہیے۔

ذہن نشین رکھیے کہ وہ تمام جائز و مستحب امور جو اللہ تعالیٰ، اس کے محبوب ﷺ اور صالحین کی محبت و اطاعت کی طرف مائل کرتے ہیں، ان نیک کاموں سے روکنا بھی شیطان ہی کے مشن کا ایک حصہ ہے۔ رب تعالیٰ ہدایت عطا فرمائے، آمین۔

قرآن کریم کے آغاز میں رب کریم نے صراطِ مستقیم کا پتہ بتایا پھر قرآن مجید اور صاحبِ قرآن کے ذریعے اس کی تفصیل فراہم کی، آخر میں اس صراطِ مستقیم پر گامزن رہنے کے لیے سورۃ الفلق اور

سورۃ الناس کی صورت میں حفاظت کا سامان عطا فرما دیا۔ جب بندے نے ایمان ویقین کے ساتھ جان لیا کہ اللہ تعالیٰ میرا رب ہے، میرا مالک، میرا مددگار اور میرا معبود ہے، اور رسول کریم ﷺ کی محبت واطاعت ہی نشانِ منزل ہے تو پھر اسے کوئی لالچ، کوئی خوف اور کوئی شر، راہِ حق سے گمراہ نہیں کر سکتا۔

الحمد للہ الذی بنعمتہٖ تتم الصالحات
و الصلوٰۃ و السلام علیٰ سیدِ الموجودات
و علیٰ اٰلہٖ و جمیع الصحابۃ و الصحابیات
و علیٰ من تبعھم من المسلمین و المسلمات
برحمتک یا ارحم الراحمین۔

ماخذ و مراجع

کتاب	مصنف	مطبوعہ
القران الکریم	کلام الٰہی	
خزائن العرفان	مفتی سید نعیم الدین مراد آبادی	صدیقی پبلشرز
خزائن العرفان	مفتی سید نعیم الدین مراد آبادی	مکتبہ المدینہ
کنزالایمان	اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان، متوفی ۱۳۴۰ھ	مکتبۃ المدینہ کراچی
الدر المنثور	امام جلال الدین بن ابی بکر سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ	دار الفکر، بیروت ۱۴۰۳ھ
تفسیر طبری	امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری، متوفی ۳۱۰ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۲۰ھ
التفسیر الکبیر	امام فخر الدین محمد بن عمر بن حسین رازی، متوفی ۶۰۶ھ	دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۴۲۰ھ
روح البیان	مولی الروم شیخ اسماعیل حقی بروسی، متوفی ۱۱۳۷ھ	دار احیاء التراث العربی بیروت
خزائن العرفان	صدر الافاضل مفتی نعیم الدین مراد آبادی، متوفّٰی ۱۳۶۷ھ	مکتبۃ المدینہ کراچی
صحیح بخاری	امام ابوعبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری، متوفی ۲۵۶ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۱۹ھ
صحیح مسلم	امام ابو الحسین مسلم بن حجاج قشیری، متوفی ۲۶۱ھ	دار ابن حزم ۱۴۱۹ھ
سنن الترمذی	امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی، متوفی ۲۷۹ھ	دار المعرفہ، بیروت ۱۴۱۴ھ
سنن ابن ماجه	ابوعبد اللہ محمد بن یزید ابن ماجہ، متوفی ۲۷۳ھ	دار المعرفہ، بیروت ۱۴۲۰ھ
سنن أبی داود	امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث سجستانی، متوفی ۲۷۵ھ	دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۴۲۱ھ
کنزالعمال	علامہ علی متقی بن حسام الدین ہندی، متوفی ۹۷۵ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۱۹ھ
الجامع الصغیر	امام جلال الدین بن ابی بکر سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۲۵ھ
مشکاۃ المصابیح	علامہ ولی الدین تبریزی، متوفی ۷۴۲ھ	دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۲۱ھ
مجمع الزوائد	حافظ نور الدین علی بن ابی بکر ہیثمی، متوفی ۸۰۷ھ	دار الفکر، بیروت ۱۴۲۰ھ
المعجم الکبیر	امام ابو القاسم سلیمان بن احمد طبرانی، متوفی ۳۶۰ھ	دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۴۲۲ھ
معجم الصغیر	امام ابو القاسم سلیمان بن احمد طبرانی، متوفی ۳۶۰ھ	دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۴۲۲ھ

معجم الاوسط	امام ابو القاسم سلیمان بن احمد طبرانی، متوفی ۳۶۰ھ	دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۴۲۲ھ
المستدرك	ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ حاکم نیشاپوری، متوفی ۴۰۵ھ	دار المعرفہ، بیروت ۱۴۱۸ھ
فتح الباری	حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی، متوفی ۸۵۲ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۲۰ھ
عمدة القاری	امام بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد عینی، متوفی ۸۵۵ھ	دار الفکر، بیروت ۱۴۱۸ھ
الخصائص لکبری	امام جلال الدین بن ابی بکر سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت
مدارج النبوة	شیخ محقق عبد الحق محدث دہلوی، متوفی ۱۰۵۲ھ	مرکز اہل سنت برکات رضا ہند
بہار شریعت	مفتی محمد امجد علی اعظمی، متوفی ۱۳۶۷ھ	مکتبۃ المدینہ کراچی